بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کا قرآن

اللہ نے کن باتوں کو حرام کیا ہے

"کہہ دو کہ میرے رب نے تو بے حیائی کی باتوں کو، ظاہر ہوں یا پوشیدہ اور گناہ اور سرکشی کو اور ناحق زیادتی کو حرام کیا ہے اور اس کو بھی کہ تم کسی کو خدا کا شریک بناؤ جس کی اس نے کوئی سند نہیں اتاری اور اس کو بھی کہ اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہو جن کا تمہیں کچھ علم نہیں۔" (سورۃ الاعراف: ۷۔۳۳)

ظالموں کا بدلہ

"بے شک جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے تکبر کیا، ان کے لیے نہ آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے اور نہ ہی وہ جنت میں داخل ہوں گے۔ یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے (جو ناممکن ہے) اور اسی طرح ہم مجرموں کو بدلہ دیتے ہیں۔ ان کے لیے جہنم کا بچھونا ہے اور ان کے اوپر جہنم ہی اوڑھنا ہے۔ اسی طرح ہم ظالموں کو بدلہ دیتے ہیں۔ (سورۃ الاعراف: ۷۔۴۰)

رسول ﷺ کا فرمان

درخت لگانے کا اجر

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے یا کھیتی اگاتا ہے، تو اس میں سے کوئی پرندہ یا چوپایہ (جانور) جو کچھ کھاتا ہے وہ اس (بونے والے) کی طرف سے صدقہ ہوتا ہے اور اسے اس کا ثواب ملتا ہے۔"

(بخاری کتاب: ۴۱۔ باب: ۱، مسلم: کتاب ۱۰ مساقات، باب ۲)

مومن کا قتل

حضرت ثابت بن ضحاکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "مومن پر لعنت بھیجنے کا گناہ مومن کو قتل کرنے کے برابر ہے۔ نیز مومن پر کفر کی تہمت لگانے یعنی کافر کہنے کا گناہ بھی مومن کو قتل کرنے کے برابر ہے۔" (بخاری کتاب: ۷۸۔ باب: ۴۴، مسلم: کتاب ایمان، باب ۴۶)

ستمبر 2015ء
ذوالقعدہ 1436ھ
جلد نمبر 55 شمارہ نمبر 9

urdudigest.com www.urdudigest.pk

ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی

مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی

طیب اعجاز قریشی

عاصم محمود

محمد اسلم لودھی، غلام حیدر

حافظ افروغ حسن، نوید اسلام صدیقی، سلمٰی اعوان

فاروق اعجاز قریشی

افنان کامران قریشی

خاندگی المدینہ

عبدالرحمٰن، اشرف سہیل

مارکیٹنگ

ڈائریکٹر: ڈی اعجاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات

advertisement@urdu-digest.com

منیجر ایڈورٹائزمنٹ: 0300-4005579

لاہور: ندیم حامد

سالانہ خریداری 560

subscription@urdu-digest.com
خریداری کے لیے رابطہ

21/19 ایلڈر سکیم، سمن آباد، لاہور فون 82 42 37589967

پاکستان 1560 کے بجائے 1000 روپے میں

بیرون ملک 60 امریکی ڈالر

اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No. 600360
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں

325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور

فون نمبر: +92-42-35290738 فیکس: +92-42-35290731

ای میل: editor@urdu-digest.com

طابع و ناشر: الطاف حسن قریشی نے اردو ڈائجسٹ پرنٹرز 24 ...

قریباً دو ہفتے برادر ملک ترکی میں گزارنے کے بعد اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی احساس ہوا کہ الحمدللہ ہمارا ملک اب استحکام کی جانب گامزن ہے۔ عرصے بعد اپنے ہم وطنوں کے چہروں پر اطمینان اور اُمید کے جذبات صاف دکھائی دیے۔ بلاشبہ سیکورٹی ادارے آپریشن ضرب عضب کی تکمیل کی جانب رواں دواں ہیں اور جنرل راحیل شریف فوج کی قیادت کرتے ہوئے ملک کے ہر حصے میں دہشت گردوں اور دشمنوں کا صفایا کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اس مشن میں حکومت اور افواج کسی بھی قسم کی قربانیوں سے دریغ نہیں کر رہے۔ باغی بلوچ رہنماؤں سے بات چیت کا آغاز ہونا نہایت خوش آئند ہے۔ مسلح افواج اور سیکورٹی اداروں نے کرپشن مافیا اور دہشت گردوں کا گٹھ جوڑ بے نقاب کرتے ہوئے انھیں اپنے شکنجے میں جکڑ کے کراچی شہر کی رونقیں بحال کر دی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق صرف کراچی شہر میں ۱۴ اگست کے لیے ۵ ارب روپے کے سبز ہلالی پرچم اور جھنڈیاں خریدی گئیں اور عیدالفطر کے موقع پر ریکارڈ خریداری کی گئی۔ وطن عزیز کو فی الوقت درج ذیل بڑے چیلنجوں کا سامنا ہے:

٥ پاک چائنہ اکنامک کاریڈور کی تیزی سے تکمیل کئی ممالک کے لیے خطرہ بن چکا اور اس کے واضح پیغامات سامنے آ رہے ہیں۔ اس منصوبے کا سب سے بڑا مخالف بھارت ہے؛ دوسری طرف متحدہ عرب امارات اور امریکا۔ بھارت نے امن مذاکرات کی میز پر بیٹھنے کے بجائے پاکستانی افواج کو سرحدوں پر الجھانے کے لیے جھڑپوں میں اضافہ کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ کشمیر میں آزادی کی تحریک نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا ہے۔ بھارتی خفیہ اداروں کی کارروائیوں کی وجہ سے افغانستان امن مذاکرات بھی تعطل کا شکار ہو چکے۔

٥ سعودی عرب کی مدد کے لیے پاک فوج نہ بھیجنے، گوادر پورٹ اور اکنامک کاریڈور کے منصوبوں کی وجہ سے مودی کے دورۂ امارات کے دوران خلیجی ممالک نے بھارتی وزیراعظم کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے

اور بھارت میں اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری کا اعلان کر کے پاکستان کو واضح پیغام دیا کہ تعلقات پہلے جیسے خوشگوار نہیں رہے۔

○ یونان کا معاشی بحران ابھی ختم نہیں ہوا اور نئے انتخابات کا اعلان ہو چکا۔ شام اور افریقی ممالک سے آنے والے لاکھوں مہاجرین کے سیلاب نے پریشان حال یورپین ممالک خصوصاً جرمنی، آسٹریا اور سویڈن کے ساتھ ساتھ ترکی کے لیے بھی مسائل کے پہاڑ کھڑے کر دیے ہیں۔ ادھر چین کی سست رفتار اقتصادی ترقی نے پوری دنیا کی معیشت میں زلزلہ طاری کر دیا۔ ڈالر کے علاوہ تمام کرنسیاں اپنی قدر کھو رہی ہیں اور "سیاہ سوموار" (Black Monday) کو دنیا بھر کی تقریباً تمام بڑی اسٹاک مارکیٹیں کریش کر گئیں۔ تمام اجناس کی قیمتوں میں خطرناک حد تک کمی واقع ہو چکی۔ اس معاشی بحران کے اثرات پاکستان تک بھی پہنچنا شروع ہو گئے ہیں۔

پاکستان میں بھی کسانوں کو اپنی زرعی اجناس کی قیمتیں نہیں مل پا رہیں جس کی وجہ سے ان کے اندر پریشانی اور اضطراب بڑھ رہا ہے۔

ان تمام چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کے لیے سول اور فوجی قیادت کو یکجا ہو کر کسی قسم کے "ایڈونچر" سے بچ کر دشمنوں کی چالوں کو ناکام بنانا اور وفاقی کابینہ میں تبدیلی کے ذریعے گڈ گورننس میں بہتری لانا ہوگی۔

☆☆

ترکی کے تازہ سفر کی روداد صفحہ نمبر ۳۰ پر پڑھیے۔ شمارہ ستمبر میں حج مبارک، عیدالاضحی اور یوم دفاع کے حوالے سے بھی منفرد اور رنگارنگ تحریریں شامل ہیں۔ سفرنامہ حج "جاودانی راہیں" قاری کو عجیب روحانی کیفیات و تجربات سے آگاہ کراتا ہے۔ "بکرے کی واپسی" عیدالاضحی کے موقع پر جنم لینے والی سماجی رسوم کا خندہ آور آئینہ ہے۔

جنرل راحیل شریف کی اچھوتی داستان بھی تحفۂ خاص ہے۔ یہ قائدانہ صلاحیتوں اور عمل پیہم سے وطن عزیز کو مضبوط و مستحکم بنا دینے والے ہردلعزیز سپہ سالار کی حیرت انگیز کہانی ہے۔

آج یہ وقت کی پکار ہے کہ پاکستانی قوم اسی مثالی اتحاد و یک جہتی کو اپنا لے جس کا عظیم الشان مظاہرہ اس نے جنگ ستمبر کے موقع پر دکھایا تھا۔ اتحاد کی دولت سے مالامال ہو کر ہی ہم دشمن کے مذموم عزائم کو شکست دے سکیں گے۔ ان شاء اللہ!

طیبہ اعجاز قریشی

اس شمارے میں

تنازعِ کشمیر... علاقائی امن اور سلامتی کے لیے چیلنج پر قومی اہمیت کا سیمینار

17

الطاف حسن قریشی

جنرل راحیل شریف

سپہ سالارِ پاکستان کی حیرت انگیز داستانِ حیات

سید عاصم محمود

65

تازہ افسانے

طب و صحت

معاشرتی نیرنگیاں

لمحۂ فکریہ

مستقل سلسلے

ﺍﺩﺍﺭﯾﮧ

یومِ دفاع کے نئے تقاضے

ستمبر میں پوری قوم نے پاک فوج کے شانہ بہ شانہ اپنے وطن کا بھرپور دفاع کیا اور بھارت کے خطرناک عزائم خاک میں ملا دیے تھے۔ سترہ دنوں میں اہلِ وطن نے بے مثال یک جہتی، حیرت انگیز ایثار کیشی اور عزم و یقین اور فوج نے جرأت و مردانگی اور سرفروشی کے ناقابلِ فراموش مظاہرے کیے تھے اور چونڈے کا میدان بھارتی ٹینکوں کا قبرستان بن گیا تھا۔ عبرت ناک شکست سے بچنے کے لیے بھارت نے فائر بندی کے لیے سلامتی کونسل کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا' لیکن وہ اس بار چھ ستمبر کو یومِ فتح' منا رہا ہے اور اپنی فوج کے گرتے مورال کو سہارا دینے کے لیے پاکستان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی پالیسی پر گامزن ہے۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ مقبوضہ کشمیر میں عوامی تحریکِ مزاحمت کے طاقت ور ظہور کے نتیجے میں شروع ہوئی تھی اور بھارتی وزیرِاعظم شاستری نے بین الاقوامی سرحد عبور کر کے تین اطراف سے پاکستان پر حملہ کر دیا تھا۔ آج وہی منظر ایک نئی جہت کے ساتھ طلوع ہو رہا ہے۔ وادیٔ کشمیر کا ذہنی اور سیاسی رشتہ بھارت سے کٹ چکا ہے اور تعلیم یافتہ کشمیری نوجوان قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے خون سے ایک نئی داستانِ حریت رقم کر رہے ہیں۔ بھارت نے عملاً مذاکرات کے دروازے بند کر دیے ہیں کہ وہ خطے کا امن تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔

ہم نے جس طرح ستمبر ۱۹۶۵ء میں اپنے وطن کا دفاع کیا تھا، اسی طرح اب ہم آپریشن ضربِ عضب میں دہشت گردوں کی طاقت پر کاری ضرب لگا رہے ہیں اور بھارتی خفیہ ایجنسی 'را' کی پاکستان میں ریشہ دوانیاں بے نقاب کر رہے ہیں۔ بھارت میں بی جے پی کی حکومت جارحانہ تعصب کو ہوا دے رہی ہے اور ورکنگ باؤنڈری اور کنٹرول لائن پر سنگین خلاف ورزیوں کا سلسلہ چل نکلا ہے۔ ہمارے سپہ سالار جنرل راحیل شریف نے دوٹوک الفاظ میں واضح کر دیا ہے کہ ہماری سرزمین میں داخل ہونے والے بھارتی جنگجو زندہ واپس نہیں جائیں گے۔

ہمیں بحیثیت قوم اس بار یومِ دفاع ایک تخلیقی انداز سے پورے مہینے منانا ہو گا کہ عوام کے اندر تحفظِ وطن کے جذبے چشموں کی طرح اُبلنے لگیں اور قومی وحدت ایک نئی آن اور ایک نئی شان کے ساتھ جلوہ گر ہو۔ ہمیں شہر شہر اور قریہ قریہ باوقار اجتماعات میں شہیدوں اور غازیوں کے ساتھ لازوال محبت اور جموں و کشمیر کے جاں باز اور پُرامن حریت پسندوں سے کامل یک جہتی کا مظاہرہ کرنا ہو گا۔ ہماری یہی طاقت بھارت کو امن پر شبخون مارنے سے روک سکے گی۔ فضا میں اُبھرتے ہوئے ملی نغمے پوری قوم کے اندر ایک تازہ روح پھونک دیں گے اور ہماری مسلح افواج بھارت کی اشتعال انگیزیوں کے منہ بند کر دیں گی۔ اس موقع پر سیاسی اور عسکری قیادت نے جس عزم کا اظہار کیا ہے، اسے پورے معاشرے میں راسخ کرنے کے لیے ٹھوس منصوبہ بندی کرنا اور پوری دنیا کے سامنے بھارت کی رنگ سازی کا پول کھولنا ہو گا۔ ہمیں ہر قیمت پر امن کے تحفظ اور اقتصادی راہداریوں کی تکمیل کو یقینی بنانا ہو گا۔

الطاف حسن قریشی

تنازع کشمیر
علاقائی امن اور سلامتی کے لیے چیلنج

چار گھنٹوں پر محیط مذاکرات کی فکرانگیز روداد

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

بھارت میں جب سے نریندر مودی بی جے پی کی حمایت سے برسراقتدار آئے ہیں وہ پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائی کے علاوہ سنگین سرحدی خلاف ورزیوں کو روزمرہ کا معمول بناتے جا رہے ہیں۔ مقبوضہ کشمیر کے انتخابات میں بی جے پی کو واضح اکثریت حاصل نہ ہونے کے باعث مفتی سعید کی جماعت کے ساتھ مخلوط حکومت بنانا پڑی۔ اس کا اصل منصوبہ یہ تھا کہ بھارتی آئین کی وہ شق کالعدم قرار دے دی جائے جس کی رو سے کوئی غیر کشمیری مقبوضہ کشمیر میں جائیداد نہیں خرید سکتا۔ جموں اور کشمیر کے بہادر عوام ۱۹۳۱ء سے ڈوگرہ راج کا مقابلہ کرتے آئے ہیں۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے جموں و کشمیر کے باشندوں کو آزادانہ استصواب کے ذریعے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق دیا تھا جس پر بھارت اور پاکستان نے اتفاق کیا تھا مگر پنڈت نہرو کبھی ایک حیلے بہانے اور کبھی دوسرے حربے سے رائے شماری کا راستہ روکتے رہے۔ ان کے عہد میں دونوں ملکوں کے وزرائے خارجہ مسٹر بھٹو اور مسٹر سورن سنگھ کے درمیان مذاکرات کے چھ دور چلے مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اس کے نتیجے میں جنگ ستمبر کی نوبت آئی اور بھارت پاکستان کے تعلقات ایک نئی شکل اختیار کر گئے اور کشمیریوں پر انسانیت سوز مظالم اور کڑی آزمائشوں میں اضافہ ہوتا گیا۔

جنگ ستمبر پر اب پچاس برس گزر چکے ہیں اور اس عرصے میں یہ دونوں ملک ایٹمی طاقت بن گئے ہیں۔ بدقسمتی سے بھارت میں جو سیاسی جماعت برسراقتدار ہے، وہ راشٹریہ سیوک سنگھ کے نظریات پر سختی سے کاربند ہے۔ ان متشدد نظریات میں بھارت کو مکمل طور پر ہندو ریاست میں تبدیل کر دینا، کشمیر کو پورے طور پر اپنے اندر ضم کر لینا اور پاکستان کو غیر مستحکم رکھنے کے لیے جنوبی ایشیا کو نیوکلیر فلیش پوائنٹ

بنانا ہے۔ بھارتی قیادت کی ریشہ دوانیوں سے مسئلہ کشمیر ایک عشرے سے عالمی پس منظر میں چلا گیا تھا اور عالمی اداروں میں اس کا تذکرہ بند ہو گیا تھا۔ جناب نواز شریف نے برسر اقتدار آنے کے بعد جنرل اسمبلی کے ۲۰۱۳ء اور ۲۰۱۴ء کے سالانہ اجلاس میں تنازع کشمیر بڑی جرأت اور بصیرت کے ساتھ اٹھایا اور عالمی برادری سے اپیل کی کہ اس کا حل جموں و کشمیر کے عوام کی امنگوں کے مطابق تلاش کیا جائے۔ یہ جنت نظیر خطہ جو چھ لاکھ بھارتی فوج کی بہیمانہ کارروائیوں کے باعث جہنم زار بن چکا ہے' اسے حق خود ارادیت دلانے کے لیے اپنا کردار ادا کرے۔ یہی بنیادی معاملات روس میں اوفا کے مقام پر سربراہ ملاقات میں زیر بحث آئے جو وزیر اعظم نواز شریف اور وزیر اعظم نریندر مودی کے مابین ہوئی تھی اور یہ طے پایا تھا کہ تمام حل طلب مسائل مذاکرات کے ذریعے طے کیے جائیں گے۔ اس واضح اعلان کے برعکس بھارت نے سرحدی سنگین خلاف ورزیاں شروع کر دی ہیں اور پاکستان کے درجنوں شہری شہید کر ڈالے ہیں۔

ان بگڑتے حالات میں **پائنا** (پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف نیشنل افیئرز) اور یو ایم ٹی (یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی) نے قومی سیمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا' چنانچہ کشمیری قیادت کے علاوہ گلگت بلتستان کے وزیر اعلیٰ اور پاکستان کی اہم شخصیات کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ ۹ راگست بروز اتوار پی سی ہوٹل لاہور میں دو اجلاس ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت سابق وفاقی وزیر قانون اور ممتاز دانشور جناب ایس ایم ظفر نے کی جبکہ دوسرے اجلاس کے میر محفل جناب سردار آصف احمد علی تھے جو وزیر خارجہ رہ چکے ہیں۔ پاکستان کے نامور دانش ور ممتاز کالم نگار اور صاحب طرز ادیب جناب سجاد میر نے میزبانی کے فرائض سرانجام دیے۔

سیکرٹری جنرل پائنا

پائنا کے سیکرٹری جنرل الطاف حسن قریشی نے اہل دانش، اہل سیاست اور طلبہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے سیمینار کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ تقریباً ایک عشرے بعد کشمیری قیادت لاہور میں جمع ہوئی ہے جہاں علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۱ء میں کشمیر کمیٹی قائم کی تھی اور ڈوگرہ راج کے مظالم کے خلاف اُٹھنے والی تحریک کا ساتھ دیا تھا۔ جناب حافظ حفیظ الرحمان وزیر اعلیٰ کا منصب سنبھالنے کے بعد پہلی بار لاہور آئے ہیں اور اہل لاہور نے اُنھیں ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔

بلوچستان سے جناب حافظ حسین احمد تشریف لائے ہیں جو اپنے علاقے میں بھارت کی ریشہ دوانیوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ جناب ایس ایم ظفر قومی اہمیت کے اس مذاکرے کی صدارت فرما رہے ہیں جنھیں ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاکستان کی طرف سے کشمیر کا مقدمہ اقوام متحدہ میں پیش کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ منجھے ہوئے سفارت کار جناب مسعود خاں ہماری دعوت پر خاص طور سے اسلام آباد سے آئے۔ مجھے امید واثق ہے کہ سیمینار میں تنازع کشمیر کے تمام پہلو زیر بحث آئیں گے اور ایسی تجاویز بھی سامنے آئیں گی جو بھارت کو خطے کا امن پامال کرنے سے روکنے میں کارگر ثابت ہوں گی۔

قریشی صاحب نے کہا کہ ہمیں سب سے پہلے جموں و کشمیر کے بہادر عوام کو خراج تحسین پیش کرنا چاہیے جو گزشتہ ۸۵ برسوں سے ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں اور اپنے بنیادی حقوق کا پرچم اُٹھائے ہوئے ہیں۔ سلامتی کونسل نے اُنھیں ۱۹۴۹ء میں حق خود ارادیت سے سرفراز کیا تھا جو اقوام متحدہ کے چارٹر کا ناقابل تنسیخ حصہ ہے۔ وہ اپنے بنیادی حق کے لیے ایک عظیم الشان جدوجہد کر رہے ہیں۔ پاکستان نے اس جدوجہد میں ان کا ساتھ دیا ہے اور آج کے سیمینار میں بھی ہمیں ان کے ساتھ مکمل یک جہتی کا ایمان افروز انداز میں اظہار کرنا چاہیے۔ اسی

طرح ہمیں وزیراعظم نوازشریف کی ان مدبرانہ کوششوں کی فراخ دلی سے ستائش کرنا ہوگی کہ انہوں نے جنرل اسمبلی کے ۲۰۱۳ء اور ۲۰۱۴ء کے اجلاس میں کشمیر کا مسئلہ پوری جرأت سے اُٹھا کر عالمی برادری کو اپنی ذمے داری کا احساس دلایا ہے۔ مزید برآں اوفا میں بھارتی وزیراعظم نریندر مودی سے ملاقات کر کے انہیں اس امر پر متفق کر لیا تھا کہ تمام دیرینہ تنازعات مذاکرات کے ذریعے طے کیے جائیں گے۔

الطاف حسن قریشی نے تجویز پیش کی کہ اہل کشمیر کی ناقابل فراموش جدوجہد کو ہمیں اپنے نصاب کا حصہ بنانا چاہیے تاکہ ہماری نئی نسل تاریخی حقائق سے پوری طرح واقف ہو اور اسے پاکستان اور کشمیر کے تاریخی تہذیبی اور انسانی رشتوں کا کامل ادراک ہو۔ انہوں نے یہ تجویز بھی دی کہ ہمارے اخبارات اور میڈیا میں مقبوضہ کشمیر کے حالات و واقعات بہت کم شائع ہوتے ہیں اور ہمیں بھارت میں اُبھرنے والے رجحانات کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لینے کا موقع نہیں ملتا اس لیے وزارت اطلاعات کے ذیلی شعبے پی آئی ڈی کو یہ کام سونپا جائے کہ وہ ہفتہ وار ایک جامع رپورٹ مرتب کر کے میڈیا اور فیصلہ ساز اداروں کو فراہم کرے۔ ایک زمانے میں یہ رپورٹ باقاعدگی سے تیار کی جاتی تھی جو معاملات کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتی رہی ہے۔ ہم دو ایسے پڑوسی ہیں جن کو ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی ضرورت ہے۔ کشمیر کا مسئلہ جو فلیش پوائنٹ بنتا جا رہا ہے، وہاں کے عوام خاص طور پر نوجوانوں کے میلانات جذبات اور ترجیحات سے پوری طرح واقف رہنا اور اُن کے اصولی موقف کو تقویت پہنچانا ہمارا اوّلین فریضہ ہے۔

جناب مسعود خاں

آپ ایک منجھے ہوئے اور تجربے کار سفارت کار ہیں اور چین، جنیوا اور نیویارک میں سفارتی ذمے داریاں ادا کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے الطاف حسن قریشی کو ایک باوقار سیمینار منعقد کرنے پر مبارکباد پیش کی جس میں سوسائٹی کے تمام طبقات کی نمائندگی ہے اور تقریباً تمام کشمیری قیادت موجود ہے۔ انہوں نے اپنے کلیدی خطاب میں کشمیری عوام کی عدیم المثال جدوجہد کا جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان نے اپنی آزادی کے ابتدائی عشروں میں کشمیر کو بھارت کے غاصبانہ قبضے سے نجات دلانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی، لیکن بھارت کی دغابازیاں، وعدہ خلافیاں اور چالبازیاں سب سے بڑی رکاوٹ بنی رہیں۔ اس نے مختلف حیلے بہانوں سے رائے شماری نہیں ہونے دی، حالانکہ کشمیر پر سلامتی کونسل کی قرارداد پر سب نے اتفاق کیا تھا۔ آج بھارت میں بی جے پی کی حکومت ہے اور مودی کی خواہش ہے کہ مسئلہ کشمیر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ پہلے ایک منصوبے کے تحت فائر بندی لائن، لائن آف کنٹرول میں تبدیل کی گئی اور بعدازاں کشمیر کو بھارت کا ایک صوبہ بنا دیا گیا۔ اب مقبوضہ کشمیر میں صدر کے بجائے گورنر اور وزیراعظم کے بجائے وزیراعلیٰ کے منصب قائم ہیں۔

جناب مسعود خاں نے بڑے دکھ سے کہا کہ ہم یوں تو مسئلہ کشمیر کی بات بہت کرتے ہیں، مگر ہماری معلومات اس کے بارے میں انتہائی کم ہیں، چنانچہ اب اس کی حیثیت ایک علامتی مسئلے کی سی رہ گئی ہے، البتہ وزیراعظم نوازشریف نے اسے جنرل اسمبلی کے اجلاس ۲۰۱۳ء اور ۲۰۱۴ء میں اُٹھا کر اس میں نئی جان ڈال دی ہے اور عالمی برادری کو اس امر کی طرف متوجہ کیا ہے کہ سلامتی کونسل کی قراردادوں پر عمل درآمد کیا جائے۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ وہ ستمبر میں ہونے والے جنرل اسمبلی کے اجلاس میں بھی جارحانہ سفارت کاری کا مظاہرہ کریں گے۔

جناب مسعود خاں اس امر پر بڑے افسردہ تھے کہ کئی عشروں سے پاکستان میں تنازع کشمیر پر کوئی قابل ذکر کتاب شائع ہوئی نہ وہاں کے انسانی المیوں پر کوئی عظیم ناول لکھا گیا۔ ہمارے اہل قلم کو اس طرف خاطر خواہ توجہ دینی چاہیے۔ کتابیں ذہن تبدیل کرنے اور اذہان کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ انہوں نے اپنے خطاب میں گیارہ نکاتی ایجنڈا بھی پیش کیا جس کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ مسئلہ کشمیر کا حل ایک مضبوط پاکستان میں مضمر ہے کہ وہ جس قدر مضبوط ہوگا مسئلہ کشمیر حل ہونے کے امکانات بڑھتے جائیں گے۔ انہوں نے کشمیری عوام کی جواں مردی اور عزیمت کو سلام پیش کیا اور سفارش کی کہ مقبوضہ کشمیر کی تحریک مزاحمت میں شہید ہونے والے جانبازوں کی بیواؤں اور یتیموں کی امداد کے لیے "کشمیر فنڈ" قائم کیا جائے۔

جناب عطاء الحق قاسمی

پاکستان کی معروف ادبی شخصیت نے آتش احساس کو تیز کرنے کے لیے کہا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسئلہ کشمیر وینٹی لیٹر پر ایک عرصے سے آخری سانس لے رہا ہے اور اس کے ذمے دار ہمارے سفارت خانے ہیں جو مشنری جذبے سے یکسر خالی ہیں۔ انہوں نے ایک واقعہ سنایا کہ بیرون ملک ایک پاکستانی سے ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ میں تین جگہ کام کرتا ہوں اور سونے کے لیے سفارت خانے چلا جاتا ہوں جس کا میں باقاعدہ ملازم ہوں۔ انہوں نے بڑے وثوق سے کہا کہ اگر ہمارے سفارت خانے مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں سرگرم ہو جائیں تو اس کا جلد حل نکل آئے گا۔ وہ وزیراعظم جناب نواز شریف کی ان کوششوں کی بھی تعریف کر رہے تھے جو انہوں نے جنرل اسمبلی میں تنازع کشمیر کو زندہ کرنے کے لیے گزشتہ دو برسوں میں کی ہیں اور مسئلہ کشمیر پر ایک مضبوط موقف اپنایا ہے۔ قاسمی صاحب نے اپنی نظم بھی سنائی جس میں اُمید کے پھول کھلے ہوئے تھے اور عزم کے غنچے چٹک رہے تھے۔

جناب ارشاد محمود

سنٹر فار پیس ڈویلپمنٹ اور ریفارمز کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر اسلام آباد سے آئے اور انہوں نے مقبوضہ کشمیر کی تازہ ترین صورت حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے بتایا کہ بھارت سے آزادی حاصل کرنے کی تحریک اب کشمیری نوجوانوں کے ہاتھ میں چلی گئی ہے اور وہی مستقبل کی صورت گری کریں گے۔ کشمیریوں کا بھارت کے ساتھ رشتہ ٹوٹتا جا رہا ہے کیونکہ بی جے پی حکومت نے سیاسی جدوجہد کے لیے گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ اب مقبوضہ کشمیر میں تحریک مزاحمت مقامی باشندوں پر مشتمل ہے جو عسکریت پسندی سے کنارہ کش دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے تجویز دی کہ ہمارا میڈیا تحریک آزادی کشمیر کو نظریاتی رنگ دینے کے بجائے اسے انسانی تحریک کے طور پر پیش کرے جو حق خود ارادیت کے حصول کی خاطر جدوجہد کر رہی ہے اور انسانی حقوق کی پامالی پر سراپا احتجاج بنی ہوئی ہے۔ انہوں نے ایک ایک لفظ پر

زور دیتے ہوئے کہا کہ ہمیں گلگت بلتستان اور آزاد کشمیر میں اچھی حکمرانی کا ماڈل پیش کرنا چاہیے جو کشمیری عوام کے لیے امیدوں کا مرکز ثابت ہو۔ جناب ارشاد محمود اس بات پر بہت خوش تھے کہ طویل عرصے بعد کشمیری لیڈروں کو لاہور کے تاریخی شہر میں جمع ہونے کی دعوت دی گئی ہے جو ۱۹۳۱ء سے کشمیر کاز کو کمک فراہم کر رہا ہے۔

جناب محمد فاروق رحمانی

پاکستان میں آل حریت کانفرنس کے نمائندے اور ''آزادی کی تلاش'' کے مصنف اسلام آباد سے آئے اور اپنے پراعتماد لہجے میں گویا ہوئے کہ مقبوضہ کشمیر میں بھارت کی پالیسیوں کو شکست دینے کے لیے ہمیں اپنے آپ کو نئے تصورات اور نئے طریق ہائے کار سے مسلح کرنا ہوگا۔ وہ اس امر پر تاسف کا اظہار کر رہے تھے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی سوانح عمری کے مطابق ہم نے پنڈت نہرو کے وعدے پر اعتبار کیا اور اسے کشمیر پر قبضہ قائم رکھنے کی مہلت مل گئی۔ انہوں نے نوید سنائی کہ کشمیری نوجوانوں کا عزم چٹان کے مانند ہے۔ وہ تعلیم پر توجہ دے رہے ہیں اور غاصب سے جدید ترین ٹیکنالوجی کے ساتھ نبرد آزما ہیں۔ ان کے ارادے ناقابل شکست ہیں۔

جناب سردار خالد ابراہیم

حکومت آزاد جموں و کشمیر کے پہلے صدر سردار ابراہیم کے فرزند ارجمند اور آل جموں و کشمیر پیپلز پارٹی کے مرکزی لیڈر اسلام آباد سے آئے اور پاکستان کے ساتھ اپنی گہری عقیدت کا اظہار کرتے رہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ پاکستان اور کشمیر کا مستقبل ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہے اور اہل کشمیر پاکستان کے بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنا یہ عقیدہ بیان کیا کہ پہلے ہم پاکستانی ہیں اور بعد میں کشمیری۔ اُن کی رگوں میں اپنے عظیم والد کا خون دوڑ رہا ہے جو تقسیم ہند سے پہلے ڈوگرہ راج میں مسلم کانفرنس کے ٹکٹ پر اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹ر جولائی ۱۹۴۷ء کو سری نگر میں اُن کی رہائش گاہ پر مسلم کانفرنس کا اجلاس ہوا جس میں کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی قرارداد منظور ہوئی۔ اس کے فوراً بعد مسلم کانفرنس نے ڈوگرہ راج کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ کشمیر کا ایک علاقہ آزاد کرایا جس میں آزاد جموں و کشمیر کی حکومت قائم ہوئی۔ اس کے پہلے صدر جناب سردار ابراہیم چنے گئے۔

جناب خالد ابراہیم نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر کا تنازع پانی اور زمین کا نہیں بلکہ ایک کروڑ کشمیریوں کے حق خود ارادیت کا ہے۔ یہ وہ حق ہے جو اقوام متحدہ کے چارٹر میں شامل ہے اور ناقابل تنسیخ ہے۔ پاکستان کو جارحانہ سفارت کاری کے ذریعے کشمیر کاز کے لیے زیادہ سے زیادہ دوست پیدا کرنے چاہئیں۔ وزیر اعظم نواز شریف نے سالہا سال کے بعد مسئلہ کشمیر جنرل اسمبلی میں اُٹھایا ہے اور خوش قسمتی سے پاکستان کی سیاسی اور عسکری قیادت کے مابین اس معاملے میں کامل ہم آہنگی پائی

جاتی ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ وہ ستمبر کے مہینے میں ہونے والے جنرل اسمبلی کے اجلاس میں بھی پوری قوت سے کشمیر کاز کے لیے آواز اٹھائیں گے۔

بریگیڈیئر (ر) نادر میر

دفاعی تجزیہ نگار، بریگیڈیئر (ر) نادر میر نے اپنا نکتہ نظر بیان کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر تنازع نہیں بلکہ پاکستان کا ایک حصہ ہے۔ وہ اصول جس کی بنیاد پر برصغیر کی تقسیم عمل میں آئی تھی، اس کے مطابق کشمیر پاکستان کا ایک جزو لاینفک ہے۔ انہوں نے سیاسی، عسکری قیادت اور میڈیا پر زور دیا کہ وہ بھارت کو مقبوضہ کشمیر سے چھ لاکھ فوج نکالنے پر مجبور کرے اور اس مقصد کے لیے عالمی رائے عامہ ہموار کی جائے۔ انھیں یقین تھا کہ بہادر اور ایثار پیشہ کشمیری نوجوان اپنی تحریک مزاحمت میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ انہوں نے بھارت کے فوجی دماغ، جیت دوال کے نظریے "جارحانہ دفاعی پالیسی" پر کڑی تنقید کی کہ بھارت اس کے ذریعے پاکستان کا امن تباہ کرنا اور چین پاکستان اقتصادی راہداری کو سبوتاژ کرنا چاہتا ہے، مگر وہ سخت بھول میں ہے کیونکہ تصادم کے نتیجے میں بھارت ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔

حافظ حفیظ الرحمان

گلگت بلتستان کے منتخب وزیر اعلیٰ نے **پلاننا** اور **یو ایم ٹی** کو اس قدر شاندار سیمینار کے انعقاد پر مبارکباد پیش کی کہ اس میں سیاست دان، اہل دانش اور ارباب صحافت بڑی تعداد میں نظر آ رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ بھارت نے پاکستان کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا شروع کر رکھا ہے جس کا بڑا مقصد چین، پاکستان اقتصادی راہداری کی تکمیل میں رکاوٹیں ڈالنا ہے، مگر ہم اسے خلل ڈالنے کی اجازت نہیں دیں گے اور ہر قیمت پر راہداری تعمیر کریں گے۔ انہوں نے بتایا کہ میں کئی بار بھارت گیا ہوں اور مقبوضہ کشمیر کی کشمیری قیادت سے ملا ہوں۔ اس کی رائے یہ تھی کہ عسکریت پسندی سے کشمیر کاز کو شدید نقصان پہنچا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کشمیری نوجوان جو ایک نئے عزم اور حکمت عملی کے ساتھ اُٹھے ہیں، وہ قائداعظم اور نیلسن منڈیلا کے اصولوں پر چلتے ہوئے ایک پُرامن اور قانونی تحریک مزاحمت کی قیادت کر رہے ہیں۔ پاکستان کو انہیں بھرپور اخلاقی، سیاسی اور سفارتی کمک فراہم کرنی چاہیے۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ اس تحریک مزاحمت میں غیر مسلم کشمیری بھی شامل ہو رہے ہیں اور وادیٔ کشمیر کا ذہنی رابطہ بھارت سے کٹتا جا رہا ہے۔ اُن کی تجویز تھی کہ ہمیں آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان میں مثالی حکومتیں قائم کرنی چاہئیں تاکہ دنیا پر یہ واضح ہو جائے کہ مقبوضہ کشمیر پر بھارت کے غاصبانہ قبضے نے کشمیریوں کی زندگی کس قدر اجیرن بنا دی ہے جبکہ پاکستان میں انہیں باوقار زندگی کی تمام سہولتیں موجود ہیں اور وہ اپنا ایک تشخص قائم رکھے ہوئے ہیں۔

جناب وزیراعلیٰ نے گلگت بلتستان کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ تقسیم ہند کے ایک سال بعد اس علاقے کے بہادر

سپاہیوں نے آزادی حاصل کرلی اور پاکستان میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا تھا لیکن جب سلامتی کونسل نے کشمیر پر قرارداد منظور کرتے ہوئے رائے شماری کا اصول تسلیم کیا تو یہ ضروری سمجھا گیا کہ گلگت بلتستان کو کشمیر کا حصہ بنا دیا جائے کہ اس طرح یہاں کی بھاری مسلم اکثریت جموں میں معمولی ہندو اکثریت پر حاوی رہے گی۔ اس طرح یہ علاقہ کشمیر کا حصہ قرار پایا اور اسے پاکستان میں شامل نہیں کیا جا سکا۔ آج ہمیں اس علاقے کی آئینی حیثیت کے حوالے سے تمام پہلوؤں کا نہایت گہرائی کے ساتھ جائزہ لینا ہوگا۔

جناب عبدالرشید ترابی

آزاد جموں و کشمیر کی جماعت اسلامی کے امیر جو اسلام آباد سے تشریف لائے۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ مطالعہ کشمیر ہمارے ہاں نصاب میں شامل ہونا چاہیے' کیونکہ کشمیری عوام کی بے مثال جدوجہد ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ آج مقبوضہ کشمیر میں نوجوان جس عزم کے ساتھ تحریک مزاحمت کی قیادت کر رہے ہیں' ہم انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں اور انہیں ہر نوع کی اخلاقی' سیاسی' قانونی اور سفارتی امداد فراہم کرنے کا عہد کرتے ہیں۔ انہوں نے وزیراعظم نواز شریف کی سفارتی کوششوں کی بھرپور حمایت کی جو وہ جنرل اسمبلی میں کشمیر کا مسئلہ بڑی استقامت سے اجاگر کر رہے ہیں' لیکن اوفا ڈیکلریشن میں جموں و کشمیر کا حوالہ نہ آنے سے بھارت کو مذاکرات سے دامن چھڑانے کا موقع مل گیا ہے۔ انہوں نے شکایت کی کہ مہاجرین کی بارہ نشستیں حکومت اپنے من پسند لوگوں میں تقسیم کر دیتی ہے جبکہ زیادہ مناسب یہ ہے کہ کشمیری ووٹروں کو آزادی سے اپنے نمائندے چن لینے کے لیے سازگار ماحول فراہم کیا جائے۔ ترابی صاحب نے سیمینار کے بروقت انعقاد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس سے کشمیر کاز کو بڑی تقویت پہنچے گی۔

جناب ایس ایم ظفر

چوٹی کے قانون دان جناب ایس ایم ظفر نے اپنے نہایت پرمغز اور خیال افروز صدارتی خطاب میں جموں و کشمیر پر بھارت اور پاکستان کے موقف کا بنیادی فرق بڑی صراحت سے بیان کیا کہ اس کی تین جہتیں ہیں۔ بھارت کا دعویٰ ہے کہ جموں و کشمیر کا علاقہ اس کا حصہ ہے جسے اس کی حکومت "اٹوٹ انگ" کہتی ہے۔ اس کے دعوے کو اس بات سے تقویت ملتی ہے کہ "اٹوٹ انگ" کے ایک حصے پر اس کا قبضہ ہے۔ مزید برآں اس دعوے کے ساتھ الحاق کا ایک مشتبہ خط بھی نتھی ہے جو مبینہ طور پر ریاست جموں اور کشمیر کے راجہ ہری سنگھ کا ہے۔ اس کے برعکس پاکستان کا دعویٰ حق خود ارادیت کے اصولوں پر مبنی ہے۔ اس دعوے کی حمایت انسانی حقوق کا چارٹر اور عوام کے سیاسی حقوق کرتے ہیں جنہیں اقوام متحدہ اور عالمی برادری نے تسلیم کیا ہے۔ پاکستان کے اصولی موقف کی تائید پنڈت نہرو نے پارلیمنٹ میں کی اور سلامتی کونسل میں اس پر عمل درآمد کا عہد کیا

تھا۔ اس کے علاوہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں اقوام متحدہ کمیشن برائے انڈیا اور پاکستان رائے شماری کے حق میں قرارداد منظور ہوئی۔ سب سے اہم بات یہ کہ پاکستان نے دعویٰ کیا کہ مہاراجہ نے الحاق کا جو مشتبہ خط دیا وہ ایک سازش کا نتیجہ تھا کیونکہ بھارتی فوج نے اس سے پہلے ہی ریاست پر قبضہ کرنے کا آپریشن سرینگر سے شروع کر دیا تھا اور مہاراجہ دارالحکومت سے فرار ہو گیا تھا۔ کچھ مورخین نے یہ حقیقت ریکارڈ کی ہے کہ جس تاریخ کو مہاراجہ نے مشتبہ الحاق کی دستاویز پر دستخط کیے وہ اس تاریخ کو ریاست جموں و کشمیر میں موجود ہی نہیں تھا۔ ہم اختصار کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بھارت کا دعویٰ زمین کے ایک ٹکڑے پر ہے جبکہ پاکستان کا موقف عالمی اصولوں پر قائم ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ جھگڑا زمین کے قبضے اور عوام کے حقوق کے درمیان ہے۔

تاریخ کے گہرے شعور کے حامل صدر مذاکرہ نے قبضہ کشمیر کا ایک اور پہلو سے جائزہ لیا اور یہ مژدہ سنایا کہ انجام کار تاریخ میں فتح اصولوں کی ہوتی ہے کیونکہ عوام کے حقوق ہتھیاروں سے کچلے نہیں جا سکتے۔ فرانس کے عوام نے انقلاب کے ذریعے بادشاہت سے آزادی حاصل کی۔ اسی طرح روس کے عوام نے سرمایہ داری کے خلاف بغاوت کی اور جنوبی افریقہ میں نسل پرستی کے خلاف نیلسن منڈیلا کی طویل پرامن جدوجہد کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ اسی طرح برطانیہ کے خلاف امریکی عوام اُٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے تاریخ کی ایک خونریز جنگ کے بعد آزادی حاصل کی اور تاریخ کو ایک عظیم ''اعلان آزادی'' سے روشناس کرایا۔ برصغیر میں آل انڈیا کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ نے سیاسی جدوجہد کے ذریعے عوام کی خواہشات کے مطابق ایک استعماری طاقت برطانیہ سے آزادی حاصل کی اور بھارت اور پاکستان کی نئی ریاستیں وجود میں آئیں۔

جناب ایس ایم ظفر نے پُرامید لہجے میں کہا کہ پاکستان کو جموں اور کشمیر پر اپنے موقف کی صداقت پر کامل یقین ہے اور یہاں کی حکومتیں اور عوام پوری طرح پُرامید ہیں کہ تاریخ جموں و کشمیر کے عوام کے حق میں ایک روز اسی طرح فیصلہ صادر کرے گی جس طرح وہ ماضی میں صادر کرتی آئی ہے۔ اس یقین اور اعتماد کی بنیاد پر آخری فتح تک پاکستان کی کوئی حکومت جموں و کشمیر کے عوام کی تحریک اور عظیم کاز سے صرفِ نظر نہیں کر سکے گی۔ انہوں نے اپنے دورہ بھارت کے تاثرات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ میں سید علی گیلانی کے علاوہ تحریک مزاحمت کے دوسرے قائدین سے ملا۔ انہوں نے بتایا کہ آج کی تحریک مزاحمت مقامی باشندوں پر مشتمل ہے جس کا دامن عسکریت پسندی اور بیرونی مالی امداد سے بالکل صاف ہے اور اس میں نوجوان زیادہ فعال ہیں۔ اب قائدین کی حیثیت نوجوانوں کو مجتمع رکھنے کی ہے۔ میں جب باہر آیا تو میری ملاقات کشمیری طلبہ کے ایک وفد سے ہوئی جو جموں و کشمیر کے علاوہ دہلی سے بھی آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ہم یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے ہیں۔ دن کے وقت تعلیم پر پوری توجہ دیتے ہیں اور فارغ وقت میں جلوس نکالتے ہیں۔ ہم سید علی گیلانی کی قیادت سے بے پناہ تحریک پاتے ہیں۔ انہوں نے بیک آواز اس گہری وابستگی کا سبب یہ بتایا کہ عوام کے حقوق کے ساتھ اُن کی ناقابل شکست کومٹ منٹ اور اُن کے ساتھ کھڑے رہنے کا مصمم عزم۔ اُن کے دبلے پتلے جسم کے اندر فولادی قوت موجود ہے۔ جس طرح قائداعظم محمد علی جناح فولادی قوت ارادی کے مالک تھے۔ طلبہ نے کہا کہ ہمیں پورا یقین ہے کہ جس طرح قائداعظم تمام قوتوں کو شکست دے کر اپنے عظیم الشان مقصد میں کامیاب ہوئے تھے اسی طرح ہم بھی سید علی گیلانی کی راہنمائی میں کامیابی سے ہمکنار ہوں گے۔ جناب ایس ایم ظفر نے سید علی گیلانی کے ساتھ اپنی گفتگو کا وہ حصہ سنایا جو پاکستان اور کشمیر

کے مابین گہرے رشتے کو اُجاگر کرتا ہے۔ وہ بتا رہے تھے کہ میں نے جموں و کشمیر کے دورے کے دوران دیگر قائدین کی موجودگی میں سید علی گیلانی سے کہا کہ ایٹمی طاقت بن جانے کے بعد پاکستان، جموں و کشمیر کے عوام کو بڑے اعتماد سے سیاسی اور سفارتی حمایت فراہم کر سکے گا۔ اس پر وہ مسکرائے اور کہا "ہمیں دعائیں دو کہ تمہیں نیوکلیئر بنا دیا۔"

صدر مجلس کہہ رہے تھے کہ میں وہاں سے اس حتمی رائے کے ساتھ واپس آیا کہ جموں و کشمیر کے عوام کی جدوجہد میں پہلی بار ایک عوامی تحریک اُٹھی ہے جو اپنے مزاج میں قانونی بھی ہے اسلحے سے پاک بھی ہے اور اس لیے ناقابل شکست ہے۔ مجھے اس بات کا اس لیے بھی یقین تھا کہ بھارت کی مسلح فوج اور سخت گیر قوانین جو مقبوضہ کشمیر میں عوامی تحریک سے نمٹنے کے لیے استعمال کیے جا رہے ہیں، وہ بھارت کے خلاف نتائج پیدا کر رہے ہیں۔ اس طرح کے ہتھکنڈے شدید نفرت کو جنم دیتے ہیں جس کے باعث ظلم انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ جموں و کشمیر کے قائدین میر واعظ عمر فاروق، یاسین ملک، مسز بھٹی اور ایڈووکیٹ انصار نے ہیومن رائٹس کمیٹی کو مقبوضہ کشمیر کے اندر کی صورتِ حال کے بارے میں بتایا کہ کوئی گھر ایسا نہیں جس میں مائیں اور بہنیں اپنے گم شدہ بیٹوں اور بھائیوں کی واپسی کا بے قراری سے انتظار نہ کرتی ہوں۔ اُن کے سینوں میں بھارت کے خلاف نفرت کا لاوا پک رہا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ دیکھتے ہی گولی مار دینے کے واقعات میں تشویش ناک حد تک اضافہ ہو رہا ہے اور نفرت کے شعلے لپک رہے ہیں۔ یاسین ملک نے بڑے تیکھے انداز میں بتایا کہ لفظ "آزادی" "ظلم کے خلاف ایک چیخ ہے اور جموں و کشمیر میں لوگ "بندی آزادی" کے خواب دیکھتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آزادی کے حصول تک آگ تھمے گی نہ انقلاب روکا جا سکے گا۔

انہوں نے تاریخ کے حوالے سے ایک اہم نکتہ اٹھاتے ہوئے کہا کہ مقبوضہ کشمیر میں بھارتی اور ریاستی فوج کی تعداد بتدریج اس درجے تک پہنچ گئی ہے جب امریکہ کو ویت نام سے نکلنا پڑا تھا۔ اُن کے تجزیے میں بڑی صداقت اور غیر معمولی بصیرت پنہاں تھی۔

جناب ایس ایم ظفر نے بھارت کی طرف سے پھیلائے ہوئے پروپیگنڈے کا جواب اس مکالمے کی روداد سناتے ہوئے دیا جو پیرس میں فرانس کی فارن افیئرز کمیٹی کے چیئرپرسن کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ بتا رہے تھے کہ میرا نوابزادہ نصراللہ خاں کی قیادت میں ایک وفد کے ساتھ پیرس جانا ہوا۔ اس وفد میں جناب عبدالرشید ترابی بھی شامل تھے جو سیمینار میں موجود ہیں۔ ہماری ملاقات فرانس کی امورِ خارجہ کی کمیٹی سے ہوئی۔ خاتون چیئرپرسن نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کے پاس بھارت کی اس دلیل کا کیا جواب ہے کہ جموں و کشمیر کے عوام کو رائے شماری کا حق دینے سے بھارت میں اس طرح کے فرقہ پرست گروپس بھارت سے علیحدگی چاہیں گے۔ میں نے جواب میں کہا تھا کہ اگر بھارتی لیڈر اپنے ہی لیڈر کے وعدے کو تسلیم کریں جو اس نے ۱۹۵۰ء میں ساری دنیا کے سامنے کیا تھا اور سلامتی کونسل کی قرارداد پر عمل درآمد کے لیے تیار ہو جائیں اور ریاستی معاملات "آزادی ہند ایکٹ" کے مطابق چلائیں، تو پھر کوئی بھی فرقہ وارانہ گروپ بھارت سے علیحدگی کی راہ اختیار نہیں کرے گا کیونکہ اسے "آزادی ہند ایکٹ" کی حمایت حاصل ہو گی نہ اس کی پشت پر بھارت کے بانی پنڈت نہرو کا وعدہ ہو گا اور نہ سلامتی کونسل کی قرارداد اس کے وعدے کی حمایت کرے گی جس نے جموں و کشمیر کو ایک متنازع علاقہ قرار دیا تھا۔ وہ اگر حقیقت سے بے خبر اور غافل رہے اور جموں و کشمیر کے عوام نے خون کے دریاؤں سے گزر کر آزادی حاصل کر لی تو میں یقین دلاتا ہوں کہ کوئی پالیسی اور کوئی حکمت عملی بھارت کو

ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے نہیں بچ سکے گی۔ بھارت کو دو متبادل راستوں میں سے ایک کا چناؤ کرنا ہوگا۔ ایک اصولوں کا راستہ ہے اور دوسرا خون سے لت پت ہے۔ انہوں نے آخری تجویز پیش کی کہ کشمیر کے ایشو پر عالمی رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے اعلیٰ درجے کا انٹرنیشنل کشمیر پبلسٹی سیل قائم کیا جائے۔

جناب بیرسٹر سلطان محمود چودھری

سابق وزیراعظم سیمینار میں شرکت کے لیے میرپور سے آئے اور وہ دوسرے اجلاس سے خطاب کر رہے تھے۔ انہوں نے پہلے سے بیان کردہ حقیقت کی توثیق کی کہ مقبوضہ کشمیر میں نوجوان نسل تحریکِ مزاحمت کی کمان سنبھالے ہوئے ہے۔ یہی وقت ہے جب پاکستان کو جارحانہ طور پر سفارتی پیش قدمی کرنی چاہیے۔ انہوں نے اس خیال کی بھی تائید کی کہ مسئلہ کشمیر کا حل مضبوط پاکستان سے ساتھ وابستہ ہے اور ہمارے میڈیا کو تنازع کشمیر کو اجاگر کرنے میں اپنا قومی کردار ادا کرنا چاہیے۔ اگر پاکستان نے اس نازک مرحلے میں بھرپور کردار ادا نہ کیا تو میں سیمینار کے ذریعے خبردار کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس خطے کا نقشہ تبدیل ہوسکتا ہے۔ بیرسٹر صاحب نے پاکستان کے عوام پر زور دیا کہ وہ کشمیر کے مقدس مشن کی تکمیل کے لیے زیادہ سے زیادہ اخلاقی اور فکری حمایت منظم کریں۔ وہ پُر امید تھے کہ وزیراعظم نواز شریف جنرل اسمبلی کے آنے والے اجلاس میں عالمی ضمیر کو جھنجوڑیں گے اور بھارت پر واضح کر دیں گے جو خطے کا امن تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے اور مقبوضہ کشمیر میں نسل کشی کے بھیانک جرم کا مرتکب چلا آرہا ہے۔

جناب حافظ حسین احمد

جمعیت علمائے اسلام (ف) کے مرکزی قائد کوئٹہ سے تشریف لائے اور متنبہ کیا کہ بی جے پی کی جارحانہ عصبیت سے یہ احساس ہو رہا ہے کہ بھارت ۲۰۱۶ء میں پاکستان پر جنگ مسلط کرسکتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ایک معجزہ ہوگا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہماری کشمیر پالیسی میں ایک استحکام ہونا چاہیے اور جنرل راحیل شریف نے بھارت کو واضح پیغام دے دیا ہے کہ پاکستان میں داخل ہونے والے مسلح دستے زندہ واپس نہیں جائیں گے اور جارحیت کا دندان شکن جواب دیا جائے گا۔ انہوں نے اس امر پر بڑے کرب کا اظہار کیا کہ بھارت مقبوضہ کشمیر کو اپنے اندر جذب کرنے کی مختلف چالیں چل رہا ہے اور اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کے پرچم قومی ترانے اور منتخب ادارے الگ الگ ہیں۔ انہیں کامل یقین تھا کہ پاکستان بھارت کے مذموم عزائم کو خاک میں ملانے کے لیے سفارتی اور عسکری شعبوں میں سبقت لے جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ بھارت فاٹا، کراچی اور بلوچستان میں دہشت گردوں، اُن کے سہولت کاروں اور علیحدگی پسندوں کی حوصلہ افزائی اور طرح طرح کی ریشہ

دوانیوں کو ہوا دے رہا ہے۔ اُن کا مشورہ تھا کہ گلگت بلتستان کی آئینی حیثیت زمینی حقائق اور تاریخی شواہد کی روشنی میں طے کر لی جائے تاکہ کسی غلط فہمی کو ایک نیا فساد پھیلانے کا موقع نہ ملے۔

جناب سردار آصف احمد علی

دوسرے اجلاس کے صدر اور سابق وزیر خارجہ نے اپنے صدارتی خطبے میں نصیحت کی کہ جہاد کے نام پر پاکستان کی طرف سے مقبوضہ کشمیر میں کوئی مداخلت نہیں ہونی چاہیے کیونکہ اس سے تحریک کشمیر کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ وہ اس امر کا انکشاف کر رہے تھے کہ ''کاسابلانکا اعلامیہ'' کے مطابق کشمیر او آئی سی کا سب سے اہم ایشو ہے اور ہمیں کشمیر کی جنگ قانونی ذرائع اور اصولوں کی بنیاد پر پورے عزم کے ساتھ جاری رکھنی چاہیے۔ ہمیں بھارت پر یہ واضح کر دینا چاہیے کہ اس قضیے کے اصل فریق جموں و کشمیر کے عوام ہیں اس لیے ان کی خواہشات کو اولین حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ جناب سردار آصف احمد علی نے تاریخ کی اپنی تشریح بیان کرتے ہوئے کہا کہ تمام تنازعات سمجھوتوں کے ذریعے ہی طے ہوتے ہیں اس لیے ہمیں بھی درمیانی راستہ دریافت کرنا ہوگا اور کشمیریوں کو ایک باوقار زندگی کا ساز و سامان فراہم کرنا ہوگا۔

سردار محمد عبدالقیوم کے لیے فاتحہ خوانی

صدارتی خطاب سے قبل شرکائے سیمینار نے مجاہد اول سردار محمد عبدالقیوم کی روح کو ایصال ثواب پہنچانے کے لیے فاتحہ خوانی کی اور اُن کی عظیم الشان خدمات کو سلام عقیدت پیش کیا۔ وہ اس دار فانی سے ۱۰ رجولائی ۲۰۱۵ کو ماہ رمضان میں کوچ کر گئے تھے۔ وہ مسلم کانفرنس کے سربراہ اور آزاد کشمیر کی تحریک میں سرخیل کی حیثیت رکھتے تھے۔

فاتحہ خوانی کے بعد یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی کے فاضل استاد جناب راحت الحسین نے مقررین اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ سیمینار میں پڑھی جانے والی نظموں نے ایک سماں باندھ دیا اور جذبات میں ایک ارتعاش پیدا کیا۔ جناب عطاء الحق قاسمی، محترمہ عمرانہ مشتاق، محترمہ سعدیہ بشیر اور عزیزہ فاطمہ احمد نے یہ مژدہ سنایا کہ ظلم کی رات ختم ہونے والی ہے۔

جناب سجاد میر جو میزبانی کے فرائض انجام دے رہے تھے انہوں نے تقریروں کے درمیان بھارت کے مشہور کالم نگار جناب کلدیپ نیئر کے کالم سے اقتباسات پڑھ کر سنائے جن میں کہا گیا تھا کہ وادیٔ کشمیر کا ذہنی تعلق بھارت سے کٹ چکا ہے۔ میں پہلے جب بھی سرینگر آتا تو کشمیری قائدین مجھے کھانے پر بلاتے، مگر اس بار مکمل بے تعلقی دیکھنے میں آئی۔ ایسا لگتا ہے کہ کشمیریوں نے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا عزم کر لیا ہے۔

کوریج کے لیے پرنٹ اینڈ الیکٹرانک میڈیا بڑی تعداد میں موجود تھا جس نے وزیر اعلیٰ گلگت بلتستان جناب حافظ الرحمان، بیرسٹر سلطان محمود، جناب عبدالرشید ترابی، جناب ایس ایم ظفر، جناب حافظ حسین احمد اور ارشاد محمود کے تفصیلی انٹرویو نشر کیے۔
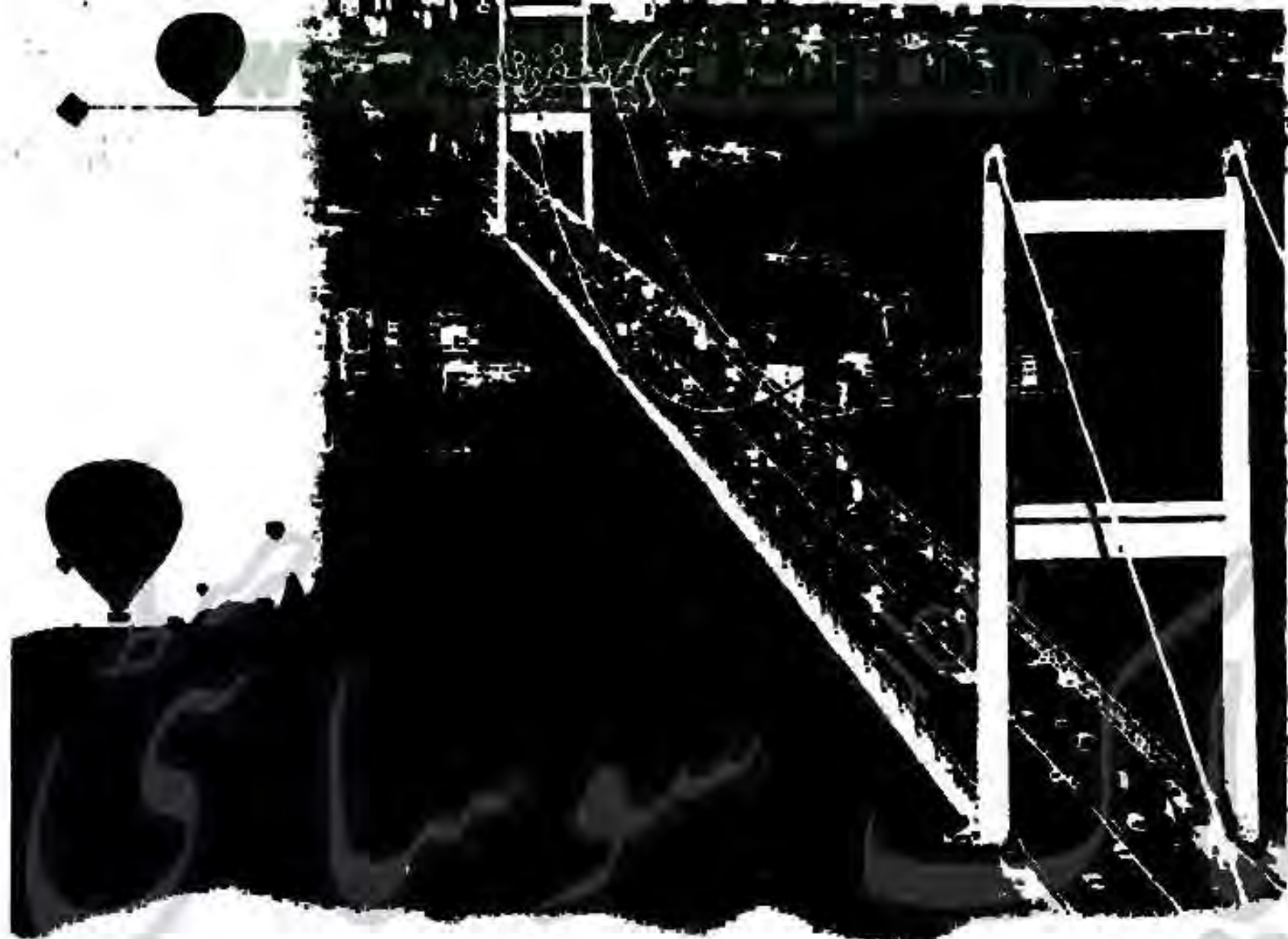
باسفورس کے سحر میں

دورِ جدید کی اہم اسلامی مملکت، ترکی کے تازہ ترین مشاہدات اور تاثرات

طیب اعجاز قریشی

چند سال پہلے مجھے استنبول میں "عربیہ ۵۰۰" (تیزی سے ترقی کرتی کمپنیوں) کی ایک تقریب میں ایوارڈ لینے کے لیے شامل ہونے کا موقع ملا۔ ان تقریبات میں مجھے ترکی کی اعلیٰ سیاسی قیادت اور امریکا کے نائب صدر کے خیالات سننے کا موقع میسر آیا۔ میرا قیام چار دن پر مشتمل تھا۔ اس دوران استنبول شہر کے خوبصورت آرکیٹکچر اور آبنائے باسفورس کے سحر نے مجھے اس حد تک متاثر کیا کہ میں نے دوبارہ ترکی جانے اور وہاں کی ثقافت، تہذیب اور تاریخ کے دریچوں میں جھانکنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔

فجر کے وقت ترکش ایئرلائن کی لاہور سے استنبول پرواز نہایت آرام دہ اور ہماری توقعات کے عین مطابق تھی۔ اس سفر کا ایک مقصد اپنے بچوں کو اسلامی دنیا کی ابھرتی ہوئی اقتصادی طاقت اور ماضی کی ایک عظیم مسلم سپرپاور سے متعارف کرانا تھا۔ قریباً پندرہ دن کے اس دورے کے دوران

ہمیں استنبول، برسہ، کپوڈوکیہ اور انطالیہ کی سیاحت کا موقع ملا۔ اس دوران ترکی کے سیاسی و معاشی حالات بہت قریب سے دیکھنے کا موقع میسر آیا۔ چند اہم ترین سیاحتی مقامات اور وہاں گزرے ہوئے لمحات کی داستان قارئین کی نذر ہے۔

☆☆

برسہ میں تاریخی مقامات کی سیر اور قدیم ترک غسل (ترکش باتھ) کا تجربہ حاصل کیا۔ ایک تالاب کے گرم پانی میں ۲۰ منٹ بیٹھنے کے بعد کپڑے سے پہلے جسم کو جھاگ اور صابن سے غسل دیا جاتا ہے۔ بعد میں ایک ماہر ترک مساج اپنے چمڑے کے دستانے کے ذریعے رگڑ رگڑ کر انسان کو تر و تازہ کر دیتا ہے۔ برسہ میں "اسکندر" نامی ایک مشہور اور لذیذ ڈش کھانے کا مزہ آ گیا۔ گوشت اور روٹی کے ٹکڑوں سے تیار اس کھانے میں مکھن اور دہی کا خاصا استعمال ہوتا ہے۔ ڈونر بھی ترکی کی اہم غذا ہے جو پاکستانی شوارمے سے ملتا جلتا ہے۔

مشہور عثمانی بادشاہ، سلیمان اعظم اور ان کے اہل خانہ کے مقبروں پر فاتحہ پڑھنے اور بہت سی قدیم اور تاریخی اہمیت کی حامل مساجد دیکھنے کا موقع بھی میسر آیا۔ سلطنت عثمانیہ کے دور میں بہت سی خوبصورت مساجد تعمیر کی گئیں۔ عثمانی حکمران مساجد کی تعمیر کے سلسلے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششیں کرتے رہے۔

ان دنوں استنبول کا موسم بطور خاص شام کے وقت بہت خوشگوار ہو جاتا ہے۔ لوگ اپنے اپنے اہل و عیال کے ساتھ باسفورس کے کنارے بیٹھ جاتے ہیں۔ نوجوان اپنے دوستوں کے ہمراہ باربی کیو کے مزے لیتے ہیں۔ وہاں کھانے پینے کی اشیاء بھی بہت مہنگی ہیں۔ کم از کم پندرہ سے بیس لیرے میں ایک وقت کا کھانا میسر آتا ہے جو پاکستان میں چھ سو روپے میں ملتا ہے۔

مہنگائی کی وجہ سے ہم شاپنگ سے محظوظ تو نہیں ہو سکے لیکن استنبول کے مشہور "گرینڈ بازار" کی خوبصورتی اور سیر دلچسپ یادیں چھوڑ گئی۔ مختلف سٹالوں پر ترک خواتین اور افراد گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے اور بارگیننگ (سودے بازی) کے بعد قیمت نصف سے کم کرنے پر تیار ہو جاتے۔

ایک جگہ سے دوسرے سیاحتی مقام آنے جانے کے لیے عموماً ٹیکسی استعمال کی جاتی ہے جس کا کرایہ کم از کم ۴۔۴۴ لیرے (پاکستانی ۱۰۸ روپے) سے شروع ہوتا ہے۔ ٹریفک کے اژدحام کی وجہ سے اکثر اوقات ٹیکسی مہنگی ثابت ہوتی ہے۔ پانچ سو روپے سے ایک ہزار تک ٹیکسی کا کرایہ عام سی بات ہے۔ مسافروں کی سہولت کے لیے جگہ جگہ بس سروس کے ساتھ ساتھ ٹرام اور میٹرو ٹرین بھی موجود ہیں۔ ترکی میں ہوٹل کا معیار بھی مختلف شہروں میں مختلف ہے لیکن یورپ کی طرح کافی مہنگے ہوٹل بھی موجود ہیں۔

ایک عجیب وغریب مقام

کپوڈوکیہ میں صبح کا آغاز ساڑھے چار بجے ہوتا ہے۔ ہوائی غبارے میں سفر ایک یادگار لمحہ ثابت ہوا۔ پینتالیس منٹ کے اس سفر کے دوران سورج نکلنے کا منظر کبھی نہیں بھولا جاسکتا۔ پائلٹ کا ٹیک آف اور لینڈنگ کرنا مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ بچوں نے اس سفر میں جی بھر کے تصویریں بنوائیں اور لطف اٹھایا۔ کپوڈوکیہ میں ایک رات گزارنا بھی دلچسپ واقعہ تھا۔

ہزاروں سال قدیم غار نما ہوٹلوں کا مسحور کن ماحول انسان کو کسی اور دنیا میں لے جاتا ہے۔ پورا علاقہ عجیب وغریب شکلوں کے بنے ہوئے ٹیلوں پر مشتمل ہے جو ہزاروں سال پہلے آتش فشاں کے پھٹنے کی وجہ سے وجود میں آئے۔ اس عجیب وغریب اعجوبے کو دیکھنے کے لیے دنیا بھر سے سیاح کھنچے چلے آتے ہیں۔ یہ اعجوبہ یہاں آنے والے ہر انسان کو اپنے حصار میں لیتا ہے۔ یہاں کے پتھر خواتین کے زیورات میں بھی استعمال ہوتے ہیں جن میں روبی، اونیکس اور سلطانائیٹ دیکھنے کے قابل ہیں۔ ایک پتھر کا نام سلیمان اعظم کی مشہور بیگم حورم (اصل نام خرم) کے نام پر رکھا گیا ہے۔

الطالیہ استنبول سے ۱۹۷ کلومیٹر دور اور ایک گھنٹے کی فلائٹ پر واقع ہے۔ بحیرہ روم کے کنارے آباد یہ شہر سیاحوں کی توجہ کا مرکز رہتا ہے۔ یہاں ساحل سمندر پر خاندان کے لیے ریزورٹ بنائے گئے ہیں جہاں پانی کی سلائیڈز اور کھیلوں کے ساتھ ساتھ سارا دن مختلف سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔ ان میں موسیقی، کھیلوں کے مقابلے اور کھانے پینے کے مختلف اسٹال شامل ہیں۔ بچوں کے لیے یہ مقام نہایت پرکشش ہے۔

جدید ترکی کی ابتدا

بات آگے بڑھانے سے پہلے یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ترکی براعظم ایشیا اور یورپ کے مابین ایک ایسی خلیج پر واقع ہے جس کا آدھا حصہ ایشیا اور آدھا حصہ یورپی کہلاتا ہے۔ کبھی وہ وقت بھی تھا جب سلطنت عثمانیہ یورپ اور مشرق وسطیٰ کے وسیع علاقے پر قابض تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سلطنت عثمانیہ زوال پذیر ہوئی۔ خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد کمال اتاترک ایک ہیرو کی شکل میں ابھر کر سامنے آئے اور انہوں نے جدید ترکی کی بنیاد رکھی۔

یہ وہ دور تھا جب ترکی کے لوگ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے اور معاشی اعتبار سے بھی پسماندہ تھے۔ اس وقت ذرائع نقل وحمل نہ ہونے کے برابر تھے۔ لوگ جانوروں کے ذریعے نقل وحمل کرتے۔ اس قدر پسماندگی کی وجہ سے یورپی سیاح ترکی کا رخ نہ کرتے اور مقامی لوگوں میں بھی ملک سے باہر جانے کا رجحان نہ ہونے کے برابر تھا۔ بہرحال ترک باشندے سیاحوں کو عقل وذہانت کا ذخیرہ تصور کرکے ان سے سیکھنے کی جستجو اور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے۔ کمال اتاترک نے جدید ترکی کی بنیاد رکھ کر ترک قوم کو نئے انداز سے جینے کا راستہ دکھایا۔ لیکن بعض یورپی ممالک کے نزدیک ترکی پھر بھی اجنبی، مخالف تہذیب اور کلچر کا حامل ملک رہا، جو یورپ کے نظریات سے مطابقت نہیں رکھتا تھا اور جس کی بنیادی وجہ پسماندگی اور معاشرتی ڈھانچے کی کمزوری قرار دیا جاتا۔

مصطفیٰ کمال کے حامیوں کا خیال تھا کہ صرف تعلیم اور معاشی خوشحالی انہیں یورپی ممالک کے لیے قابل قبول بنادے گی جبکہ ان کے مخالفین کا نظریہ اس کے برعکس تھا۔ ان کے مطابق ترک قوم معاشی اور تعلیمی اعتبار سے جتنی بھی ترقی کرلے، سلطنت عثمانیہ کے دور میں ہونے والی صلیبی جنگوں کے تناظر میں مغربی اقوام کے تحفظات اور مخالف نظریات تبدیل نہیں ہوسکتے۔ ان کے نظریے کے مطابق یورپی ممالک ترک عوام کے کبھی دوست نہیں بن سکتے۔ مثالی دوستی کا حق

صرف ترک ہی ترک کے ساتھ ادا کر سکتا ہے کوئی اور نہیں۔

بحرانوں کی زد میں

اس کے باوجود کہ ترک بہت خوددار قوم ہے، لیکن اس وقت اُسے اپنی شناخت کے بحران کا سامنا ہے جو ایشیا اور یورپ کے درمیان تقسیم ہو چکی۔

ترکی کی آبادی تقریباً سات کروڑ ساٹھ لاکھ ہو چکی ہے۔ ترکی کے ہمسائے میں آٹھ ممالک آباد ہیں جن میں ایران' عراق' آرمینیا' آذربیجان' جارجیا' بلغاریہ اور یونان شامل ہیں۔

اس وقت برادر اسلامی ملک ترکی اندرونی اور بیرونی سطح پر ایک ایسے منجدھار میں الجھا ہوا دکھائی دیتا ہے جس سے نکلنے کا بظاہر کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ ترکی کو درپیش بحران کی چند اہم جھلکیاں ترک اخبارات کی شہ سرخیوں میں ملاحظہ کیجیے:

☆ ملک میں دہشت گردی کے بڑھتے واقعات کی وجہ سے مارشل لا کی تجویز پیش کی گئی۔

☆ کرد جماعت، پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی (HDP) کے ایک سینئر راہنما کے مطابق طیب اردگان دانستہ ترکی کو خانہ جنگی کی طرف لے جا رہے ہیں۔

☆ ۱۹ اگست..... کرد ورکرز پارٹی کے لگائے بم کی وجہ سے آٹھ سیکیورٹی اہلکاروں کی ہلاکت کے بعد ایم ایم پی (MMP) کے راہنما نے ترکی میں مارشل لا کے نفاذ کا مطالبہ کر دیا۔

☆ ترکی کے ایف سولہ طیاروں نے ایرانی بارڈر کے قریب پی کے کے، کے کیمپ پر فضائی حملہ کر کے ۱۹ شدت پسندوں کو ہلاک کر دیا۔

☆ جولائی سے اب تک کرد چالیس ترک فوجیوں کو ہلاک کر چکے۔ مذاکرات کی منسوخی کے بعد ترک فوجیوں کے حملوں میں تیزی آ چکی اور حالات کسی بھی وقت قابو سے باہر ہو سکتے ہیں۔

☆ شام کے مہاجرین کو ازمیر کی مسجد میں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ بیس لاکھ مہاجرین کی آمد پر ترکی چھ ارب ڈالر خرچ کر چکا اور اب یورپ کے تمام ممالک سے مدد کی اپیل کر رہا ہے۔

گروہوں میں تقسیم ترک معاشرہ

استنبول میں سیاحت کے دوران وہاں غیر ملکی طلبہ بشمول پاکستانیوں سے بھی ملاقات ہوئی اور اُن کے تاثرات جاننے کا بھی موقع ملا۔ ان کے مطابق ترک تعلیمی نظام اب کافی مضبوط ہو چکا لیکن اب بھی انگریزی زبان سے ناواقفیت سیاحوں کے لیے مسئلہ رہتی ہے۔ ابتدائی تعلیم کے ادارے اچھا کام کر رہے ہیں لیکن اب تک اعلیٰ تعلیم کے لیے بین الاقوامی سطح کی یونیورسٹیاں نہیں بن سکیں۔ طلبہ اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ اور امریکا کا رخ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک میں صنعتوں کا جال بھی نہیں بچھایا جا سکا۔ صرف ٹیکسٹائل کی صنعت ہی ترقی کر سکی ہے۔

طلبہ کی حتمی رائے تھی کہ بیشتر ترک غیر ملکیوں کو ہیلو ہائے یا رسمی طور پر اپنے ملک میں خوش آمدید تو کہتے ہیں لیکن دوستی وہ

صرف اپنے ہم وطن اور ہم خیال ترکوں ہی سے کرتے ہیں۔ غیرملکیوں سے وہ ایک فاصلہ پر ہی رہتے اور انھیں اپنے قریب نہیں آنے دیتے۔ البتہ وہ ترک جو اپنے موجودہ نظام، تہذیب وتمدن اور ترکی کے ماضی سے شناقی ہیں، وہ نہ صرف غیرملکیوں کو پسند کرتے بلکہ اُن میں گھل مل بھی جاتے ہیں۔ وہ وطن پرست ترکوں سے نفرت کرتے اور ان سے بہت کم میل جول رکھتے ہیں۔ اُن کی تفریحات اور ثقافت بھی مختلف ہیں۔

دراصل موجودہ ترکی معاشرہ کئی طبقوں اور تہ در تہ گروہوں میں تقسیم نظر آتا ہے۔ دائیں بازو کے نظریات کا حامل گروہ ماضی کے برعکس اپنی گرفت مضبوط کرتا جا رہا ہے۔ شہروں میں جگہ جگہ نئی مساجد اور مدرسوں کی تعمیر کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ اردگان حکومت اس چلن کی سرپرستی کر رہی ہے۔ جس کا ایک مقصد عثمانیہ دور کے رسم الخط اور خواتین کے حوالے سے حجاب جیسی اقدار کا احیا ہے۔ یہ گروہ حکومت کو غیرمعمولی اختیارات کا حامل سمجھتا اور اس کے ذریعے ملک میں شریعت کا نفاذ چاہتا ہے۔

دوسرا بڑا گروہ سیکولر کمال اتاترک کے جدید نظریات کا حامی اور جیو اور جینے دو کی پالیسی کا ہر سطح پر پرچار کرتا ہے۔ وہ مذہب کی بنیاد پر کسی شخص کی ذاتی زندگی پر حکومت کا عمل دخل نہیں چاہتا۔ یہ گروہ جزا و سزا کا اختیار صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو سمجھتا ہے۔ نظریات، مسلک یا اختلاف رائے کی بنیاد پر کسی کو کافر قرار دینے کا مخالف بھی ہے۔

یہ گروہ ایسا ترک معاشرہ چاہتا ہے جہاں شہریوں کو مغربی معاشرے کی طرح شخصی آزادی حاصل ہو، وہ اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کریں اور اپنی من پسند زندگی بسر کر سکیں۔ ریاست یا حکومت مذہبی تفریق کے بغیر صرف افراد کی جان و مال اور فلاح و بہبود کا کام کرے۔ لوگوں کی خدمت کے لیے حکومت ہو نہ کہ لوگوں پر حکمرانی کے لیے! یہ گروہ مذہبی آزادی کا قائل ہے اور اس کی دلیل وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ حکومت سے دیتے ہیں جس میں تمام مکاتب فکر اور مذاہب کے لوگ مکمل آزادی سے اپنی زندگی گزارتے رہے۔

تیسرا بڑا گروہ ترکی کے نوجوانوں کی بڑی تعداد پر مشتمل ہے جس کی پرورش پچھلے پندرہ بیس سالوں کے دوران ہوئی جب ترکی اناطولین ٹائیگرز اور فتح گولن جیسی تحریکوں کے بل پر تیزی سے خوشحالی کے زینے طے کر رہا تھا۔ یہ گروہ ماضی سے ناواقف ہے اور نہ ہی وہ کسی اور سیاسی یا مذہبی گروہ سے اپنا گہرا تعلق استوار رکھنا چاہتا ہے۔ وہ صرف اور صرف معیشت کی ترقی چاہتا ہے جو اب بظاہر بہت مشکل نظر آتی ہے۔ پچھلے کئی ماہ سے ترکی کی معیشت مسلسل زوال کا شکار ہے جس کی وجہ سے یہ گروہ شدید اضطرابی کیفیت میں مبتلا ہے۔ فتح اللہ گولن کی تحریک جو ماضی میں طیب اردگان کی حامی تھی، اب زیرِعتاب ہے۔ اس تحریک سے وابستہ اداروں اور افراد کا جینا دوبھر کر دیا گیا ہے۔ آئے دن کسی نہ کسی بہانے اس تحریک سے وابستہ سرکاری و غیرسرکاری شخصیات کی گرفتاریاں عمل میں آتی رہتی ہیں۔

کرد مسئلہ

"کرد" ایشو بھی پوری طاقت سے اپنا سر اُٹھا رہا ہے بلکہ ترکی کے کئی علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے چکا۔ کردوں اور اس کے حامیوں کے خیال میں کوبانی پر داعش کے قبضے اور اس کے بعد ترک حکومت نے خاموشی اختیار کر کے کردوں کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ اب وہ حکومت سے بات چیت یا مذاکرات سے پیچھے ہٹ کر مسلح محاذ آرائی پر اُتر آئے ہیں۔ میرے پندرہ روزہ قیام کے دوران استنبول شہر میں کرد چھاپہ ماروں نے کئی اہم مقامات پر ترک سیکیورٹی اہلکاروں پر حملے کیے جن میں تاریخی ڈولمے باچے کا محل، میڈیا ٹاؤن اور بزنس مین کی گاڑی پر بے تحاشہ فائرنگ بھی شامل ہے۔ جولائی سے اب تک ترک سیکیورٹی اداروں کے چالیس افراد ہلاک ہو چکے۔ بڑھتی ہوئی ہلاکتوں کو دیکھتے ہوئے بہت سے تجزیہ نگار ان

کارروائیوں کو طویل مدتی خانہ جنگی کا آغاز قرار دیتے ہوئے اس کا ذمےدار موجودہ حکومت اور طیب اردگان کو سمجھتے ہیں۔

کرد قوم اب ایک حقیقت کا روپ دھار چکی۔ یہ دنیا کی بدقسمت (سنی العقیدہ) قوم بیک وقت چار ممالک .....ترکی' ایران' شام اور عراق کے سرحدی علاقوں میں صدیوں سے آباد چلی آرہی ہے۔ سخت مزاج کی حامل یہ جنگجو قوم پہاڑوں میں زندگی گزارنے کی عادی ہے۔ سلطنت عثمانیہ کے اختتام سے پہلے کرد قوم عثمانی سلطنت اور صفوی سلطنت کے علاقوں میں بستی تھی۔ ان کی زبان فارسی تھی جو انہیں ایران سے زیادہ قریب لے جاتی ہے لیکن زیادہ تر کرد سنی مسلمان ہیں جو ایران کے شیعہ مسلک کے لیے ناقابل قبول ہیں۔ ترک شہر دیار بکر میں کردوں کی اکثریت آباد ہے۔ وہاں تین زبانیں بولی جاتی ہیں: کرمان جی' زازا اور سورانی۔ کرد بنیادی طور پر زرتشتی ہیں۔ عربوں کی فتوحات کے بعد انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اب بھی ترکی' ایران اور شام میں آباد یزیدی کرد اپنے آپ کو "زورشستری" (Zoroastrian) کہلاتے ہیں۔ دیار بکر' سیرت اور ماردین جنوب مشرقی ترکی میں واقع مشہور کرد شہر ہیں۔

ترکی اور کردوں کے مابین مذاکرات کی منسوخی اس وقت ہوئی جب کوبانی پر داعش کے قبضے کے بعد ترک حکومت خاموش رہی اور اس نے کوئی جوابی کارروائی نہیں کی۔

کردوں کی نمائندہ جماعت کردستان ورکر پارٹی (پی کے کے) ۱۹۷۸ء میں معرض وجود میں آئی جس کے راہنما عبداللہ اوقلان ہیں جو ۱۹۴۸ء میں پیدا ہوئے۔ پختونوں کی طرح کرد قوم بھی مختلف قبیلوں میں بٹی ہوئی ہے اور یہ قوم بھی آپس میں لڑنے کی ایک وسیع تاریخ رکھتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں کچھ کرد قبیلے روس کے ساتھ مل کر سلطنت عثمانیہ کے خلاف لڑتے اور کچھ عثمانیوں کے ساتھ روس کے خلاف نبردآزما رہے۔ اس کے بعد بعض کرد قبیلے برطانیہ کے شانہ بشانہ لڑے تو کچھ کرد قبیلے برطانیہ کے خلاف صف آرا ہوئے۔ شام کے صدر حافظ الاسد (جو ترکی کے مخالف تھے) نے کردوں کو دمشق کے قریب اکٹھا ہونے کا موقع فراہم کیا۔ ترکی نیٹو کا رکن تھا اور شام روس کا اتحادی۔ یہ رقابت بھی ترکی اور شام جیسے مسلم ممالک کے مابین فاصلے پیدا کرنے کا باعث بنی۔

کرد چھاپہ ماروں نے ۱۵ اگست ۱۹۸۴ء کو ترک سکیورٹی فورس پر پہلا حملہ کیا۔ یہ حملہ طویل گوریلا جنگ کی ابتدا تھی جبکہ اس جماعت کا سربراہ عبداللہ اوقلان شام میں بیٹھا سرمایہ اور ہتھیار بھیج کر ترکی میں خانہ جنگی اور تخریب کاری کو فروغ دیتا رہا۔

نئے انتخابات کا اعلان

ترکی میں مندرجہ بالا گروہوں کے علاوہ دیگر نظریات اور خیالات رکھنے والے گروہ بھی موجود ہیں۔ دراصل ترک معاشرہ نہایت پیچیدہ اور عجیب و غریب گروہ بندی کا شکار ہے جس کو یکجا کر کے ایک قوم کی شکل دینا اب مشکل نظر آرہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۷ جون ۲۰۱۵ء کے انتخابات میں عوام نے مختلف جماعتوں کو ووٹ دے کر مخلوط حکومت بنانے کا پیغام دیا۔ طیب اردگان جن کا خواب الیکشن میں واضح برتری پا کر آئین میں تبدیلی کے ذریعے صدارتی طرز حکومت قائم کرنا تھا، وہ چکنا چور ہو گیا۔ انھوں نے دوسری بڑی جماعت کو حکومت بنانے کی دعوت ہی نہ دی

بلکہ اچانک نومبر ۲۰۱۵ء میں ایک بار پھر نئے انتخابات کا اعلان کرکے اپنے مخالفین کی تعداد میں مزید اضافہ کرلیا۔ وہ اکثریت حاصل کرلیں گے جبکہ اُن کے ناقدین کی رائے میں اب یہ قطعی ناممکن ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ فی الوقت طیب اردگان غیر معمولی اختیارات کے حامل سربراہ حکومت بن چکے۔

ایشیا اور یورپ میں تقسیم ہونے والا ملک، ترکی اس وقت بحرانوں کی زد میں ہے۔ اس کی سرحدوں پر ایک طرف شام جنگ کے شعلوں کی لپیٹ میں ہے اور اُن کی تپش ترکی میں شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ قریباً بیس لاکھ شامی مہاجرین کی دیکھ بھال پر ترک حکومت اب تک چھے ارب ڈالر خرچ کرچکی۔ وہ ایک طرف ملک میں امن وامان کا مسئلہ بن رہے ہیں، تو دوسری طرف سستی لیبر (مزدوری) کے ذریعے مقامی شہریوں کی حق تلفی کررہے ہیں۔ وہ جلد از جلد یونان سے اٹلی منتقل ہونا چاہتے ہیں' لہٰذا یورپ کے لیے بھی دردِ سر بن رہے ہیں۔

ترک فضائیہ اتحادیوں سے مل کر شام اور عراق، دونوں محاذوں میں مصروف عمل ہے۔ ترک ایف سولہ طیارے داعش کردوں کے زمینی اہداف پر حملہ کررہے ہیں۔ ملکی معیشت کئی وجوہ کی بنا پر مسلسل زوال پذیر ہے۔ ترکش کرنسی، لیرا ڈالر کے مقابلے میں تیزی سے اپنی قدر کھو رہا ہے۔ سیاحوں کی کمی کی وجہ سے حکومت کو اسکولوں میں دو مہینوں کی تعطیلات میں اضافہ کرنا پڑا تاکہ سیاحتی صنعت کی تھوڑی بہت اشک شوئی کی جاسکے۔ امریکا اور یورپ سے سیاحوں کی تعداد میں خاطر خواہ کمی واقع ہوچکی، وہ سمجھتے ہیں کہ ترکی اس وقت حالتِ جنگ میں ہے اور وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں۔

تیل اور گیس کی قیمتوں میں اضافے' سیاسی عدم استحکام، ملک میں امن وامان کی غیر تسلی بخش صورت حال' سرحد کے اطراف خانہ جنگی اور دنیا بھر میں جاری اقتصادی سست روی نے ترک معیشت کی چولیں ہلا ڈالی ہیں اور مہنگائی نے لوگوں کے لیے مشکلات کھڑی کرنا شروع کردی ہیں۔

استنبول کا مشہور تقسیم سکوائر (Taksim Square)

ترک معاشرے کے خدوخال

استنبول کے کچھ علاقوں میں ایک ہی وقت اذان کی آواز قریب قریب قائم بہت سی مساجد سے سنائی دیتی ہے لیکن یورپ سے ملحقہ ترک علاقوں کی طرف واقع مساجد میں پتا ہی نہیں چلتا کہ نماز کب شروع اور ختم ہوئی۔ ماضی میں عربی کو دیس نکالا دینے والے بہت سے ترک اب اس زبان کو اپنے لیے ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ عرب ممالک سے آنے والے سیاح بڑی تعداد میں ترکی کا رخ کرتے اور خرید و فروخت اور سیاحت پر اربوں ڈالر خرچ کررہے ہیں۔

صورت حال مجموعی طور پر ترکی کی وحدت اور سالمیت کے لیے مزید خطرات کا باعث بن رہی ہے۔ ساتھ ساتھ سیاسی، اقتصادی اور معاشی اعتبار سے ترک قوم کو اندرونی اور بیرونی سطح پر کئی چیلنجز کا سامنا ہے۔ ان سے عہدہ برآں ہونے کے لیے جس قدر متحرک اور مستعد قیادت کی ضرورت تھی، اُسے طیب اردگان پوری کرنے میں شاید ناکام دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنی صوابدید کے مطابق ترکی کو اندرونی اور بیرونی بحرانوں سے نکالنے کے لیے جتنے بھی اقدامات سیاسی اور معاشی میدان میں کررہے ہیں، ان کے نتائج بالکل برعکس سامنے آرہے ہیں۔ ترکی کو مسلم دنیا کا ایک مضبوط اور معاشی اعتبار سے طاقتور ملک تصور کیا جانے لگا تھا، مگر اب یہ تصور ماضی کے دھندلکوں میں غائب ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔

ترک قوم اب تک پاکستان کی احسان مند ہے اور دوستی کے جذبات رکھتی ہے لیکن زیادہ تر نئی نسل اب پاکستان کے بارے میں بہت کم جانتی ہے۔

پچھلے چند برسوں میں پاکستان میں فتح اللہ گولن کی تحریک سے وابستہ ترکوں نے کئی منصوبے شروع کیے جو زیادہ تر لاہور کی حدود میں قائم ہوئے۔ ان میں صفائی کا نظام، میٹرو بس سروس، پولیس کی تربیت وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ترک اسکول اور اسپتالوں کا نیٹ ورک بہت سے شہروں میں قائم ہوچکا۔ فی الحال ترک منصوبوں میں سست روی واقع ہوچکی ہے۔

◆◆◆

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کی نصیحت

تاریخِ اسلام سے اخلاق سنوارنے میں مدد دینے والے زرّیں واقعے

مولانا محمد یونس ندوی

خلیفہ راشد پنجم، حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز ایک مرتبہ اپنے گھر تشریف لائے، تو بیوی سے فرمایا "تمھارے پاس کچھ پیسے ہوں، تو انگور خرید لوں۔"

انھوں نے فرمایا "میرے پاس رقم نہیں، لیکن آپ اتنے جلیل القدر خلیفہ ہو کر انگور بھی نہیں خرید سکتے؟"

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے فرمایا "ہاں! میرے لیے یہ بات راحت بخش ہے، بہ نسبت اس کے کہ کل میں خیانت کی وجہ سے جہنم میں ڈالا جاؤں۔"

(تاریخ الخلفا للسیوطی جدید ص: ۲۲۵)

جبری بیعت

صبح ہی سے پورا مدینہ رنج و غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ عوام اشکبار ہیں کہ آج امام دارالہجرۃ، حضرت مالکؒ بن انس کو خلیفہ وقت، المنصور کے حکم سے کوڑے لگائے جا رہے ہیں۔

امام صاحب کا کہنا ہے کہ خلافت نفس ذکیہ کا حق ہے۔ منصور نے جبراً بیعت لی ہے اور جبر کی شرع میں کوئی جگہ نہیں۔ حدیث میں ہے کہ اگر کسی سے جبراً طلاق دلائی جائے، تو واقع نہ ہوگی۔ (مالکی فقہ میں جبری طلاق درست نہیں)

منصور کے آدمی چاہتے ہیں کہ امام فتویٰ نہ دیں، ہو سکتا ہے کہ لوگ بیعت جبری کا انکار کر دیں۔ مگر امام صاحب کے نزدیک مسئلہ ثابت تھا۔ وہ اس کے خلاف کیسے فتویٰ دیتے؟ چناں چہ خلیفہ نے حکم دیا کہ امام دارالہجرۃ کو ستر کوڑے لگائے جائیں۔

مدینہ اپنا ایک دوسرا رخ تاریخ کو یوں دکھاتا ہے کہ حضرت امام مالکؒ بن انس مدینہ کی گلیوں میں کبھی گھوڑے اور خچر پر اس لیے سوار نہیں ہوئے کہ جو زمین نبی اکرمؐ کے قدم مبارک سے مشرف ہوئی ہے، اُسے جانوروں کے سموں سے کیسے روندا جائے؟ لیکن آج اسی مبارک بدن پر کوڑے پڑ رہے ہیں۔ تمام پیٹھ خون سے لہولہان ہو گئی۔ دونوں ہاتھ کے مونڈھے اتر گئے۔ خلیفہ کا حکم ہوا ہے کہ اونٹ پر بٹھا کر ان کی تشہیر کرو۔ امام مالکؒ

مجرموں کی طرح باندھ کر مدینہ میں گھمائے جا رہے ہیں، لیکن زبان پر یہ الفاظ ہیں:

ترجمہ: جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں مالک بن انس اس بات کا فتویٰ دیتا ہوں کہ جبری بیعت کچھ بھی نہیں۔"

دنیا کے حکمران

محدث سلیمان بن داؤد فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بار عبداللہ بن مبارک سے دریافت کیا "دنیا میں صحیح اور کام کے لوگ کون ہیں؟"

عبداللہ بن مبارک نے ارشاد فرمایا: "علماء"

سلیمان بن داؤد نے پھر دریافت کیا "دنیا میں بادشاہ و امرا کون حضرات ہیں؟

عبداللہ بن مبارک نے جواب دیا "دنیا کی حکمرانی و بادشاہت زاہدوں کے پاس ہے۔"

نعیم بن حماد فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن مبارک جب بھی کتاب الرقاق کا مطالعہ کرتے، تو ان کی حالت ذبح کی ہوئی گائے کی طرح ہو جاتی۔ ان پر اس قدر گریہ وزاری طاری ہوتی کہ ہم میں سے کسی کی ہمت نہ پڑتی کہ ان کے نزدیک جائیں۔

ابن عیینہ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے صحابہ کرامؓ کی زندگی کا مطالعہ کیا، پھر عبداللہ بن مبارک کی زندگی پر غور کیا، تو مجھے ان دونوں کی زندگیوں میں سوائے اس کے کہ صحابہ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے اور آپؐ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے، کوئی فرق نظر نہ آیا (یعنی کمال مشابہت تھی، یہ اتباع صحابہ کا درجہ کمال ہے)۔ (صفۃ الصفوۃ لابن الجوزی ج ۴ ص: ۱۱۴ تا ۱۱۵)

دعاؤں سے بے نیاز

امام قطلویہ فرماتے ہیں، مجھے عباس بن وزیر نے بتایا کہ ایک روز ہم لوگ مامون الرشید کے پاس بیٹھے تھے، تو انھیں چھینک آئی۔ ہم میں سے کسی نے دعائیہ کلمات نہیں کہے۔ ہم لوگوں کے اس فعل پر خلیفہ کو اعتراض ہوا اور کہنے لگے کہ تم لوگوں نے اس سنت کو کیوں ترک کر دیا؟

میں نے جواب دیا "اے امیر المومنین! ہم لوگوں نے آپ کی تعظیم کا خیال کرتے ہوئے ایسا نہیں کیا۔"

اس پر مامون نے کہا: "میں ان بادشاہوں میں سے نہیں جو دعاؤں سے بے نیاز ہوتے ہیں۔"

(تاریخ الخلفا للسیوطی طبع جدید ص: ۳۱۴)

دلیل کی ضرورت

حضرت امام فخر الدین رازیؒ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے۔ انھوں نے تقریباً ہر موضوع پر کتاب لکھی ہے۔ ان کی تفسیر "تفسیر کبیر" خاص اہمیت کی حامل ہے۔ امام صاحب کا عہد اور سلطان شہاب الدین غوری کا زمانہ ایک ہی تھا۔ ایک مرتبہ برسر منبر وعظ کہتے ہوئے امام صاحب نے شہاب الدین غوری سے کہا:

"اے دنیا کے بادشاہ نہ تیری سلطنت باقی رہے گی اور نہ رازی کا تملق و نفاق، ہم سب کو خدا کے پاس واپس جانا ہوگا۔"

راوی کا بیان ہے کہ شہاب الدین غوری یہ سن کر دیر تک روتا رہا۔ (روضۃ الصفیہ ص: ۷۰)

امام صاحب ہی کا ایک دوسرا واقعہ ہے۔ ایک مرتبہ آپ ہرات تشریف لائے، تو وہاں ایک مرد صالح سے ملاقات ہوئی۔ اس نے آپ سے کہا: "آپ کا سرمایہ تفخر علم ہے۔ لیکن خدا کی معرفت آپ نے کیسے حاصل کی؟"

امام صاحب نے فرمایا: "سو دلیلوں سے۔"

اس مرد صالح نے کہا "دلیل کی ضرورت، تو شک زائل کرنے کے لیے ہوتی ہے، لیکن خدا نے میرے دل میں ایسی روشنی ڈال دی کہ اس کی وجہ سے میرے دل میں شک کا گزر ہی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا مجھے دلیل کی کیا ضرورت؟"

امام صاحب کے دل پر اس کلام نے بڑا اثر کیا۔ راوی کا کہنا ہے کہ یہ مرد صالح شیخ نجم الدین کبریٰ تھے۔

(مفتاح السعادۃ ج ۱ ص: ۴۵۰، ۴۵۱)

◆◆◆

رحمتوں کا خزانہ

میدان عرفات آنے والے مسلمانوں کو ملنے والا خاص تحفہ

مولانا سلیمان ندوی

حج رمی دوڑ دھوپ کا نام نہیں، یہ تو اسلامی روحانیت کی جسمانی اور مادی شکل ہے۔ حج کے ارکان ہمارے اندرونی احساسات، کیفیات اور تاثرات کے مظاہر اور تمثیلیں ہیں۔ اسی لیے سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اصلی اور صحیح حج کا نام صرف حج نہیں بلکہ "حج مبرور" رکھا، یعنی وہ حج جو سراپا نیکی ہو۔ یہی حج ان تمام برکات اور رحمتوں کا خزانہ ہے جو عرفات کے سائلوں کے لیے خاص ہے۔ حج کی روحانیت درحقیقت توبہ، انابت اور کھوئی عمر کی تلافی کے عہد اور آئندہ کے لیے اطاعت اور فرمانبرداری کے اعتراف اور اقرار کا

نام ہے۔ اس کا اشارہ خود دعائے ابراہیمی میں مذکور ہے:

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! ہم کو اپنا فرمانبردار (مسلم) بنا اور ہماری اولاد میں سے اپنا ایک فرمانبردار گروہ بنا اور ہم کو اپنے حج کے احکام اور دستور سکھا اور ہم پر رجوع ہو (یا ہم کو معاف کر) تو (بندوں کی طرف) رجوع ہونے والا (یا ان کو معاف کرنے والا) اور رحم کرنے والا ہے۔ (البقرہ۔۱۲۸)

حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا بھی ان کی دوسری دعاؤں کی طرح ضرور قبول کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ حج درحقیقت اللہ کے سامنے اس سرزمین میں حاضر ہو کر جہاں اکثر نبیوں، رسولوں اور برگزیدوں نے حاضر ہو اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا اعتراف کیا، اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد و اقرار ہے۔ ان مقامات میں کھڑے ہو کر اور چل کر اللہ کی بارگاہ میں اپنی سیہ

کاریوں سے توبہ کرنا اور اپنے روٹھے ہوئے مولا کو منانا ہے تاکہ وہ ہماری طرف پھر رجوع ہو۔ وہ تو اپنے تائب گناہ گاروں کی طرف رجوع ہونے کے لیے بروقت تیار ہے۔ رحم و کرم، لطف و عنایت کا بحر بیکراں ہے۔

یہی سبب ہے کہ شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حج اور عمرہ گناہوں کو اس طرح صاف کر دیتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے، سونے اور چاندی کے میل اور کھوٹ کو صاف کر دیتی ہے اور جو مومن اس دن (یعنی عرفہ کے دن) احرام کی حالت میں گزارتا ہے، اس کا سورج جب ڈوبتا ہے، تو اس کے گناہوں کو لے ڈوبتا ہے۔"

صحیح مسلم اور نسائی میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے بشارت دی "عرفہ کے دن سے بڑھ کر کوئی دن نہیں، جس میں اللہ اپنے بندوں کو دوزخ کے عذاب سے آزاد کرتا ہے۔ وہ اس دن اپنے بندوں سے قریب ہو کر جلوہ گر ہوتا ہے، اپنے بندوں پر فرشتوں کے سامنے فخر کرتا اور کہتا ہے کہ جو انھوں نے مانگا۔ (وہ ہم نے قبول کیا)"

موطا امام مالک میں ہے کہ آپ نے یہ خوشخبری سنائی "بدر کے دن سوا عرفہ کے دن سے زیادہ شیطان کسی دن ذلیل، رسوا اور غضب ناک نہیں ہوتا، کیونکہ اس دن وہ دیکھتا ہے کہ اللہ کی رحمت برس رہی ہے اور گناہ معاف ہو رہے ہیں۔" اسی طرح اور بہت سی حدیثیں ہیں جن میں مخلصانہ حج ادا کرنے والوں کو رحمت اور مغفرت کی نوید سنائی گئی ہے۔ یہ تمام حدیثیں درحقیقت اسی دعائے ابراہیمی:

"وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا."

(اور ہمارے حج کے دستور ہم کو بتا اور ہماری توبہ قبول فرما) کی تفسیریں ہیں۔

ان تمام بشارتوں سے یہ ثابت ہے کہ حج درحقیقت توبہ اور انابت ہے۔ اسی لیے احرام باندھنے کے ساتھ لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ، اے اللہ! میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں، کا ترانہ دم بدم اس کی زبان سے بلند ہونے لگتا ہے۔ واف میں، سعی میں، کوہ صفا پر، کوہ مروہ پر، عرفات میں، مزدلفہ میں، منیٰ میں ہر جگہ دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ ان کا بڑا حصہ توبہ اور استغفار کا ہوتا ہے کیونکہ "اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ" (گناہ سے بصدق دل توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس کا کوئی گناہ نہیں)۔ اس لیے حج مبرور والوں کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

●●●

تلوار پر لکھی تحریر

دنیا کے اہم ترین عجائب گھر، برٹش لائبریری میں رکھی ایک قدیم تلوار کی دھار پر لکھے حروف کو جاننے میں ناکامی کے بعد انتظامیہ نے عوام سے اس تلوار پر لکھے حروف کو سمجھنے میں مدد مانگی ہے۔ ۱۸۲۵ء میں لنکن شائر میں دریائے وتھم کے کنارے پائی جانے والی یہ تلوار بادشاہ جون کے عہد کی ہے اور اس کا وزن ایک کلو سے زائد جب کہ لمبائی ۳۸ انچ ہے۔ تاہم تلوار پر ایک ایسی تحریر لکھی ہوئی ہے جسے پڑھنے سے عجائب گھر انتظامیہ قاصر ہے اور اب اس نے عوام سے اس تحریر کو سمجھنے میں تعاون طلب کیا ہے۔ تلوار کی دھار پر NDXOXCHWDRGHDXORVI تحریر ہے جس کا مطلب جاننے کی سرتوڑ کوشش کی جارہی ہے۔ ایک ماہر کے مطابق تحریر کے درمیان CHWDRGHD بھی لکھا ہے جو جرمن زبان میں تلوار کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن لکھے میں چند غلطیاں ہیں۔ جب کہ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ اسے بنانے والا ان پڑھ تھا اور اس تحریر کا کوئی مطلب نہیں لیکن ایک ماہر نے ان الفاظ کے مطلب جنگ کے لیے تیار رہنا بتائے ہیں۔ اس تلوار کو خصوصی نمائش کے لیے پیش کیا گیا ہے جو یکم ستمبر تک جاری رہے گی۔

جاودانی راہیں

حج کے مبارک ایام میں پیش آنے والے
چند ایمان افروز ناقابل یقین واقعات

وقار الرحمٰن

جب میں نے ہوش سنبھالا، تو جانا کہ مجھے ایک موذی مرض لاحق ہے۔ دائیں کان کی لو کے نیچے گلے پر انگور کے دانوں کے مانند چند گلٹیاں موجود تھیں۔ ان کی وجہ سے گلے پر سوجن رہتی۔ ان سے ہلکا ہلکا مواد رستا رہتا جو جلن پیدا کرتا اور درد ہمہ وقت جان کو آیا رہتا۔ گلٹیوں کی ہیئت تبدیل ہوتی رہتی۔ بڑھنے سے درد میں اضافہ اور کم ہونے سے کمی آجاتی۔

اللہ مغفرت کرے، میرے والدین میری بیماری کی وجہ سے پریشانی کا شکار تھے۔ انھوں نے میرے علاج پر کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ بے شمار ڈاکٹرز، حکیم اور دم درود والے بابے آزمائے، مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، کے مصداق کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ایک دن ستم یہ ہوا کہ ایک نیم حکیم نے گلٹیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی خاطر ان پر تیزاب لگا دیا۔ اس نے گلے کے ساتھ میرا رخسار بھی جلا ڈالا۔

اس وحشیانہ طریق علاج سے مرض تو جوں کا توں رہا البتہ تیزاب سے آئے زخم کا نشان میرے دائیں گال پر آج بھی

موجود ہے۔

اسی مرض کے باعث میرے اسکول جانے میں تاخیر ہوئی۔ چھے برس کی عمر میں اسکول جا سکا۔ حصول علم کے زمانے میں سخت پریشانی کا سامنا رہا۔ مرض کے باعث منہ میں بار بار تھوک آنے سے کراہت محسوس ہوتی۔ دیکھنے والے بھی ناک بھوں چڑھاتے۔

کالج کا زمانہ آیا، تو پھر بھی یہ مرض میرے ساتھ رہا۔ ستائیس برس کی عمر میں شادی ہو گئی، لیکن اس نے میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ اللہ مغفرت کرے پھر ایک روز ماموں جان کے کہنے پر گلے کا آپریشن کرا ڈالا، تو گلٹیاں منہدم ہو گئیں لیکن دو ماہ بعد پھر وہی حال ہو گیا۔ اب میں نے جانا، یہ مرض جانے کا نہیں، یہ میری زندگی کے ساتھ ہی چلے گا۔

اگست ۱۹۸۱ء میں حج کی سعادت حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔ ان دنوں گلے کے درد کی نوعیت بہت شدید تھی۔ لیکن میں نے درد نظرانداز کرتے ہوئے حج کی درخواست دے دی۔ قرعہ اندازی میں نام نکلا، تو میری حالت دیدنی تھی۔ ایک طرف گلے کے درد کی شدت سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں، تو دوسری طرف خوشی کی انتہا سے آنسو چھلک رہے تھے۔

حج بیت اللہ کے لیے روانگی کی تاریخ ملی، تو میں ہومیو ڈاکٹر انور ملک کے پاس پہنچا جن کا مطب سمن آباد لاہور میں ہے۔ میں ان سے پہلے بھی گاہے بگاہے دوا لیتا تھا۔ انھوں نے مجھے پندرہ روز کے لیے دوا بنا دی جسے میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے بیگ میں سنبھال لیا۔

الحمدللہ ۲۷ اگست کو مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہوا۔ اللہ کے گھر پہنچ کر ایمان افروز لمحات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا اور میں ان مبارک شب و روز کی جاودانی ساعتوں میں کھو گیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس سرزمین پر چالیس روزہ قیام میں ایک بار بھی گلے کے درد نے تکلیف نہ دی اور نہ خود یاد آیا کہ مجھے کوئی مرض ہے۔

حج بیت اللہ کی مبارک سعادت حاصل کرنے کے بعد ۴ اکتوبر کی شب وطن واپس لوٹا، تو غیر ارادی طور پر اپنا دایاں ہاتھ گردن پر رکھا۔ اس جگہ ہاتھ رکھنا میری سرشت میں شامل ہو چکا تھا۔ بے ساختہ میری زباں سے ''اللہ اکبر'' کے الفاظ بلند ہونے اور خوشی سے آنسو بہنے لگے کہ میرے گلے پر گلٹیوں کا نام و نشاں نہ تھا۔ میں اپنا ہاتھ گلے کی ہموار جلد پر بار بار پھیرتا اور روتا رہا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اس جان لیوا مرض سے نجات حاصل کر چکا۔ لیکن معجزہ رونما ہو چکا تھا۔

آب زم زم میں شفا ہے

حقیقت روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ آب زم زم میں شفا ہے۔ یاد آیا، رکن یمانی کی سمت سیڑھیاں اتر کر قطار میں نل لگے تھے۔ ان میں آب زمزم اترتا تھا۔ میرا معمول تھا، وہاں غسل کر کے نماز ظہر ادا کرتا اور بیت اللہ کے طواف کے بعد خوب سیر ہو کر آب زمزم پیتا، پھر صدق دل سے یہ مسنون دعا مانگتا:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ عِلْمًا نَافِعًا وَّرِزْقًا وَّاسِعًا وَّشِفَاءً مِّنْ کُلِّ دَاءٍ۔

ترجمہ: اے اللہ، میں تجھ سے سوال کرتا ہوں، علم نافع کا، رزق

واسع کا اور ہر بیماری سے شفا کا۔

گھر پہنچ کر جب بیگ کھولا، تو پورے پندرہ روز کی دوا موجود تھی۔ اس میں سے ایک خوراک بھی نہیں لی گئی تھی۔ حج کی سعادت بابرکات حاصل کیے چونتیس برس بیت چکے۔ الحمدللہ صحت یاب ہوں۔

اللہ محفوظ رکھے، وہ مرض مجھے دوبارہ لاحق نہیں ہوا۔ یاد رہے، مجھے اس مرض سے شفا چالیس برس بعد ملی

☆☆

ایک روز اللہ کے گھر کا طواف کر رہا تھا کہ ایک کاغذ میرے پاؤں سے ٹکرایا۔ میں نے جھک کر اسے اس خیال سے اٹھا لیا کہ کہیں اس پر قرآنی آیات مبارکہ نہ لکھی ہوں۔ پاؤں کے نیچے آ جانے سے ان کی بے حرمتی ہو جاتی۔

طواف کی تکمیل کے بعد باہر آئے۔ میں ایک طرف بیٹھ کر اطمینان سے کاغذ کھولا۔ دیکھا کہ اس کی تحریر نسوانی ہے۔ اس میں کچھ دعائیں پڑھنے کی استدعا درج تھی۔ میں نے اسے تہ کر جیب میں رکھ لیا کہ شام کو خالہ جان کو دے دوں گا تاکہ خط لکھنے والے کے لیے دعا کر سکیں۔ اللہ مغفرت فرمائے، میری خالہ میرے ہمراہ حج کی سعادت حاصل کرنے آئی تھیں۔

حج کے اولین ایام میں ہم نے ہوٹل میں قیام نہیں کیا بلکہ مکہ مکرمہ میں اپنے قریبی عزیزوں کے ہاں ٹھہرے۔ برخوردار عادل، جو میرا ہم عمر تھا، روزانہ ہمیں نماز ظہر سے پہلے اپنی گاڑی پر باب عبدالعزیز کی سیڑھیوں پر اتار دیتا۔ جب ہم نماز عشا کی ادائیگی کے بعد سیڑھیاں اتر رہے ہوتے، اس کی گاڑی کو سامنے موجود پاتے۔

عادل کی پابندی وقت کے ساتھ یہ ڈیوٹی اس وقت تک جاری رہی جب ہم کسی ہوٹل میں منتقل ہو گئے۔ لیکن یہ ماہ ستمبر ۱۹۸۱ء کے دنوں کی بات ہے۔ اب تو ان سیڑھیوں تک گاڑی کی رسائی مشکل ہے۔

رات کو کھانے کے بعد جب بستر پر دراز ہونے لگا تو وہ کاغذ خالہ کی طرف بڑھا کر کہا "یہ کاغذ مجھے دوران طواف مطاف کی جگہ گرا ملا ہے۔ اسے رکھ لیجیے۔ اس میں کسی نے دعائیں مانگنے کی درخواست کی ہے۔ جب آپ کل بیت اللہ جائیں، تو ان کے حق میں دعا کر دیجیے گا۔"

خالہ نے وہ بند کاغذ میرے ہاتھ سے لے کر کھولا لیکن دوسرے ہی لمحے تہ کر اپنے پرس میں سنبھال لیا۔

میں نے تجسس سے پوچھا "خالہ جان! آپ نے اسے پڑھے بغیر ہی رکھ لیا؟"

"وقار صاحب (وہ مجھے پیار سے میرا نام لے کر پکارتی تھیں) یہ میرا ہی کاغذ ہے جو آج طواف کے دوران گر گیا تھا۔" انھوں نے میری طرف بغور دیکھتے ہوئے مسکرا کر راز کی بات بتائی۔

"کیا واقعی؟" میں حیرت سے بول اٹھا۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ممکن ہے؟ میں پھر اس ناقابل یقین واقعے کے بارے میں سوچنے اور اللہ سے باتیں کرنے لگا: اے اللہ تو بے نیاز ہے۔ تیری حکمت کو کون پہنچ سکتا ہے۔ یہ کاغذ جس کی امانت تھی، اسے لوٹانا مقصود تھا۔ وہ تو نے میری وساطت سے لوٹا دیا۔ تو رب کریم ہے، جو چاہے کر سکتا ہے، جو چاہے کرتا ہے۔

مطاف کی جگہ سیکڑوں نہیں، ہزاروں نہیں لاکھوں افراد کا گزر ہوتا ہے۔ تیری نظر التفات مجھ پر ہی کیوں پڑی؟ میں تیرے انتخاب پر حیران ہوں، لیکن خوش بھی۔ سوچوں، تو اس بندہ ناچیز کی حقیقت ہی کیا ہے؟ میرے اللہ میں تیرا کیسے شکر ادا کروں۔

وفور جذبات سے آنسو چھلکنے لگے، چہرہ تر بتر ہو گیا۔

خالہ میرے قریب تھیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ میں رو رہا ہوں۔ بولیں "وقار صاحب آپ رو رہے ہیں؟"

"نہیں تو" میں نے انگلی کی پور سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور ان کی جانب مسکرا کر دیکھنے لگا۔

جب میری سوچ کا دائرہ وسیع ہوا، تو خالہ جان کی شخصیت

پر رشک آنے لگا کہ اس واقعہ کا اصل تو وہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات نے گوارا نہ کیا کہ ان کی تحریر کسی غیر کے ہاتھ لگے۔ سبحان اللہ! اب میرے دل میں ان کا تقدس اور بھی بڑھ گیا۔ وہ بہت نیک خاتون تھیں۔ اللہ انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

☆☆

یہ ۹ ستمبر ۱۹۸۱ء کا جاں فزا دن تھا۔ نماز عصر ادا کرنے کے بعد بیت اللہ کا طواف کیا۔ آب زم زم پیا اور مقام ابراہیم پر نوافل ادا کیے پھر اطمینان سے وہیں بیٹھ گیا۔
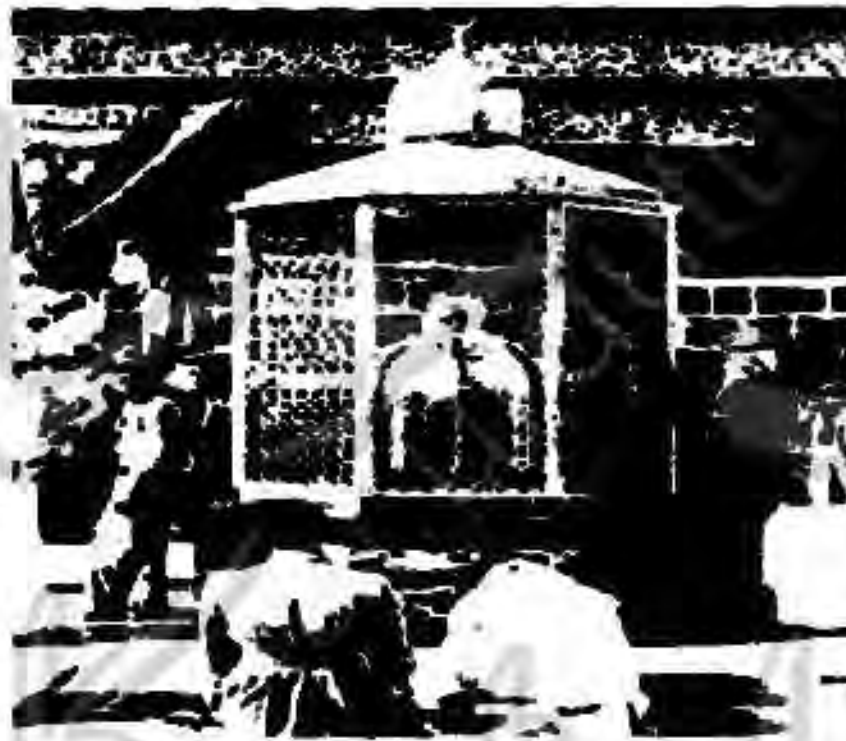
اللہ کا گھر میرے سامنے تھا جسے دیکھنے کی حسرت مدت سے میرے دل میں جاگزیں تھی۔ پیاسی آنکھوں سے بیت اللہ کا حسن دل میں سمونے لگا۔ آنکھوں میں اترتے شبنمی قطروں کی جھلملاہٹ اس کا حسن لازوال دوچند کر رہی تھی۔ میں نازاں تھا کہ اللہ نے مجھے اپنے گھر بلایا۔ میں اس کا مہمان تھا اور وہ میرا میزبان۔

خانہ کعبہ کے احاطے میں واقع مقام ابراہیم

وجدانی کیفیت طاری تھی کہ معاً ایک نوجوان میرے دائیں پہلو کی طرف سے گزر کر میرے سامنے آرکا۔ میں نے ایک نظر اس کی جانب دیکھا، وہ عربی لباس میں ملبوس خوبرو نوجوان تھا۔ اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔

میں نے سوچا، اس شخص سے تو میری کوئی شناسائی نہیں پھر بھلا یہ مجھے کیوں بلا رہا ہے؟ میں وہیں بیٹھا رہا۔ جب میں اپنی جگہ سے نہ ہلا، تو وہ قدرے توقف سے مڑا اور بیت اللہ کی سمت چل دیا۔

میں اسے جاتے دیکھ رہا تھا کہ اچانک وہ چند قدم چلنے کے بعد رکا، پھر پلٹ کر میری طرف دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے دوبارہ اپنی طرف بلایا۔ لیکن میں ساکت بیٹھا متجسس نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ میری نظریں اس پر جم کر رہ گئی تھیں۔

میرے نہ اٹھنے پر وہ بیت اللہ کے دروازے کی دہلیز کے قریب جا پہنچا تھا۔ وہ پھر رکا اور پلٹ کر مجھے تیسری بار بلایا۔ لیکن.... میں اس وقت بھی نہ اٹھا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

حج کے ایام گزرے، چونتیس برس بیت چکے۔ جب بھی خیال آتا ہے، یہ بات بے کل کیے دیتی ہے کہ میں اس واقعے کے اسرار کو آج بھی سمجھ نہیں پایا۔

وہ شخص کون تھا؟ وہ مجھے کیوں بلا رہا تھا؟ اور پھر نامعلوم، میرے اٹھنے میں کون سی چیز مانع تھی جو اس کے تین بار بلانے پر بھی میں اس کے پاس نہ جا سکا۔ یہ عقدہ کبھی نہ کھلے گا۔ یہ بات سربستہ راز ہی رہے گی۔

☆☆

ایک تمنا تھی کہ جن راہوں سے حضور رسالت مآب گزرے ہیں، ان راہوں پر میں بھی قدم قدم چل سکوں۔ اسی لیے اس روز ان راہوں پر چل کر غار حرا کی زیارت میری منزل تھی۔ پھر غار حرا، تو وہ ایوان الٰہی ہے جہاں حضورؐ کے سر پر تاج نبوت رکھا گیا۔

میں نے ایک ٹیکسی والے سے بات کی کہ وہ مجھے حرم سے چار پانچ کلومیٹر دور واقع جبل نور کے دامن میں لے چلے۔ ٹیکسی حرم پاک سے روانہ ہوئی۔ پُر رونق بازاروں سے ہوتی، مشرقی سمت بڑی سڑک پر آگئی۔ مکہ سے طائف کو جانے والی سڑک پر شہر سے تھوڑی دور آئے تھے کہ ڈرائیور نے ایک پہاڑ کے قریب ٹیکسی بائیں جانب موڑ لی۔ تقریباً دو سو میٹر چلنے کے بعد اس نے

مجھے دامن کوہ میں اتار دیا۔

میں نے وقت دیکھا، صبح کے دس بجے تھے۔ مشتاق نگاہیں جبل نور کو دیکھنے لگیں۔ پہاڑ کو مختلف زاویوں سے دیکھتے، میری نظر چوٹی پر جا ٹھہری۔ مجھے لگا جیسے کسی شخص نے سر پر بڑی سی دستار باندھ رکھی ہو۔ دل نے گواہی دی، بے شک اللہ تعالیٰ نے نبی آخرالزماں کو امام الانبیا بنایا۔ دستار وجاہت، حشمت اور شان و شوکت کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ جبل نور کی چوٹی بغور دیکھنے سے کچھ ایسی ہی کیفیت بنتی تھی۔ سبحان اللہ۔

رستے کے آغاز میں کچھ دور تک سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ جبل نور تین سمتوں سے تقریباً عمودی زاویے پر اوپر جاتا ہے۔ اسی لیے اسی طرف سے اس پر جانے کا راستہ بنتا ہے اور یہ راستہ اُسی طرف ہی تھا۔ غالب امکان ہے کہ حضورؐ بھی اسی راستے سے اوپر جاتے ہوں گے۔

اس تصور کے ساتھ جب میں نے پہلے زینے پر قدم رکھا، تو ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ ہوا کا ایک لطیف جھونکا مجھے چھو کر گزر گیا۔ پھر جوں جوں قدم آگے بڑھتے گئے، عجز و انکسار سے سر جھکتا گیا۔ روح ان دیکھے خوش رنگ پھولوں کی انجانی خوشبو سے مہک اٹھی۔

میں ان بیش قیمت لمحات کو جاوداں بنانے کی کوشش میں آہستہ روی سے چل رہا تھا کہ ایک نوجوان تیزی سے میرے دائیں جانب سے آگے نکلا۔ اس کے بائیں شانے پر پانی کی بوتل جھول رہی تھی۔

سیڑھیاں ختم ہونے پر ایک ہموار جگہ آگئی۔ اب پتھروں پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کرکے اوپر چڑھنا تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر جب اس جگہ پہنچا، تو دیکھا وہ نوجوان زمین پر عجب انداز میں ہاتھ پاؤں پھیلائے بے سدھ پڑا تھا۔ میرے قریب پہنچنے پر کچھ اور لوگ بھی اس کی مدد کو آپہنچے۔

اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دینے سے وہ جلد ہوش میں آگیا۔ ہمارے استفسار پر اس نے بتایا کہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اسے پیاس محسوس ہوئی۔ اس نے پانی کا ایک ہی گھونٹ لیا تھا کہ دل ڈوبنے لگا اور پھر چکرا کر زمین پر گر گیا۔

نوجوان کی حالت سنبھل گئی، تو میں اوپر چڑھنے لگا۔ پتھروں کا سہارا لے کر (جن کی حدت ہاتھوں کو گرمانے لگی تھی) تقریباً نصف گھنٹے کی مشکل مسافت کے بعد جبل نور کی چوٹی پر پہنچا، تو وہاں تین چار نحیف و نزار دبلے پتلے معمر اشخاص کو موجود پا کر حیرت ہوئی کہ یہ لوگ اتنی بلندی پر کیسے پہنچ گئے؟ جب کہ میں ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے ایک نوجوان کو بے ہوشی کی حالت میں دیکھ کر آرہا تھا۔

میں والہانہ ایک شخص کی طرف بڑھا اور اسے گلے لگاتے ہوئے پوچھا "آپ کو کون سی طاقت یہاں لے آئی؟"

اس نے مسکرا کر اپنائیت سے جواب دیا۔ "ہمیں اللہ تعالیٰ کے رسولؐ کی محبت یہاں کھینچ لائی۔"

پھر اس نے مجھے بتایا کہ غار حرا پہاڑ کی چوٹی پر نہیں، وہاں تک جانے کے لیے آپ کو نیچے اترنا ہوگا۔ اس نے پھر ایک جانب اشارہ کرتے میری راہنمائی کی۔

میں نے شکریہ ادا کیا اور انھیں رشک سے دیکھتے، ان کی بتائی سمت کی طرف بڑھ گیا۔ تقریباً ساٹھ ستر میٹر نیچے مغرب کی سمت اتر، پھر بمشکل دائیں جانب سرک کر غار حرا کو سامنے پایا۔ اللہ تعالیٰ کے رسولؐ کی خلوت نشینی کی جائے سامنے پا کر وارد ہونے والی کیفیت الفاظ میں بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ غار میں نوافل ادا کرنے کو کھڑا ہوا، تو ناہموار پتھروں کی وجہ سے سیدھا کھڑا ہونے میں دشواری پیش آئی۔

دوزانوں بیٹھنے پر بھی یہی کیفیت تھی کہ محترمہ والدہ صاحبہ کی بات یاد آئی۔ اللہ مغفرت کرے، انھوں نے مجھے بتایا تھا "بیٹا! التحیات میں بیٹھتے وقت بائیں جانب غار کی دیوار کا سہارا لے کر بیٹھو گے، تو اطمینان نصیب ہوگا۔"

چناں چہ ان کی نصیحت پر عمل پیرا ہو کر اطمینان قلب کے ساتھ روحانی تسکین ملی۔ یہاں بے شمار قابل ذکر باتوں میں سے

ایک بات کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ غارحرا میں قیام کا رخ نہیں بیت اللہ کی سمت تو ہے۔

غار حرا سے واپسی کا سفر اور بھی پُرخطر لگا۔ پتھروں کے سہارے نشیب میں اترنا کٹھن مرحلہ تھا۔ پھر اترتے وقت پاؤں محتاط انداز میں رکھنے پڑے کہ خدانخواستہ اگر پھسل گیا، تو نیچے لڑھکنے کا خطرہ موجود تھا۔ اس لیے سنبھل سنبھل کر نیچے اترنا پڑا۔ قدم قدم پر اللہ اور رسولؐ یاد آتے رہے۔

بار بار یہ سوچ دامن گیر رہی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی جگہ کو جو الگ تھلگ بے آب و گیاہ ویران پہاڑی چوٹی پر ہے اور جس کا رستہ بھی انتہائی پُرخطر اور دشوار گزار ہے، اپنے حبیبؐ کے لیے چنا۔ اس امر کی حکمت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

اگر اس جگہ رسولؐ نے قیام نہ فرمایا ہوتا، تو شاید وہاں کوئی شخص بھی نہیں جاتا۔ حقیقتاً نبی کریمؐ کی غارحرا میں آمد سے قبل شاید ہی کوئی بندہ خدا اس جگہ گیا ہوگا۔

جبل نور سے اتر کر دامن کوہ میں قدم رکھا، تو سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اس کی تمازت بڑھ رہی تھی۔ پیاس سے ہونٹ خشک ہونے لگے۔ نظریں اطراف میں پانی کی متلاشی تھیں کہ تین افراد پاس سے گزرے، جن کا رخ جبل نور کی جانب تھا۔ جونہی انھوں نے ابتدائی سیڑھی پر قدم رکھا، میں نے جانا کہ یہ لوگ غار حرا جانا چاہتے ہیں۔ ان کی وضع قطع پٹھانوں جیسی تھی۔ میں نے انھیں آواز دی "خاں صاحب، رک جائیں۔"

ایک شخص نے رکتے ہوئے پلٹ کر میری جانب دیکھا اور پوچھا "کیا بات ہے بابو؟"

میں نے کہا "خاں صاحب، اس وقت سورج نصف النہار پر ہے۔ گرمی کی شدت میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ پھر راستہ بھی سیدھا اور صاف نہیں۔ بلندی پر آپ پتھروں کے سہارے کے بغیر نہ جا سکیں گے اور پتھر اس وقت جل رہے ہیں۔"

"تو پھر ہم کیا کریں؟" وہ غصے سے بولا۔

"آپ اس وقت پہاڑ پر نہ جائیے، کسی اور روز صبح کے وقت جائیں۔"

اس نے اپنی مرضی کے خلاف رائے پا کر ناگوار آنکھوں سے میری جانب دیکھا اور کچھ کہے بغیر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اسی اثنا میں اس کے دوسرے ساتھی کافی دور نکل گئے تھے۔

میں نے محسوس کیا، مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوئی۔ مجھے ان لوگوں کو منع نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میرے منع کرنے پر شاید ان کے دل کو ٹھیس پہنچی تھی۔ جذبات مجروح ہوئے تھے۔ حالانکہ میں نے تو انھیں نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ صائب مشورہ دیا تھا۔

جبل نور جس میں غار حرا واقع ہے

بہرکیف غلطی کا احساس ہونے پر میں نے انھیں با آواز بلند پکارا "خان صاحب، مجھ سے غلطی ہو گئی، مجھے اللہ کے واسطے معاف کر دیں۔"

میری آواز سن کر وہ شخص کچھ دیر رکا، پلٹ کر میری جانب دیکھا، پھر قدرے توقف کے بعد سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

میرے کان اس کی خوش آئند آواز سننے کے پیاسے تھے، جو پیاسے ہی رہے۔ اس کی جانب سے کسی ردعمل کا اظہار نہ ہونے پر میں آزردہ ہو گیا۔ میں بے بسی سے انھیں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے میری نظروں سے

اوجل ہوگئے۔

میں نے محسوس کیا، جیسے منوں بوجھ تلے دب گیا ہوں۔ آہستہ سے ایک پتھر کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا، ابھی حج کے ایام آنے کو ہیں اور میں نے پہلے ہی لوگوں کو ناراض کر دیا۔ اس وقت ساڑھے بارہ بجے تھے۔ ظہر کی نماز کا وقت ہو چلا تھا۔

بجھے دل اور بوجھل قدموں کے ساتھ حرم شریف کا قصد کیا۔ حرم شریف میں نماز ظہر ادا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے التجا کی:

"میرے اللہ، تو میرے دل کی کیفیت جانتا ہے۔ مجھ سے خطا ہو گئی۔ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ مجھے معاف کر دیجیے اور ان ناراض لوگوں سے جلد ملا دیجیے تاکہ میں ان سے معافی مانگ سکوں۔ مجھے امید ہے وہ مجھے معاف کر دیں گے۔"

بظاہر وہ تین افراد تھے۔ لیکن میری بات صرف ایک شخص سے ہوئی تھی، اس لیے میرے سامنے صرف اسی کا چہرہ تھا۔ اسے میں پہچان سکتا تھا۔ میری نگاہیں اس چہرے کی متلاشی تھیں۔ اب میری نظر ہر آنے جانے والے پر تھی۔ میں ہر چہرے میں اسی شخص کا چہرہ تلاش کر رہا تھا۔

دوسرا روز آ گیا۔ میں نماز عصر کے انتظار میں برآمدے میں بیٹھا تھا۔ دل میں یہ آرزو تھی کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان لوگوں سے ملا دے تاکہ ان سے مل کر دل تشفی پا سکے۔

انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک میری نظر بائیں جانب برابر میں بیٹھے شخص پر پڑی۔ وہ مشہور اداکار ساقی تھے۔ میں نے انھیں پہلی نظر ہی میں پہچان لیا۔ میں نے سلام کہتے ہوئے گرم جوشی سے دایاں ہاتھ ان کی طرف بڑھایا۔ انھوں نے مسکرا کر میرا ہاتھ تھام لیا اور معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے جاننا چاہا کہ میں کس ملک سے آیا ہوں۔

جب میں نے پاکستان کا نام لیا، تو ان کا چہرہ کھل اٹھا۔ مزید جب یہ بتایا کہ آپ میرے پسندیدہ اداکار ہیں، تو وہ خوشی سے سرشار نظر آئے۔

چونکہ ہم بیت اللہ کے سامنے بیٹھے تھے، اس لیے فلموں کے حوالے سے بات چیت کم رہی۔ میرے استفسار پر ساقی (عبداللطیف بلوچ) نے مجھے بتایا کہ جب میں نے انگریزی فلم "The Message" (دی میسج) دیکھی، تو مجھے حج بیت اللہ کا خیال آیا۔ اور الحمدللہ، آج ہم بیت اللہ کے سامنے بیٹھے ہیں۔ میں سوچنے لگا، ایک اداکار کو ایک فلم نے اس مقدس سرزمین کی زیارت پر مائل کر دیا۔

اللہ مغفرت کرے، حج کی سعادت حاصل کرنے کے پانچ سال بعد ۲۲ دسمبر ۱۹۸۶ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ یاد رہے کہ اسی سال اداکار مصطفیٰ قریشی اور مرحوم سلطان راہی بھی حج بیت اللہ کو گئے تھے۔

میں ہر نماز کے بعد اللہ سے التجا کر رہا تھا کہ اے اللہ تو مجھے ان لوگوں سے ملا دے جو مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ میری متجسس نگاہیں ہمہ وقت ان کی تلاش میں رہیں۔ میرا انتظار تیسرے روز میں داخل ہو چکا تھا۔

۷ ستمبر ۱۹۸۱ء کا خوش گوار دن تھا۔ میں حرم شریف میں نماز عصر کے بعد رکن یمانی کی جانب بیٹھا تھکی تھکی لیکن پُرامید نظروں سے اطراف میں دیکھ رہا تھا۔

معاً وقت معلوم کرنے کو میں اپنے دائیں ہاتھ بیٹھے ایک شخص سے مخاطب ہوا "برادر کیا وقت ہوا ہے؟"

"چار بجے ہیں بابو جی" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

اس کی مانوس آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔

میں نے اس شخص سے پوچھا، خان صاحب، ایک بات تو بتائیے "کیا آپ دو روز پہلے غار حرا پر گئے تھے؟"

"ہاں بابو، ہم گیا تھا۔"

یہ جواب سنتے ہی میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ میرے ہاتھ تھمنے پر وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے تجسس پر میں نے بتایا کہ میں وہی ہوں، جس نے آپ کو

غارحرا پر جانے سے روکا تھا۔ اس پر آپ مجھ سے خفا ہو گئے تھے حالانکہ میں نے اپنی غلطی پر آپ سے معافی بھی مانگ لی تھی۔ لیکن آپ نے مجھے معاف نہیں کیا۔"

"نہیں نہیں، بابو صاحب، ہم نے تو آپ کو اسی وقت معاف کر دیا تھا۔" وہ مسکرا کر متشکر انداز میں بولا۔

"لیکن میں نے تو آپ کی آواز نہیں سنی۔ خیر، اب بات یہ ہے خاں صاحب کہ بیت اللہ ہمارے سامنے ہے۔ آپ میری تسکین کے لیے یہاں کہیں کہ میں نے آپ کو معاف کر دیا۔"

وہ خوش دلی سے بولا "اچھا بابو، آپ ضد کرتے ہیں، تو ہم کہہ دیتے ہیں، ہم نے آپ کو معاف کیا۔"

جونہی یہ کلمات خاں صاحب کی زباں سے ادا ہوئے، میری تشکر آمیز نگاہیں آسمان کی جانب اٹھ گئیں۔ ابابیلوں کا ایک جھنڈ اپنی مخصوص ننھی ننھی چہکار کے ساتھ میرے سر کے اوپر سے گزر گیا۔

☆☆

یہ ۱۰ ستمبر ۱۹۸۱ء کا روشن دن تھا۔ نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد میں بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا۔ دوسرا یا تیسرا چکر تھا۔ آسماں سے برستی اللہ کی بے پایاں رحمت کے پرتو میں، عجز و انکسار سے اٹھتے قدم سبک روی سے رواں دواں تھے۔ زباں ذکرِ الٰہی سے تر تھی، روح انجانی خوشی سے سرشار تھی۔

معاً مجھے احساس ہوا کہ کوئی میرا دایاں بازو چھو کر خفیف سے ٹھوکے کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہے۔

"السلام علیکم۔"

یہ آواز دوسری اور پھر تیسری بار سماعت سے ٹکرائی، تو میں نے دائیں جانب گردن کو تھوڑا خم دے کر، اس چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اپنی نظروں کو سامنے جہت پر مرکوز کر دیا۔

میں وہ چہرہ پہچان چکا تھا۔ لیکن اس لمحے ان سے ملنا غیر مناسب لگا۔ رب کعبہ سے ناتا توڑ کر کسی غیر سے جوڑ لینا مجھے گوارا نہ تھا۔ میں نے یکسوئی سے اپنا طواف جاری رکھا۔ البتہ ایک خیال ضرور گزرا کہ ہزاروں افراد کے اس ہجوم میں بچھڑنے کے بعد، ہم مل بھی پائیں گے یا نہیں؟ اس کا جواب میں نے اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا۔

تکمیل طواف کے بعد مقام ابراہیم پر نوافل ادا کیے اور اطمینان سے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے:

غارِ حرا کا اندرونی منظر

"اے اللہ، طواف کے دوران رشید اختر مجھ سے ملنا چاہ رہے تھے۔ لیکن میں ان سے نہ ملا۔ میں ان سے نہ ملنے کی وجہ کیا عرض کروں، کوئی بات آپ سے پوشیدہ نہیں۔ ہر بات آپ کے دائرہ علم میں ہے۔ آپ تو سینوں میں مستور بھید تک جانتے ہیں۔ انھوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ لیکن میری خواہش تو ان سے کہیں سوا تھی۔ میرے اللہ، آپ سے میری التجا ہے، اختر صاحب سے ملاقات نصیب ہو جائے۔"

دعا کے بعد جونہی نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا، تو حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ میری دعا حقیقت کا روپ دھار چکی تھی۔ رشید اختر، میرے سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ اچانک انھیں سامنے پا کر میرا چہرہ کھل اٹھا۔ میں والہانہ ان کی جانب بڑھا۔ بغل گیر ہو کر نم آلود آنکھوں سے، ان سے معذرت چاہی اور وہ کیفیت بیان کی، جس کی بنا پر میں ان سے مل نہ پایا تھا۔

ان سے ملنے کے بعد یہ سوچتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اگر ہم باہم مل نہ پاتے تو پھر ہم ایک دوسرے کے بارے میں کیا سوچتے؟ میں حرم شریف میں ان سے ہونے والی ملاقات کبھی بھول نہ پاؤں گا!

رشید اختر میرے بڑے بھائی، محمد سعید احمد (مرحوم) کے دیرینہ دوستوں میں سے تھے۔ اسی نسبت سے میری ان سے شناسائی تھی۔ ان دنوں وہ دمام میں مقیم اور حج کی سعادت حاصل کرنے آئے تھے۔

اس شب حرم شریف میں شب بسری کا ارادہ تھا۔ نصف شب بیت چکی تھی۔ میں حجر اسود کی سمت، مطاف سے قدرے ہٹ کر بیٹھا تھا۔ آسماں پر ستارے جھلملا رہے تھے۔ بیت المعمور سے انوار الٰہی برس رہا تھا۔ رنگ و نور کی برسات میں بیت اللہ کا جاہ وجلال دیدنی تھا۔ برآمدوں کی جانب سے بیت اللہ کی سمت کھلتے، دروازوں کے رستے سے زائرین کی آمد ہو رہی تھی۔

احرام میں ملبوس زائرین جب حرم میں داخل ہوتے، تو لبیک اللھم لبیک "(حاضر ہوں اے اللہ، میں حاضر ہوں) کی صدائیں بلند ہوتیں۔ شب کی گہری خاموشی میں یہ صدائیں دل کی گہرائی میں اترتی جا رہی تھیں۔ شب کے اندھیرے میں سیاہ رنگ غلاف کعبہ اور سفید رنگ احرام کا امتزاج بڑا بھلا دکھائی دیتا تھا۔ اس منظر کو چشم بینا تو اپنی وسعتوں میں سمو سکتی تھی لیکن الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

میں اس روح پرور منظر کے حسن میں کھویا ہوا تھا۔ اچانک میرے بائیں ہاتھ بیٹھے ایک سیاہ فام نے میرا دایاں ہاتھ تھام کر، میری انگشت شہادت کو اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کے ڈائل پر رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا It's Nigerian Time (یہ نائجیریا کا وقت ہے۔)

میں نے حیرت واستعجاب سے ایک نظر اس شخص کی جانب دیکھا۔ سیاہ رنگت کے باوجود اس کے خدوخال پرکشش اور جاذب نظر تھے۔ چہرے پر مسکراہٹ کے سبب شفاف دانت موتیوں کے مانند چمک رہے تھے۔ میں نے اس کی مسکراہٹ اور بے ساختہ پن دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "یار رفیق آپ نائجیریا سے ہیں، تو میں پاکستان سے آیا ہوں۔" اس بات پر ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے اور پھر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں باتیں کرنے لگے۔

وہ شخص مجھ سے بات کرنے کا خواہاں تھا۔ اس نے مجھ سے بات کرنے کا ایسا انداز اپنایا کہ ایک ہی جملے نے ہمیں ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ جب بھی مجھے حرم شریف میں گزری شب بسری کی ساعتیں یاد آتی ہیں، تو اس اجنبی شخص کے اپنائیت سے کہے گئے It's Nigerian Time کے الفاظ یاد آنے پر بے ساختہ لبوں پر مسکراہٹ پھیلنے لگتی ہے۔

◆◆◆

۳۳ اور ۴۴ کلوگرام وزنی بہنیں

بھارت میں پانچ سالہ یوگیتا اور تین سالہ اجا موٹاپے اور کمزور اعصاب کی وجہ سے چلنے کے قابل نہیں تھی لیکن ڈاکٹروں کے مشوروں کے بعد چند پونڈ وزن کم کرنے کے بعد اب وہ پہلی مرتبہ چلنے کے قابل ہوگئی ہیں۔ تین ماہ قبل ایک بہن کا وزن ۳۳ کلو اور دوسری کا ۴۴ کلو تھا لیکن اب دونوں نے لگ بھگ چھ کلو وزن کم کیا ہے اور پہلی مرتبہ انھوں نے قدم اٹھایا ہے۔ دونوں بہنیں ایک جینیاتی مرض، پریڈر ولی سنڈروم کی شکار ہیں جس میں بھوک نہیں مٹتی۔ ایک بہن روزانہ درجنوں چپاتیاں، ایک لیٹر دودھ، چھ کیلے اور بسکٹ کے کئی پیکٹ کھا پی کر بھی بھوکی رہتی ہے۔ بچیوں کے مہنگے علاج کی وجہ سے ان کے والد کو اپنا ایک گردہ فروخت کرنا پڑا کیونکہ اس کی آمدن تین ہزار بھارتی روپے سے بھی کم ہے اور اس کا بڑا حصہ بچوں کی بھوک مٹانے پر خرچ ہو جاتا ہے۔

میت کی طرف سے قربانی

تین اہم سوالات اور ان کے شرعی جوابات

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

کچھ عرصہ قبل ایک صاحب کا خط موصول ہوا۔ لکھا تھا: قربانی کے سلسلے میں بسا اوقات طرح طرح کی باتیں سننے کو ملتی ہیں، جن کی بنا پر ذہن الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔ براہ کرم شریعت کی روشنی میں راہنمائی فرمایئے۔

۱۔ کیا کسی مرحوم شخص کی طرف سے قربانی کی جا سکتی ہے؟ بعض حضرات اس پر تنقید کرتے اور کہتے ہیں کہ کسی میت کے نام سے قربانی جائز نہیں۔

۲۔ بعض حضرات اپنے علاوہ بیوی بچوں، ماں باپ اور دیگر اعزہ کی طرف سے بھی قربانی کرتے ہیں۔ اس کے لیے وہ کئی چھوٹے جانور ذبح کرتے یا بڑے جانوروں میں حصے لیتے ہیں۔ بیوی اگر صاحب نصاب ہو، تو کیا اس کا الگ سے قربانی کرنا ضروری ہے؟

۳۔ بعض حضرات سے یہ بھی سننے کو ملا کہ جانور کو خصی کرانا اس میں عیب پیدا کرتا ہے۔ حدیث میں عیب دار جانور کی قربانی سے منع کیا گیا ہے۔ لہٰذا کیا خصی کیے گئے جانور کی قربانی جائز ہے؟

میں نے ان کے دریافت کیے گئے سوالات کے جوابات کچھ اس طرح دیے:

۱۔ میت کی طرف سے قربانی کرنا جائز ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ نے ایک مرتبہ دو مینڈھوں کی قربانی فرمائی۔ ایک اپنی طرف اور دوسری اپنی امت کے ان لوگوں کی طرف سے جو اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے قربانی نہ کر سکیں۔ اس حدیث کو ابو یعلیٰ اور بیہقی نے روایت کیا ہے اور ہیثمی نے اسے حسن قرار دیا۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ بن ابی طالب نے ایک مرتبہ دو مینڈھوں کی قربانی کی۔ ان کے شاگرد حنش نے دریافت

کیا کہ یہ دوسرا کس کی طرف سے ہے؟ فرمایا: "یہ رسول اللہؐ کی طرف سے ہے۔ آپؐ نے مجھے ایسا کرنے کو کہا تھا، اس لیے میں برابر ایسا ہی کرتا ہوں۔" (ابوداؤد: ۲۷۹۰، ترمذی: ۱۴۹۵)

امام ترمذی نے اس روایت کو 'غریب' کہا ہے۔ علامہ البانی نے ابوداؤد اور ترمذی دونوں کی روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔ امام ترمذی نے لکھا ہے کہ بعض اہل علم میت کی طرف سے قربانی کی اجازت دیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کہتے ہیں: میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ میت کی طرف سے قربانی نہ کی جائے، بلکہ اس کی طرف سے صدقہ کر دیا جائے۔ اگر قربانی کی جائے، تو کرنے والا اس کا کچھ بھی گوشت نہ کھائے، بلکہ سب صدقہ کر دے۔ (ترمذی، ابواب الاضاحی، باب ماجاء فی الأضحية عن الميت)

فقہا میں سے احناف اور حنابلہ میت کی طرف سے قربانی کرنے کو مطلق اور مالکیہ کراہت کے ساتھ جائز قرار دیتے ہیں۔ البتہ شوافع اسے ناجائز کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک میت کی طرف سے اسی صورت میں قربانی کی جا سکتی ہے جب مرنے والے نے اس کی وصیت کی ہو یا وقف کیا ہو۔

جواز کے قائلین کا استدلال یہ ہے کہ مالی عبادت دوسرے شخص کی طرف سے کی جا سکتی ہے۔ چناں چہ جس طرح صدقہ یا حج میت کی طرف سے کیا جا سکتا ہے، اسی طرح اس کی طرف سے قربانی کرنا بھی ممکن ہے۔ دوسرے کی طرف سے قربانی کرنے والا اسی طرح اس کا گوشت کھا سکتا ہے، جس طرح وہ اپنی قربانی کا گوشت کھاتا ہے۔ البتہ اگر متوفی نے قربانی کی وصیت کی ہو، تو پورے گوشت کو صدقہ کر دینا ضروری ہے۔

۲۔ ایک شخص اپنی طرف سے ایک جانور کی بھی قربانی کر سکتا ہے اور ایک سے زائد جانوروں کی بھی۔ اسی طرح وہ اپنے متعلقین کی جانب سے بھی قربانی کر سکتا ہے۔ پورے گھر والوں کی طرف سے ایک جانور کی قربانی بھی کفایت کر سکتی ہے۔ احادیث میں ہر صورت کا بیان موجود ہے:

حضرت انسؓ بن مالک بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہؐ نے دو مینڈھوں کی قربانی کی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ آپؐ نے اپنے ہاتھوں سے انھیں ذبح کیا۔ (بخاری: ۵۵۵۸، مسلم: ۱۹۶۶) ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہؐ نے ایک مینڈھے کی قربانی کی۔ اسے ذبح کرتے وقت آپؐ نے یہ دعا پڑھی: "اے اللہ! اسے قبول کر لے محمدؐ کی طرف سے، آل محمدؐ کی طرف سے اور امت محمدؐ کی طرف سے" (مسلم: ۱۹۶۷)۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے دو مینڈھوں کی قربانی کی۔ ایک محمدؐ اور آل محمدؐ کی طرف سے اور دوسرا امت محمدؐ کی طرف سے۔ (ابن ماجہ: ۳۱۲۲)

عطا بن یسار بیان کرتے ہیں کہ میں نے صحابی رسول حضرت ابوایوب انصاریؓ سے دریافت کیا: عہد رسولؐ میں کس طرح قربانیاں کی جاتی تھیں؟ انھوں نے جواب دیا: "اس زمانے میں آدمی اپنی اور اپنے گھر والوں کی طرف سے ایک بکری ذبح کرتا تھا۔ تمام لوگ خود کھاتے تھے اور دوسروں کو بھی کھلاتے۔ بعد میں لوگوں میں فخر و مباہات کے طور پر زیادہ سے زیادہ جانوروں کی قربانی کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ تب ان کا ویسا حال ہو گیا، جیسا تم دیکھ رہے ہو۔" (ترمذی: ۱۵۰۵)

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کے معاملے کو آدمی کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔ وہ حسب توفیق جتنے جانور چاہے قربان کر سکتا ہے۔ البتہ اس نیک عمل کو اخلاص کے ساتھ اور اجر و ثواب کی امید میں انجام دینا چاہیے۔ وہ فخر و مباہات کے جذبے اور ریاکاری کے شائبے سے بچے۔

۳۔ خصی کیے گئے جانور کی قربانی جائز ہے۔ ناجائز ایسے جانور کی قربانی ہے جس میں کوئی ایسی تبدیلی قدرتی طور پر یا بعد میں پیدا ہو گئی ہو جس کا شمار عموماً عیب میں کیا جاتا ہے۔ خصی کیے جانے کو عیب نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ ایسے جانوروں کا گوشت زیادہ عمدہ اور لذیذ ہوتا ہے کہ اس میں بدبو نہیں ہوتی۔ رسول اللہؐ سے خصی کیے گئے جانور کی قربانی ثابت ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے دو خصی کیے ہوئے موٹے تازے مینڈھوں کی قربانی کی۔ (ابن ماجہ: ۳۱۲۲، احمد: ۱۹۶/۵، ۸/۶، ۲۲۰-۲۲۵)

بکرے کی واپسی

وہ دیکھتے ہی دیکھتے محلے والوں کی آنکھوں کا تارا بن گیا مگر.....

فردوس عالم

کسی اور دن نصیب ہو یا نہ ہو، لیکن عید کے روز ہم طلوع آفتاب کا منظر ضرور دیکھ لیتے ہیں۔ ہم علی الصباح اٹھ جاتے ہیں یعنی یہی کوئی آٹھ نو بجے! اس قدر جلد اٹھنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہم رات بھر سو نہیں پاتے اور نہ سونے کی وجہ یہ کہ ہماری چارپائی کے ایک پائے کے ساتھ ہمارا بکرا بندھا ہوتا ہے۔ تمام رات ہوتی ہے اور بکرے کی آوازیں..... بڑی دلنشیں..... ایسی آواز کہ "بکرا سا لپک جائے ہے، آواز تو دیکھو۔ اتنا عمدہ سُر نکالتا کہ اگر تھوڑا سا اور اونچا اٹھاتا، تو خاصا پکا راگ سنا سکتا تھا..... خیر۔ یہ اپنے اپنے شوق کی بات ہے۔ معلوم ہوتا تھا وہ پاپ سونگ (Pop Song) کا شوقین ہے۔ اب ہم بھلا اس کو کیوں کلاسیکل کی طرف لے جاتے؟

پچھلی عید کی بات ہے، بکرے کی آواز پر صرف ہم ہی نہیں چونکے بلکہ محلے والوں کا بھی یہی عالم تھا۔ تمام رات بکرے نے محلے میں رونق لگائی۔ کئی لوگوں نے پوچھا "بھئی۔ یہ بکرا کہاں سے لائے ہو؟"

ہم نے کہا "بڑی منتوں کا بکرا ہے۔ ایسے بکرے کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔"

اب اپنے ہی منہ سے اپنے بکرے کی تعریف کیسے کریں؟ خواہ مخواہ خود نمائی ہوگی۔ بس یوں سمجھ لیں کہ بہت خوبرو، کم سخن اور برق رفتار ہے۔ حالانکہ بھاری بھرکم ہے۔ یوں کہیے کہ اگر بکروں کا باڈی بلڈنگ مقابلہ کرایا جائے، تو یقیناً ہمارا بکرا اوّل آئے گا۔ اتنا بھاری بھرکم تھا۔ جب ہم اسے لے کر آ رہے تھے، تو ایسا محسوس ہوا، ہم بکرے کو نہیں بلکہ بکرا ہمیں لے کر آ رہا ہے۔

یہی وجہ تھی، راستے میں کئی ایسے دشوار

مقامات آئے کہ ایک طرف بکرا زور لگا رہا تھا اور دوسری طرف ہم زور آزمائی کر رہے تھے۔ ایک وقت ایسا بھی ان آنکھوں نے دیکھا، ہمارے ہاتھ میں صرف بکرے کی رسی رہ گئی۔ ہم نے رسی ہی غنیمت سمجھی..... تھوڑے لکھے کو بہت جانا..... رسی ہی کو ہاتھ میں محفوظ رکھا۔ رسی کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا تاکہ کم از کم بکرے کی کوئی نشانی تو رہ جائے۔ وہ ہم کو آٹو گراف تو دے کر نہیں گیا تھا۔

ہم بہت مضطرب تھے کہ اب بکرا چلا گیا۔ مگر محبت سے محبت کو راہ ملتی ہے، دل سے دل کو راہ ملتی ہے۔ آخر بکرا تھا، محبت کی قدر جانتا تھا، بھولا بھٹکا ہمارے پاس آ گیا۔ ہم پھر اس کو لیے گھر کی طرف چل پڑے۔

جب محلے پہنچے، تو وہاں عید سے پہلے ہی عید کا سماں ہو گیا۔ سبھی لوگوں نے دیکھا کہ ہم کیا خوب بکرا لائے ہیں، اپ ٹو ڈیٹ بکرا، اے ون، سپر ہٹ اور امپورٹڈ بکرا!

لوگ اپنے گھروں سے باہر نکل آئے۔ سوتے ہوئے بچے اٹھ گئے۔ جو پہلے ہی اٹھے ہوئے تھے، وہ دوڑ پڑے..... کچھ ہماری طرف اور کچھ بکرے کی طرف! بعض پھولوں کے لوگ ہار لے کر بھی آئے، کچھ ہمارے اور کچھ بکرے کے لیے۔ ہماری بیگم کا سر بھی فخر سے بلند تھا۔ وہ تو آج زمین پر پاؤں نہیں رکھ رہی تھیں۔ ورنہ پہلے صرف اس وقت رکھتی تھیں جب جوتے کا نیا جوڑا پہنے ہوتیں۔

محلے کی عورتیں بیگم کو مبارک باد دینے آنے لگیں۔

"مبارک ہو، مبارک..... کتنا عمدہ بکرا ملا ہے؟، اللہ مبارک کرے..... ایسا بکرا، تو کہیں دیکھا ہی نہیں....."

ایک خاتون جن کو ذرا شعر و شاعری سے دلچسپی تھی، وہ بولیں:

"ہیں اور بھی دنیا میں بکرے، بہت اچھے
لیکن، بہن.....
بکرے کا تمھارے ہے انداز ہی کچھ اور"

وہ ایسا منفرد، انوکھا، نرالا اور عجیب و غریب بکرا تھا کہ سارے محلے میں شہرت ہو گئی۔ لوگ دور دور سے دیکھنے آنے لگے۔ نہ معلوم کتنے روٹھے ہوئے لوگ دوبارہ دوست ہو گئے..... بکرا نہ ہوا دوستی کا پل ہو گیا۔ سب پر ہماری دولت کا سکہ جم گیا۔ جو ہماری غربت کا تماشا دیکھتے تھے، وہ ہماری امارت کی رونق دیکھنے آئے۔ ہر طرف ہم ہی ہم تھے.....

ہم نے احتیاطاً ایک فوٹو بھی کھنچوا لیا۔ ایک طرف ہم، دوسری طرف ہماری بیگم اور درمیان میں بکرا.....

"ریڈی۔ مسکرائیے۔ بس۔ تھوڑا اور مسکرائیے"..... بکرا بھی مسکرایا۔

"ریڈی۔ ون ٹو تھری۔ تھینک یو....."

یہ فوٹو ہم نے فریم بھی کرا لیا۔ فریم ڈرائنگ روم میں لگایا۔ فوٹو کی ایک کاپی اخبار میں بھیج دی تاکہ وہ لوگ جو ابھی تک ہماری بکرا شناسی سے واقف نہیں، وہ بھی جان جائیں۔

ایک نقل ہم نے اپنی سسرال بھی بھجوائی تاکہ انھیں معلوم ہو جائے، ان کا داماد ایسا ویسا شخص نہیں بلکہ عمدہ بکرا رکھنے والی منفرد ہستی ہے۔

سسرال والوں کو جب یہ علم ہوا، تو محبت نے جوش مارا، خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اپنی بیٹی کے مقدر پر رشک کرنے لگے اور اسی جوش محبت میں ہمارے گھر کی سمت روانہ ہو گئے۔ وہ بنفس نفیس ہمیں دیکھنے، معاف کیجیے بکرے کو دیکھنے ہمارے گھر پہنچ گئے۔ فوراً ہمیں گلے لگا لیا۔ مٹھائی کا ڈبا ہمارے ہاتھ میں دیا۔ بولے "مبارک ہو، مبارک ہو، اتنا عمدہ بکرا! دنیا سے انوکھا بکرا!"

ہمارے سسرال والے ابھی ہم سے پوچھنے ہی والے تھے "بکرا کہاں ہے؟" کہ اچانک دروازے سے آواز آئی:

"صاحب "ٹائم" پورا ہو گیا..... بکرا واپس کر دو!"

اموی دور کے نامور تابعی

رجاءؒ بن حیوہ

آپ نے ساری زندگی اپنے آپ کو اللہ، رسول کریمؐ اور مسلمانوں کی خدمت میں وقف کیے رکھا

عبدالرحمن رافت پاشا

علم وتقویٰ پر ساری زندگی کاربند رہنے والے تابعی، رجاءؒ بن حیوہ سرزمین فلسطین کے قصبے بیسان میں پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت خلافت عثمانؓ کے آخری دور میں ہوئی۔ آبائی تعلق عرب قبیلہ کندہ سے تھا۔ اس طرح رجاء فلسطینی الوطن، عربی النسل اور خاندانی اعتبار سے کندی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

☆☆

اس کندی نوجوان نے صغر سنی ہی سے اطاعت الٰہی کے ماحول میں پرورش پائی، تو اللہ نے اسے اپنا اور مخلوق کا محبوب بنا دیا۔ وہ انتہائی چھوٹی عمر ہی میں حصول علم کی طرف متوجہ ہوئے تو علم نے ان کے دل ودماغ کو زرخیز پا کر وہاں مستقل ڈیرے ڈال لیے۔ انھوں نے کتاب اللہ سے سیراب ہونے اور حدیث رسول ﷺ سے زادِ راہ پانے کو اپنی سب سے بڑی فکرمندی ٹھہرا لیا تھا۔

انھیں یہ سعادت نصیب ہوئی کہ وہ ابوسعید خدریؓ، ابوالدرداؓ، ابو امامہؓ، عبادہؓ بن صامت، معاویہؓ بن ابوسفیان، عبداللہؓ بن عمرو بن العاصؓ اور نواسؓ بن سمعان جیسے جلیل القدر صحابہ سے علم وعرفان کی دولت لازوال وبیش بہا حاصل کریں۔ یہ صحابہ رجاءؒ بن حیوہ کے لیے ہدایت کے چراغ اور علم وعرفان کی مشعلیں تھیں۔

☆☆

اس سعادت مند جوان نے ایک دستور بنا رکھا تھا جس پر ساری زندگی عمل پیرا رہے۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں:

"وہ اسلام کیا ہی اچھا ہے جس کو ایمان زینت بخشے!
اور وہ ایمان کیا ہی خوب ہے تقویٰ جس کا حسن بن جائے!
اور وہ تقویٰ کیا ہی کمال ہے جس کی زینت علم ہو!
اور وہ علم کیا ہی بہتر ہے جس کو عمل حسن بخشے!
اور اس عمل کے کیا کہنے جسے انکسار و عاجزی کا بناؤ سنگار مل جائے!"

رجاء بن حیوہ عبدالملک بن مروان سے لے کر عمرؓ بن عبدالعزیز کے دور تک بیشتر خلفائے بنی امیہ کے وزیر رہے۔ لیکن سلیمان بن عبدالملک اور عمرؓ بن عبدالعزیز کے ساتھ ان کی رفاقت باقی خلفا سے کہیں بڑھ کر تھی۔

رائے میں صلابت، گفتگو میں سچائی، نیت میں اخلاص اور معاملات کو حکمت کے ساتھ سلجھانے کی خوبی نے انھیں خلفائے بنی امیہ کے دلوں کے قریب کر دیا تھا۔ وہ دنیا جس پر لوگ گرے پڑتے ہیں، خلفا کے ہاں اس کا وافر سامان موجود تھا لیکن رجاء نے اس سے بے نیازی اختیار کر کے اپنی مذکورہ تمام خوبیوں کو چار چاند لگا دیے۔

خلفا بنی امیہ کے لیے اللہ کی طرف سے یہ عظیم رحمت اور بہت بڑا اعزاز تھا کہ انھیں رجاء بن حیوہ کی رفاقت میسر آئی۔ رجاء نے ان کو خیر کی طرف بلایا اور اس کے راستوں کی طرف ان کی راہنمائی فرمائی۔ انھیں برائی سے روکا۔

حق کا راستہ دکھایا اور اس کی اتباع کو ان کے لیے مرغوب بنایا۔ باطل کو ان پر روز روشن کی طرح واضح کیا اور اس کا ارتکاب ان کے لیے ناپسند بنا دیا۔

اس طرح انھوں نے اللہ، اس کے رسول ﷺ، ائمہ مسلمین اور عام مسلمانوں کے لیے خیر خواہی کا فریضہ انجام دیا۔

ایک دفعہ رجاء بن حیوہ کے ایسا واقعہ پیش آیا جس نے خلفا کے ساتھ ان کے تعلق کی راہ واضح کر دی اور ان کی اہمیت کو بڑھا دیا۔ انھوں نے یہ بات خود بیان کی ہے، کہتے ہیں:

"ایک دفعہ میں لوگوں کے ہجوم میں سلیمان بن عبدالملک کے ساتھ کھڑا تھا۔ دیکھا کہ ہجوم کے درمیان ایک شخص ہمارا رخ کیے ہوئے ہے۔ وہ خوبصورت اور بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ وہ مسلسل صفیں چیرتا ہوا آ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ خلیفہ کے پاس آ رہا ہے۔ مگر وہ میرے برابر آ پہنچا اور میرے پہلو میں کھڑا ہو گیا۔ پھر مجھے سلام کر کے کہنے لگا:

"اے رجاءؒ! تم اس آدمی کی وجہ سے آزمائش میں ڈالے گئے ہو۔ (اور خلیفہ کی طرف اشارہ کیا) اس کے قرب میں یا تو خیر ہی خیر ہے یا شر ہی شر! لہٰذا تو اس کے ساتھ اپنی قربت کو لوگوں کے لیے اور اپنے لیے خیر بنا لو۔

"اور جان رکھو، اے رجاءؒ! وہ شخص جسے بادشاہ کے ہاں کوئی مقام حاصل ہو اور وہ کسی ایسے کمزور شخص کا کوئی مسئلہ بادشاہ تک پہنچا دے جس کی طاقت وہ غریب نہیں رکھتا، تو قیامت کے دن جب وہ شخص اللہ کے حضور حاضر ہوگا، تو حساب کے وقت اللہ اسے ثابت قدم رکھے گا۔

"یاد رکھیے! اے رجاءؒ! من کان فی حاجتہ اخیہ المسلم کان اللہ فی حاجتہ "جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگ جاتا ہے اللہ اس کی ضرورت کو پورا کر دیتا ہے۔"

"اے رجاءؒ! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان من احب الاعمال الی اللہ جل و عز ادخال الفرح علی قلب امری مسلم "بے شک اللہ جل و عز کے نزدیک محبوب ترین عمل کسی مسلمان کے دل میں خوشی کا سامان پیدا کر دینا ہے۔"

میں اس کی گفتگو پر غور کرتے ہوئے توقع کر رہا تھا کہ وہ مجھے مزید کچھ باتیں سنائے گا کہ اتنے میں خلیفہ نے یہ کہتے ہوئے آواز دی:

"رجاءؒ بن حیوہ کہاں ہیں؟"

میں نے اس کی طرف مڑ کر کہا: "یہیں ہوں اے امیر المومنین!"

"خلیفہ نے مجھ سے کسی چیز کے بارے میں پوچھا۔ میں جواب دے کر اپنے ساتھی کی طرف متوجہ ہوا، تو اسے وہاں نہ پایا۔ میں نے ادھر اُدھر بغور دیکھا لیکن لوگوں کے درمیان بھی اس کے کوئی آثار نہ ملے۔"

☆☆

خلفائے بنی امیہ کے سامنے رجاءؒ بن حیوہ نے کئی بار اعلائے کلمۂ حق بلند کیا۔ یہ واقعات تاریخ کے روشن صفحات میں محفوظ ہیں۔

ایک دن رجاءؒ بن حیوہ خلیفہ عبدالملک بن مروان کی مجلس میں بیٹھے تھے۔ خلیفہ کے سامنے ایک شخص کی اس بری عادت کا ذکر کیا گیا کہ وہ بنی امیہ کے بارے میں اچھے خیالات نہیں رکھتا۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ وہ عبداللہؓ بن زبیر کا حامی اور مددگار ہے۔

شکایت کرنے والے نے اس شخص کی ایسی باتوں اور عادتوں کا ذکر کیا جن سے خلیفہ کا غضب بھڑک اٹھا۔ اس نے کہا: "اللہ کی قسم! اگر اللہ نے کسی وقت اسے میرے قابو میں کر دیا، تو میں اس کے ساتھ برا سلوک کروں اور اس کی گردن پر تلوار چلا کر چھوڑوں گا۔"

کوئی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اللہ نے خلیفہ کو اس آدمی پر غلبہ دے دیا۔ اسے گرفتار کر کے دربار میں حاضر کیا گیا جب خلیفہ کی نظر اس پر پڑی، تو قریب تھا کہ وہ غصے سے پھٹ جاتا۔ لہٰذا اس نے سزا نافذ کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ منظر دیکھ کر رجاءؒ بن حیوہ خلیفہ کے پاس گئے اور کہنے لگے:

"اے امیر المومنین! یقیناً اللہ عزوجل نے آپ کے لیے وہ غلبہ ممکن بنا دیا جس کی آپ نے خواہش کی تھی۔ آپ بھی اللہ کی خاطر درگزر سے کام لیں جو اللہ کو پسند ہے۔"

خلیفہ نے یہ بات سنی، تو غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور سانس کی حرکت بھی پرسکون ہو گئی۔ آدمی کو معاف کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیا اور کچھ مال و دولت سے بھی نوازا۔

☆☆

۹۱ ہجری میں خلیفہ ولید بن عبدالملک نے حج کیا، تو رجاءؒ بن حیوہ اس کے ساتھ تھے۔ جب یہ دونوں مدینہ منورہ پہنچے، تو مسجد

نیکی اور بدی

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا "تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے مٹا دے، اگر وہ اس پر قدرت نہ رکھتا ہو تو زبان سے منع کرے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو دل سے برا سمجھے، یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔ (صحیح مسلم)

اس حدیث مبارکہ میں ایمان کے تین درجے بیان کیے گئے ہیں اور ان تینوں درجوں کا تعلق اس بات سے ہے کہ ایک مومن جب اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کے برخلاف کوئی بات ہوتے ہوئے دیکھے تو اس کا کیا ردعمل ہو، پہلا درجہ یہ ہے کہ ہاتھ سے مٹا دے، بشرطیکہ استطاعت اور قدرت ہو، اگر ہاتھ سے مٹا دینے کی قدرت نہ ہو تو زبان سے روکے اور اگر معاشرے میں برے لوگوں کے غلبے کی بنا پر یہ قدرت بھی نہ رہے تو پھر دل میں برا سمجھے اور ناگوار محسوس ہو، اگر اللہ کے فضل و کرم سے اس برائی سے خود بچا ہوا ہے، تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور دعا کرے کہ اے اللہ! مجھے آئندہ بھی اس برائی سے اسی طرح محفوظ رکھیے، جس طرح آپ نے اس وقت حفاظت فرمائی ہے، یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔ اگر کوئی مسلمان اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کی خلاف ورزی کو دل سے بھی برا نہ سمجھے تو اسے اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے۔

نبوی کی زیارت کی۔ عمرؒ بن عبدالعزیز بھی ان کے ہمراہ تھے۔

خلیفہ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ حرم نبوی کو جی بھر کر دیکھوں۔ یہی وہ وقت تھا جب انھوں نے مسجد کی توسیع کا عزم کیا اور مسجد کا رقبہ ۲۰۰ ہاتھ ہوگیا تھا۔

چناں چہ لوگوں کو مسجد سے نکال دیا گیا تاکہ خلیفہ یکسوئی کے ساتھ مسجد کے بارے میں غور کرسکیں۔ سوائے سعید بن مسیبؒ کے کوئی آدمی مسجد میں نہ رہا۔ مسجد کے چوکیدار کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ انھیں مسجد سے باہر جانے کے لیے کہے۔ یہ دیکھ کر گورنر مدینہ عمر بن عبدالعزیز نے انھیں پیغام بھیجا:

"جس طرح لوگ مسجد سے باہر چلے گئے ہیں آپ بھی براہ کرم تشریف لے جائیں۔"

جواب میں سعید بن مسیبؒ نے فرمایا:

لاأغادرُ المسجد الا فی الوقت الذی اعتدتُ ان أغادرهُ فیه کلَّ یوم (میں نے روزانہ مسجد چھوڑنے کا جو وقت مقرر کررکھا ہے، اس سے پہلے ہرگز ایسا نہیں کرسکتا۔)

ان سے کہا گیا: "چلیں، اتنا ہی کرلیں کہ امیر المومنین آئیں، تو کھڑے ہوکر انھیں سلام کرلیں۔"

اس پر سعیدؒ بن مسیب نے مومنانہ شان سے فرمایا: **إنّما جئتُ الی هنا لاقوم لربِّ العلمین**

(میں یہاں رب العالمین کے سامنے کھڑا ہونے کے لیے آیا ہوں، خلیفہ کے سامنے آداب بجالانے کے لیے نہیں!)

جب عمرؒ بن عبدالعزیز کو اپنے آدمی اور سعیدؒ بن مسیب کے درمیان ہونے والی گفتگو کا علم ہوا، تو وہ خلیفہ کو اس جگہ سے دور رکھنے کی کوشش کرنے لگے جہاں حضرتؒ بیٹھے تھے (شاید خلیفہ ولید نے صورت حال کو بھانپ لیا) وہ کہنے لگا: "یہ بزرگ کون ہیں، کیا یہ سعید بن مسیب نہیں؟"

رجاءؒ بن حیوہ اور عمرؒ بن عبدالعزیز نے کہا: "ہاں! اے امیر المومنین وہی ہیں۔ دونوں پھر ان کے دینی مقام، علم و فضل اور تقویٰ طہارت کا ذکر کرنے لگے اور گویا ہوئے۔

"اگر انھیں خلیفہ کی جگہ کا علم ہوجاتا، تو وہ ضرور اٹھ کر انھیں سلام کرتے، لیکن اب ان کی نظر کمزور ہوگئی ہے۔"

ولید کہنے لگا "میں بھی ان کے بارے میں وہی کچھ جانتا ہوں جو آپ بتا رہے ہیں۔ یہ تو ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کے پاس جائیں اور انھیں سلام کریں۔"

آخرکار وہ گھومتے پھرتے سعیدؒ کے پاس آٹھہرے، انھیں سلام کیا اور کہا: "شیخ! کیسے ہیں؟"

سعیدؒ اپنی جگہ سے نہ ہلے اور کہا: "اللہ کے بے شمار انعامات ہیں، حمد و تعریف تو اسی کے لیے ہے۔ ہاں، امیر المومنین کیسے ہیں؟ اللہ انھیں ان کاموں کی توفیق دے، جو اسے پسند ہیں اور جن پر وہ خوش ہوتا ہے۔"

ولید ان کے پاس سے واپس مڑے، تو کہہ رہے تھے: "یہ بقیۃ الناس ہیں۔" یہ اس امت کے بقیۃ السلف ہیں۔

☆☆

جب خلافت سلیمان بن عبدالملک کو ملی، تو رجاءؒ بن حیوہ کو ان کے ہاں اس قدر بلند مقام حاصل ہوا جو سابقین سے بہت ممتاز تھا۔ سلیمان تو حد درجہ ان پر اعتماد کرتا تھا۔ اس کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ ہر چھوٹے بڑے معاملے میں ان سے رائے لے۔

خلیفہ سلیمان کے دور میں رجاء بن حیوہ کو کئی واقعات سے پالا پڑا۔ لیکن حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کی بطور ولی عہد تقرری اور ان کے لیے بیعت لینے کے معاملے میں، تو ان کی منفرد شان ہے۔ یہ اسلام و مسلمانوں سے ایک بہت بڑے خطرے کو ٹالنے کی عظیم اور کامیاب کوشش تھی۔

رجاءؒ بن حیوہ بیان کرتے ہیں:

۹۹ ہجری کے ماہ صفر کا پہلا جمعہ تھا اور ہم امیر المومنین سلیمان بن عبدالملک کے ساتھ دابق میں تھے۔ (دابق شام میں حلب شہر کے قریب ایک بستی ہے، بنوامیہ کے حکام جب روم پر لشکرکشی کرتے تو یہاں ٹھہرتے تھے، سلیمان بن عبدالملک کی قبر بھی یہیں ہے) خلیفہ نے قسطنطنیہ کی طرف اپنے بھائی

مسلمہ بن عبدالملک کی قیادت میں ایک بہت بڑا ہیبت ناک لشکر بھیجا ہوا تھا۔ مسلمہ کے ساتھ خلیفہ کا بیٹا داؤد اور شاہی خاندان کے افراد کا ایک گروہ بھی تھا۔

خلیفہ نے قسم کھا رکھی تھی کہ میں دابق کی چراگاہ کو اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک اللہ میرے لیے قسطنطنیہ فتح نہیں کر دیتا یا پھر یہیں مروں گا۔

جب نماز جمعہ کا وقت قریب آیا، تو خلیفہ نے بہترین طریقے سے وضو کیا، پھر سبز حلہ اور عمامہ پہنا..... آئینے میں خود کو اس انداز سے دیکھا گویا اپنا آپ بڑا خوبصورت ہو اور جوانی کی رعنائی، خوشنمائی لوٹ آئی۔ اس وقت ان کی عمر چالیس سال کے قریب تھی۔

پھر وہ لوگوں کو نماز جمعہ کی امامت کرانے مسجد پہنچے، تو وہیں انھیں بخار ہو گیا۔ مرض روز بروز بڑھتا گیا۔ مجھ سے کہا کہ میرے قریب ہی رہا کرو۔ ایک بار میں ان کے پاس گیا، تو انھیں کچھ لکھتے ہوئے دیکھا۔

میں نے کہا: ''امیرالمومنین! کیا کر رہے ہیں؟''

کہنے لگے: ''اپنے بیٹے ایوب کو ولی عہد مقرر کرنے کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔''

میں نے کہا: ''اے امیرالمومنین! بے شک وہ چیز جو قبر میں خلیفہ کی حفاظت کرے گی اور اللہ کے ہاں اس کی نجات کا سبب بنے گی، وہ یہ ہے کہ آپ لوگوں پر کسی صالح آدمی کو خلیفہ بنا جائیں۔ آپ کا بیٹا ایوب تو کافی عرصہ تک بھی اس قابل نہیں ہو گا اور ابھی تو آپ پر اس کی برائی بھلائی بھی واضح نہیں ہوئی کیونکہ وہ بہت چھوٹا ہے۔''

خلیفہ نے کہا: ''یہ تحریر تو میں نے لکھ دی ہے۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ اللہ سے استخارہ کروں۔ یہ میرا اٹل فیصلہ نہیں ہے۔''

پھر اس نے تحریر پھاڑ دی۔ ابھی ایک یا دو دن گزرے تھے کہ مجھے بلایا اور کہا: ''اے ابوالمقدام، میرے بیٹے داؤد کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

میں نے کہا: ''وہ مسلمان لشکروں کے ساتھ قسطنطنیہ میں ہے۔ آپ نہیں جانتے کہ وہ زندہ بھی ہے یا مر گیا؟''

خلیفہ نے کہا: ''تو پھر تیری رائے کس کے بارے میں ہے اے رجاء؟''

میں نے کہا: ''رائے تو آپ کی ہو گی اے امیرالمومنین!''

دراصل میں چاہتا تھا کہ ان لوگوں پر نظر ڈالوں جن کا خلیفہ تذکرہ کر رہا ہے تاکہ ایک ایک کر کے انھیں اس کام کے لیے غیر موزوں قرار دلوا دوں اور عمرؓ بن عبدالعزیز تک جا پہنچوں۔

ان سب لوگوں کا تذکرہ کرنے کے بعد خود خلیفہ نے کہا: ''عمرؓ بن عبدالعزیز کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

میں نے کہا: ''اللہ کی قسم میں تو انھیں دیندار، عاقل، فاضل اور ہر اعتبار سے کامل سمجھتا ہوں۔''

خلیفہ نے کہا: ''آپ سچ کہہ رہے ہیں! اللہ کی قسم! یقیناً وہ ایسے ہی ہیں لیکن اگر میں انھیں ولی عہد مقرر کرتا ہوں، تو بہت بڑا فساد برپا ہو جائے گا۔ وہ (بنی امیہ) کبھی انھیں اپنے اوپر ولی عہد نہیں بننے دیں گے۔''

میں نے کہا: ''عمرؓ بن عبدالعزیز کے ساتھ ان میں سے کسی ایک کو ولی عہدی میں شریک کریں اور اسے عمرؓ کے بعد رکھیں۔''

خلیفہ نے کہا: ''یہ ٹھیک ہے! یہی طریقہ ہے جس سے انھیں مطمئن و پرسکون رکھا جا سکتا اور عمرؓ کی تقرری پر راضی کیا جا سکتا ہے۔'' پھر اس نے کاغذ لیا اور اپنے ہاتھ سے لکھا:

''بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ تحریر امیرالمومنین، اللہ کے بندے، سلیمان بن عبدالملک کی طرف سے عمرؓ بن عبدالعزیز کے لیے ہے۔ میں اپنے بعد اسے خلافت سونپتا ہوں اور اس کے بعد یزید بن عبدالملک کو!

اس کی بات سنو اور مانو۔ اللہ سے ڈرتے رہو اور آپس میں اختلاف میں نہ پڑو کہ حرص و لالچ میں رکھنے والے تمھیں لڑائی پر اکسا کر اپنا کام نکال لیں گے۔''

خلیفہ نے تحریر مکمل کر کے میرے حوالے کر دی، پھر پولیس

افسر کعب بن حامز کو بلا کر کہا "میرے خاندان کے لوگوں کو بلاؤ کہ وہ اس جگہ جمع ہوں اور انھیں یہ بتاؤ کہ جو تحریر رجاءؒ بن حیوہ کے ہاتھ میں ہے، وہ میری تحریر ہے۔ انھیں یہ حکم دو کہ اس تحریر میں جس کا بھی نام ہے" اس کی بیعت کرو۔"

رجاء کہتے ہیں کہ جب لوگ جمع ہوگئے، تو میں نے ان سے کہا "یہ امیر المومنین کی تحریر ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے بعد ایک شخصیت کو خلیفہ مقرر کیا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں نئے خلیفہ کے لیے تم سے بیعت لوں۔

لوگوں نے جواب میں کہا کہ ہم امیر المومنین کی بات کو مانتے ہیں کہ ان کے بعد ہونے والے خلیفہ کی اطاعت کریں گے۔

ان لوگوں نے پھر مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں ان کے لیے امیر المومنین سے اجازت لوں تا کہ وہ انھیں سلام کر لیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے جائیں اور سلام کر لیں۔

جب وہ اندر داخل ہوئے، تو خلیفہ نے ان سے کہا جو تحریر رجاءؒ بن حیوہ کے ہاتھ میں ہے وہ میری تحریر ہے۔ اس میں میرے بعد خلیفہ کی تقرری کا حکم لکھا ہوا ہے۔ آپ اس شخص کی بات سنیں اور مانیں جسے میں نے ولی عہد مقرر کیا ہے اور اس کی بیعت بھی کریں جس کا اس تحریر میں نام ہے۔

لوگ ایک ایک کر کے بیعت کرنے لگے۔ پھر میں اس سیل بند تحریر کو لے کر باہر نکلا۔ میرے اور امیر المومنین کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس میں کس کا نام لکھا ہوا ہے۔

جب لوگوں کا ہجوم گیا، تو عمرؒ بن عبدالعزیز میرے پاس آئے اور کہنے لگے:

"اے ابوالمقدام! امیر المومنین میرے بارے میں اچھا گمان رکھتے ہیں۔ مجھے انھوں نے بڑی محبت و شفقت دی ہے اور مجھے خدشہ ہے کہ خلافت کا یہ معاملہ کہیں میری طرف نہ منتقل کر دیا ہو۔ میں آپ کو اللہ کی قسم اور اپنی عزت و محبت کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ اگر امیر المومنین کی تحریر میں ایسی بات ہے جو میرے بارے میں ہے، تو بتا دیجیے تا کہ میں یہ لمحہ ضائع کیے بغیر اس ذمے داری کو قبول کرنے سے معذرت کر لوں۔"

میں نے ان سے کہا "نہیں اللہ کی قسم! جو کچھ آپ نے پوچھا ہے، میں تو اس کا ایک حرف بھی نہیں بتا سکتا۔

یہ سن کر عمرؒ بن عبدالعزیز چلے گئے اور بڑے غصے میں تھے۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہشام بن عبدالملک میرے پاس آ گیا اور کہنے لگا:

"اے ابوالمقدام! میرا آپ کے ساتھ محبت و حرمت کا ایک پرانا تعلق ہے اور آپ کے مجھ پر احسان بھی بہت زیادہ ہیں جن پر میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ بس آپ یہ بتا دیجیے کہ امیر المومنین کے اس خط میں کیا لکھا ہے۔ میں اللہ کو گواہ بنا کر آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی آپ کا نام نہیں لوں گا۔ اگر خلافت کے لیے میرا نام دیا گیا ہے، تو میں خاموش رہتا ہوں اگر کسی اور کا نام ہے، تو میں احتجاج کروں گا۔ کوئی اور کون ہو سکتا ہے جسے مجھ سے زیادہ اس بات سے تکلیف ہو۔"

میں نے کہا: "اللہ کی قسم میں تو اس بارے میں ایک حرف بھی نہیں بتا سکتا جو امیر المومنین نے مجھے ہی بتایا ہے۔"

یہ سن کر ہشام چلا گیا اور وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہہ رہا تھا "میرے دل پر چرکہ لگا کہ خلافت کسی اور کو کیسے عطا کی جا سکتی ہے؟ کیا خلافت عبدالملک کے بیٹوں سے کسی اور کے پاس چلی جائے گی؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ "اللہ کی قسم! میں تو عبدالملک کی اولاد کا سردار ہوں۔"

رجاءؒ کہتے ہیں پھر میں سلیمان بن عبدالملک کے پاس گیا، تو ان کی روح پرواز کر رہی تھی۔ جب ان پر موت کی غشی طاری ہوئی، تو میں انھیں قبلہ رخ کر رہا تھا۔ اس وقت وہ سسکی لیتے مجھے کہہ رہے تھے: "اے رجاءؒ یہ وقت دوبارہ نہیں آئے گا۔"

میں نے رخ دوبارہ تبدیل کرانے کی کوشش کی۔ جب تیسری بار ایسا کیا تو کہا "ہاں اب۔ ...اے رجاء۔ اگر تو کچھ کرنا چاہتا ہے، تو اب کر لے" اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمدا عبدہ و رسولہ۔"

میں نے ان کو قبلہ رخ کیا، تو زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ

انھوں نے جان جان آفرین کے سپرد کردی، میں نے ان کی آنکھیں بند کیں اور چہرہ سبز کپڑے کے ٹکڑے سے ڈھانپ دیا۔ دروازہ بند کیا اور خود باہر نکل آیا۔

ان کی بیوی نے شوہر کا حال معلوم کرنے کے لیے آدمی بھیجا اور یہ مطالبہ کیا کہ وہ انھیں دیکھنا چاہتی ہیں۔ میں نے دروازہ کھول دیا اور اس آنے والے سے کہا: "دیکھ لیں، طویل بیداری کے بعد ابھی سوئے ہیں، تو آرام کرنے دیں۔"

آدمی خلیفہ کی بیوی کے پاس گیا اور صورت حال بتائی، تو اس نے یقین کرلیا کہ سو رہے ہیں۔ پھر میں نے دروازہ بند رکھنے کا کہا اور ایک چوکیدار جس پر مجھے اعتماد تھا، وہاں بٹھا دیا اور اسے یہ تاکید کی کہ وہ اپنی جگہ سے اس وقت تک نہ ہلے جب تک میں واپس نہ آجاؤں اور کوئی بھی خلیفہ کے پاس ہرگز نہ جائے۔

میں باہر گیا، تو لوگ مجھے ملتے ہوئے پوچھنے لگے: "امیر المومنین کا کیا حال ہے؟"

میں نے کہا "جب سے بیمار ہیں اس قدر سکون اور افاقہ نہیں ملا جس قدر اب ہے۔"

لوگوں نے کہا: "اللہ کا شکر ہے۔"

میں نے پھر کعب بن حامز، پولیس افسر کو بلوایا۔ اس نے امیر المومنین کے تمام اہل بیت کو دابق کی مسجد میں جمع کرلیا۔

میں نے لوگوں سے کہا: اس شخص کے لیے بیعت کرو جس کا نام امیر المومنین کے اس خط میں ہے۔

لوگوں نے کہا: ہم نے ایک بار تو بیعت کر لی ہے کیا دوبارہ کریں؟

میں نے کہا: یہ امیر المومنین کا حکم ہے۔ اس کی تعمیل میں بیعت کرو اور اس شخص کے لیے جس کا نام اس مہر زدہ خط میں ہے۔

لوگوں نے ایک ایک کرکے بیعت کرلی۔

جب میں نے محسوس کیا کہ معاملہ مضبوط ہو گیا ہے، تو لوگوں سے کہا "آپ کے خلیفہ فوت ہو گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! اور لوگوں کے سامنے خط پڑھ ڈالا۔ جب عمرؒ بن عبدالعزیز کے نام پر اسے ختم کیا، تو ہشام بن عبدالملک بپھر گیا

حدیث مبارکہ

حضرت عبادہؓ بن صامت سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: "جس شخص کی موت اس حال میں آئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو، تو یقیناً اللہ تعالیٰ نے اس پر دوزخ کی آگ حرام کردی۔"

(عمل الیوم واللیلۃ للنسائی)

اور کہنے لگا، ہم اس کی بیعت نہیں کریں گے۔"

میں نے کہا: اگر ایسا نہ کیا، تو اللہ کی قسم تیری گردن اڑا دوں گا۔ کھڑا ہو اور بیعت کر۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ کھڑا ہوا۔ بیعت کرتے ہوئے جب عمرؒ بن عبدالعزیز کے نام پر پہنچا، تو کہنے لگا: انا للہ و انا الیہ راجعون۔ وہ اپنے اور بھائیوں سے خلافت چھن کر عمرؒ بن عبدالعزیز کے پاس چلے جانے پر اناللہ پڑھ رہا تھا۔

عمرؒ بن عبدالعزیز بھی انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھ رہے تھے۔ یہ اناللہ اس لیے پڑھ رہے تھے کہ خلافت نہ چاہتے ہوئے بھی ان کو دے دی گئی۔

یہی وہ بیعت تھی جس کے باعث اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عروج عطا کیا اور دین کا منار بلند کردیا۔

☆☆

خوشخبری ہے خلیفہ مسلمین سلیمان عبدالملک کے لیے کہ ایک نیک آدمی کو حاکم بنا کر وہ اللہ کے ہاں اپنی ذمے داری سے سرخرو ہوگئے۔

مبارک ہے حق گو وزیر رجاءؒ بن حیوہ انھوں نے اللہ، اس کے رسول ﷺ اور ائمہ مسلمین کی خیرخواہی کا فریضہ انجام دیا۔ اللہ انھیں صالح دوستی کی جزا دے اور انھیں بہترین اجر سے نوازے۔ اللہ سے توفیق پانے والے نیک حکمران آئندہ بھی ان کی روشن راہ سے ہدایت پاتے رہیں گے۔

رجاء بن حیوہ نے ۱۱۲ھ ہجری میں وفات پائی۔

وہ جملہ یہ تھا "یہ وقت ہمیشہ نہیں رہے گا۔"
میں نے اس تاریخی واقعے اور سنہرے قول سے بہت کچھ سیکھا جو قارئین کی نظر ہے۔

☆☆

مولانا عطا اللہ شاہ بخاریؒ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے پوری زندگی میں دو لوگوں کی تلاش رہی لیکن وہ مجھے نہ مل سکے۔ ایک وہ جس نے صدقہ کیا اور مفلس ہو گیا' دوسرا وہ جس نے ظلم کیا اور اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے محفوظ رہا۔

یہ تھے دو سبق آموز واقعات جو ہمیں اپنی اصلاح پر آمادہ کرتے ہیں۔ آئیے اب میری بدبیتی بھی پڑھ لیجیے۔

☆☆

گھر کے چھوٹے موٹے مسئلے میں خود حل کر لیتا ہوں۔ مثلاً بجلی کا سوئچ خراب ہے' استری گرم نہیں ہو رہی' پائپ کی ٹونٹی ٹپک رہی ہو۔ حتیٰ کہ گٹر میں بانس پھیرنا پڑے تو راقم بنا کسی عار کے

ایک دن سلطان محمود غزنوی نے اپنے غلام ایاز کو ایک انگوٹھی دی اور کہا "اس پر ایسا جملہ کھودیے کہ میں خوشی کے موقع پر دیکھوں' تو افسردہ اور اگر غم کی حالت میں دیکھوں' تو خوش ہو جاؤں۔

ایاز نے کمال فراست سے ایک ایسا ہی جملہ لکھا جس میں آنے والی نسلوں کے لیے بھی پیغام پوشیدہ ہے:

آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل

ڈی ایس پی پولیس کو چکمہ دینے والے شاعر کا دلچسپ قصہ

سراج دین

یہ معرکہ بھی سر کر لیتا ہے۔ اسی طرح کے بے شمار گھریلو مسائل جو بظاہر کسی کھاتے میں نہیں آتے، لیکن انھیں سلجھانے کی خاطر کسی کاریگر کی خدمات مستعار لی جائیں، تو اچھی خاصی رقم اُٹھ جاتی ہے جو ہم ایسے سفید پوشوں کو گراں گزرتی ہے۔

بہت دنوں سے بیگم ڈونگی پمپ چلاتے ہوئے سوئچ سے شعلے نکلنے کی شکایت کر رہی تھی اور یہ بھی کہ جب سوئچ بند کرو تب بھی چنگاریاں نکلتی ہیں۔ میں یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ ربڑ کے جوتے پہن کر یہ کام کیا کرو، کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن آخر کب تک، وہ سوئچ ناکارہ ہو گیا۔ نہانے کے لیے غسل خانے گیا، تو ٹینکی خالی تھی۔ بالائی منزل پر سرکاری نل کا پانی بغیر موٹر کے نہیں آتا۔

غالباً لیسکو والوں نے واسا والوں سے "ٹک مکا" کیا ہوا ہے کہ پانی پوری رفتار سے نہیں چھوڑنا تاکہ صارفین بجلی کی موٹر سے پانی اوپر کھینچیں اور یونٹوں کی صورت میں اُن کی چاندی کھری ہوتی رہے۔ خیر اب راقم کے کان کھڑے ہوئے۔

بجلی کا بورڈ کھولا تو ایک کے بجائے دو سوئچ خراب ہو چکے تھے۔ بھاگم بھاگ بازار سے سوئچ خرید لایا اور اپنی کاریگری کے جوہر دکھانے بیٹھ گیا۔ یہ واحد کام ہے جسے کرتے ہوئے بیگم اور بچوں کو میرے قریب آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ میں ایک خشک لکڑی کے تختے پر براجمان بجلی کی تاروں سے بے خطر چھیڑ چھاڑ کرتا ہوں۔ برقی جھٹکے سے محفوظ رہنے کے لیے پیروں میں ربڑ کی جوتی اور لکڑی کا تختہ ازبس ضروری ہے ورنہ یہ ظالم کام تمام کرنے میں نہیں چوکتی۔

گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی مشقت کے بعد دونوں سوئچ تبدیل کیے اور بورڈ دیوار میں پیوست لکڑی کے ڈبے پر نصب کرنے لگا۔ تین پیچ لگا چکا تو چوتھا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ آس پاس پڑی تمام اشیا اُٹھا کر تلاش کیا، لیکن پیچ نہ ملا۔ میں حیران اور ششدر تھا کہ میرے پاس کوئی آیا بھی نہیں، تو پیچ کدھر گیا۔ ایک مرتبہ پھر نظریں دوڑائیں اور خاصی باریک بینی سے گرد و پیش کا جائزہ لیا، مگر بے سود۔ آخر تھک ہار کر انھی پیچوں پر گزارا کیا اور سامان سمیت اٹھنے لگا تو گمشدہ پیچ سامنے پڑا نظر آ گیا۔

میری حیرت کا ٹھکانہ نہیں رہا کیونکہ بارہا میں یہ جگہ ٹٹول چکا تھا اور اب پیچ بالکل نمایاں پڑا نظر آ رہا تھا۔ خیر پیچ ملنے کی خوشی ہوئی اور اُسے اُٹھا بورڈ میں کس دیا، لیکن حیرت ذہن کا احاطہ کیے رہی کہ بعض اوقات انسان کے ساتھ ایسا عجیب و غریب ماجرا کیوں پیش آتا ہے۔ شاید تب حواس خمسہ انسانی عقل کا ساتھ نہیں دے پاتے اور وہ ہونق سا ہو جاتا ہے۔

بے ساختہ مجھے اپنا ایک دوست یاد آ گیا، جو محکمہ پولیس میں اچھے منصب پر فائز اور قدرے متحرک شخصیت کا مالک ہے۔ انھوں نے ایک واقعہ سنایا جو درج ذیل ہے۔ ایک مرتبہ ڈی ایس پی حارث بھروانہ کسی کام سے ہال روڈ گئے۔ وہاں گاڑیوں کا ازدحام تھا۔ خیر انھیں بھی کسی پلازے کے سامنے گاڑی پارک کرنے کی جگہ مل گئی۔ عجلت میں گاڑی سے نکل پلازے میں گھس گئے اور مطلوبہ شے خرید اُنھی قدموں پر لوٹ آئے۔ مگر یہ کیا، وہاں گاڑی موجود نہ تھی۔

اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں لیکن دور دور تک گاڑی کا نام و نشان نہ تھا۔ ڈی ایس پی صاحب حیران کہ اِس قدر بھیڑ میں گاڑی یہاں سے نکل ہی نہیں سکتی اور چند منٹوں میں غائب کیسے ہو گئی۔ فوراً متعلقہ تھانے فون کیا۔ چند منٹوں میں پولیس کی بھاری نفری موقع واردات پر پہنچ گئی۔

ڈی ایس پی صاحب سے پوچھا گیا کہ گاڑی کہاں پارک کی تھی؟ وہ پلازے کے سامنے کھڑی سیکڑوں گاڑیوں کی جانب اشارہ کرتے کہ انھی کے بیچ کھڑی کی تھی اور میں چند ہی منٹوں میں واپس آ گیا۔ اب پتا نہیں کہاں گئی! اہلکاروں نے اپنی اپنی بساط کے مطابق سراغ رسانی کی کوشش کی اور فوری طور پر ہال روڈ کے گرد و پیش ناکے بھی لگا دیے مگر کار چور کوئی چھلاوا ہی تھا جو بھرے بازار میں گاڑی لے اُڑا۔

فوراً ہی نامعلوم چور کے خلاف پرچہ درج کر لیا گیا اور عملہ گاڑی کا نمبر اور رنگ وغیرہ کی تفصیل نوٹ کر چلتا بنا۔ جبکہ بھروانہ

صاحب بار بار غصے کے مارے مٹھیاں بھینچ رہے تھے۔ خیر صبر کر بڑبڑاتے ہوئے وہ بھی چل دیے۔ جب تک گاڑی نہیں ملی وہ پیچ و تاب کھا کر افسوس کرنے والوں کو چوری کی مہارت کے بابت بتانے لگتے کہ کس طرح اُس نے گاڑی غائب کی جو میرے لیے کسی معمے سے کم نہیں۔ بس ایک بار وہ مجھے مل جائے ..

گھر میں بیگم شوہر نامدار کا تمسخر اڑاتیں کہ اتنے بڑے پولیس افسر ہو کے گاڑی اُٹھوائی وہ بھی بھرے بازار میں۔ کیا فائدہ ایسی افسری کا...... حارث صاحب مسکرا کے بات ٹال دیتے' لیکن دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے کہ واقعی میرے لیے یہ ندامت کی بات ہے' بیگم کی تو خیر ہے' مگر میرے ساتھی افسران جو میرا مذاق اُڑاتے ہیں' وہ تکلیف کا باعث ہے۔ بھروانہ صاحب ایک ایک دن گن گن کر گزار رہے تھے۔

دو ماہ بعد بھروانہ صاحب کو متعلقہ تھانے سے رات گئے فون پر اطلاع ملی "چور پکڑا گیا اور گاڑی بھی برآمد کر لی ہے۔ جناب کیا حکم ہے۔"

بھروانہ صاحب نے صرف اتنا کہا "میں آتا ہوں۔" وہ شبینہ لباس میں ہی اسی حالت میں تھانے پہنچ گئے۔ گاڑی تھانے کی حدود میں کھڑی اور بالکل درست حالت میں تھی۔

وہ سیدھے حوالات کی جانب بڑھے جہاں ایک بڑھی ہوئی شیو والا جوان زمین پہ بیٹھا تھا۔ عمر یہی کوئی چھبیس سال کے لگ بھگ' لیکن خوف کے مارے بُری طرح کانپ رہا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ یہ گاڑی کسی عام شہری نہیں ڈی ایس پی کی ہے اور پولیس اس کی کیا درگت بنائے گی' وہ بخوبی جانتا تھا۔

لیکن اس کی خوش قسمتی کہہ لیں کہ اس عرصے میں ڈی ایس پی کا غصہ کافور ہو چکا تھا۔ وہ چور کی بری حالت دیکھ کر کچھ لمحے سوچتے رہے۔ پھر گویا ہوئے "تم مجھے صرف یہ بتا دو کہ اس قدر ہجوم میں کھڑی گاڑی چند لمحوں میں تم کیسے لے اُڑے؟ سچ سچ بتا دو میں تمہاری سزا معاف کروا دوں گا۔"

یہ سن کر چور کی ڈھارس بندھی اور بھروانہ صاحب کی جانب بغور دیکھنے لگا۔ اُس نے اُن کی آنکھوں سے بھانپ لیا کہ وہ کسی ٹال مٹول کے بغیر یہ پیشکش کر رہے ہیں۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر بھروانہ صاحب کے پہلو میں آ سر جھکائے کھڑا ہو گیا' مگر زبان اُس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس دوران تھانے کا عملہ بھی آن پہنچا۔ ایک سپاہی نے مغلظات بکتے ہوئے اُسے لب کشائی پر آمادہ کیا' تو وہ گویا ہوا "جناب مجھے معاف کر دیں۔"

بھروانہ صاحب نے کہا' معاف بھی کر دیں گے۔ پہلے اپنی واردات کی روداد تو سناؤ..."

وہ ڈرتے ڈرتے بولا:

"جناب عالی! جب آپ نے گاڑی پارک کی' تو میں وہاں پہلے ہی سے شکار کی تاک میں کھڑا تھا۔ اس دوران جتنی بھی گاڑیاں آئیں' اُن میں دو چار آدمی براجمان ہوتے یا کسی میں پورا خاندان ہی کھسا کھس بھرا ہوتا۔ ظاہر ہے ایسی گاڑی چرانا ممکن نہ تھا۔ خیر اسی اثنا میں آپ تنہا گاڑی پر آئے اور پارک کرتے ہی تیزی سے پلازے میں چلے گئے۔

"میں نے سرعت سے آپ کی گاڑی پر سیاہ غلاف کی مدد سے کیموفلاج کیا اور دور کھڑا پان سگریٹوں کے کھوکھے سے تماشا دیکھنے لگا۔ چند لمحوں بعد آپ نمودار ہوئے اور اپنی ہی گاڑی کے قریب کھڑے ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ اپنی دال گل گئی۔ آپ کو حیران اور ششدر چھوڑ کر اپنی راہ ہو لیا۔ سرِ شام جب مارکیٹ بند ہو گئی' تو وہاں آ پہنچا۔ گاڑی ابھی تک برقع اوڑھے کھڑی تھی۔ میں نے آرام سے کپڑا اتار کیا اور ماسٹر کی سے تالا کھول گاڑی نکال لایا۔"

یہ سن کر بھروانہ صاحب اور پولیس اہلکار سے نظریں چرانے اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ یقیناً دل ہی دل میں وہ اپنی عقل پہ ماتم کر رہے ہوں گے۔ پھر چور کی مختلف زاویوں سے تصاویر اُتاری گئیں' ہر ہفتے تھانے میں حاضر ہونے کا پابند کیا اور یہ بھی کہا کہ جب تمھیں بلایا جائے' تو فوراً حاضر ہونا پڑے گا۔ اس نے تمام شرائط قبول کر لیں' تو اُسے چھوڑ دیا گیا۔ ◆◆◆

۱۹۹۵ء کے اواخر کی بات ہے۔ آسیہ بھابی نے بالائی کمرے سے چیختے ہوئے کہا "امی عابد کو دیکھیں کیا ہو گیا ہے۔" اُس دن اتفاق سے سبھی گھر موجود تھے۔ ہم بھاگم بھاگ کمرے میں پہنچے تو عابد پتھرائی آنکھوں، زرد رنگت اور اکڑے بدن کے ساتھ پلنگ پر لیٹا کسی ناگ کے مانند پھنکار رہا تھا۔ چھے ماہ کی عروشہ ساتھ ہی ننھی کلکاریاں مار رہی تھی جبکہ بھابی کونے میں کھڑی شوہر کے قریب آنے سے بھی خوفزدہ تھی۔

جب بھائی کو دورہ پڑا

ایک نوجوان کا دردبھرا قصہ جو بیٹھے بٹھائے مرگی جیسی موذی بیماری میں مبتلا ہو گیا

سراج دین

امی جان نے عابد کا سراپنی گود میں رکھ قرآنی آیات کا ورد شروع کر دیا۔ راقم نے ہاتھوں اور پیروں کی ہتھیلیاں رگڑیں اور بیگم نے اُس کے منہ سے بہنے والی جھاگ رومال سے صاف کی۔ باقی بہن بھائی "عابد، عابد" کہہ کر اُسے پکارنے لگے۔

مگر وہ تو کوئی جناتی مخلوق بنا ہوا تھا۔ اُس کی طاقت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ ہم تینوں بھائی عابد کے ہاتھ میں دبوچی بستر کی چادر کا پلو لاکھ کوشش کے باوجود نہ چھڑا سکے۔ امی جان مسلسل قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر اُس پر پھونکتی رہیں۔

تھوڑی دیر بعد اُس کی پتھرائی آنکھوں میں حرکت ہوئی اور وہ دیدے پھاڑ کر اپنے اردگرد کھڑے بہن بھائیوں، بیوی بچی اور ماں کو اجنبی نظروں سے دیکھنے لگا۔ پھر اپنے ہی کمرے کا انجان نظروں سے جائزہ لیا جیسے کسی پرائی جگہ آیا ہو۔ وہ ہر کسی پر قہر آلود نظریں ڈال رہا تھا جیسے ابھی چیر پھاڑ کے رکھ دے گا۔ سچی بات یہ ہے کہ پل بھر کو مجھے بھی اُس سے خوف محسوس ہوا۔ جو بھی اُسے پکارتا وہ اُس کی جانب یوں گھور کے دیکھتا جیسے کوئی ناآشنا ہو۔

خیر اللہ اللہ کر کے آہستہ آہستہ اُس کی طبیعت سنبھلی اور اہل خانہ کو پہچاننے کے قابل ہوا۔ اس دوران بڑے بھائی جو ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں، کمرے میں آئے اور عابد کی کیفیت اور حرکات دیکھ کر بے ساختہ اُن کے منہ سے نکلا "یہ مرگی کا دورہ ہے۔" یہ سنتے ہی آسیہ بھابی کو ٹھنڈے پسینے آ گئے اور وہ پلنگ ہی پر ڈھے گئیں۔ مجھے وہ شخص یاد آ گیا جو سرراہ اوندھے منہ سائیکل سے گرا اور زمین پر تڑپنے لگا۔ اُس کے منہ سے بھی جھاگ نکل رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کا ازدحام اکٹھا ہو گیا۔ کسی نے کہا بچارے کو مرگی کا دورہ پڑا ہے۔ اُس شخص میں بھی بے پناہ طاقت تھی جو کسی کے قابو نہیں آ رہا تھا۔ پھر کسی نے پشاوری چپل اُس کی ناک پر رکھ دی، تو تھوڑی دیر بعد وہ دورے کی کیفیت سے نکل آیا۔ کچھ خدا ترس اُسے ایک طرف بٹھا کر کندھے دبانے لگے تب کہیں وہ ہوش و حواس میں آیا۔ لیکن اس دوران بچارا خون میں لت پت بری طرح زخمی ہو چکا تھا۔ وہ بھی حیرانی کے عالم میں مجمعے کو دیکھ رہا تھا۔ پھر لوگ اُسے ڈاکٹر کے پاس مرہم پٹی

کرانے لے گئے۔

اتنے میں عابد ہوش میں آ چکا تھا۔ وہ اپنے اردگرد کھڑے بہن بھائیوں کو دیکھ کر کمرے میں آنے کی وجہ پوچھنے لگا۔ وہ قطعی بے خبر تھا کہ چند لمحے قبل وہ کس اذیت ناک کیفیت سے دوچار رہا ہے۔

خیر ڈاکٹر صاحب نے عابد کے لیے "تیگرال" کی گولیاں صبح دوپہر شام کھانے کو دیں اور تاکید کی کہ دوائی میں ناغہ نہیں ہونا چاہیے اور کھانے میں تمام بادی اور مرغن غذائیں استعمال کرنے سے منع کیا۔

مرگی کے دورے کی کیفیت سے نکلنے کے بعد وہ خاصی دیر سویا رہا اور جب بیدار ہوا تو بدن میں بے تحاشا درد محسوس کر رہا تھا جیسے کسی نے بُری طرح زدوکوب کیا ہو۔ کہتے ہیں گھر میں ایک بیمار ہو تو پورا خاندان متاثر ہوتا ہے۔ ہمیں اس بات کا ادراک عابد کی بیماری سے ہوا۔ گھر میں ہر وقت اُس کی بیماری ہی زیرِ بحث رہتی۔ عزیز و اقارب کو پتا چلا تو وہ ہمدردی بھی جتاتے اور توبہ توبہ کرتے کانوں کو ہاتھ لگاتے......

دراصل ہم دونوں بھائیوں کی شادی ۱۹۹۴ء میں بوجوہ خاندان سے باہر انجام پائی تھی۔ اس کی شادی کو ابھی دوسرا ہی سال تھا کہ اس پریشانی نے آلیا۔ کوئی تعویذ اور دم درود کا مشورہ دیتا' کوئی حکیمی علاج تجویز کرتا' کوئی ٹوٹکے آزمانے کو کہتا جس میں دورے کے دوران مریض کو چمڑے کی جوتی سونگھانا بھی شامل تھا۔ ایک مہربان نے عجیب و غریب ٹوٹکا بتایا کہ جب بھونچال آئے' تو کسی قدیم حویلی کے صدر دروازے کی چُول کی مٹی چٹکی بھر مریض کو کھلائیں۔ یہ مرگی کا تیر بہدف ٹوٹکا ہے۔ اب اُنھیں کون بتائے کہ بھائی جب زلزلہ آئے' تو انسان کو اپنی جان بچانے کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا؟

خیر ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہ دماغی خلل تھا' اس لیے کوئی دماغی دوا ہی اس کا علاج تھا جو مسلسل پانچ یا سات سال کھانی تھی۔ مختصر یہ کہ سبھی ہتھکنڈے آزمائے گئے۔ وقتی طور پر افاقہ محسوس ہوتا' لیکن پھر وہی دورے عود آتے۔

ہم سب حیران و پریشان تھے کہ بیٹھے بٹھائے اچانک اس مرض نے عابد کو کیونکر آن دبوچا۔ مگر بھابی کے والدین بدظن ہو گئے کہ ہم نے یہ بات اُن سے چھپائی کہ عابد مرگی کا مریض ہے ورنہ وہ کبھی اپنی بیٹی کا رشتہ نہ دیتے...... یوں عابد کے ساس سسر بھی بدگمانی دل میں لیے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے حالانکہ اس میں رتی بھر صداقت نہیں تھی۔

چند ماہ خیر خیریت سے گزرے اور عابد ریلوے کی طرف سے ملنے والے فلیٹ میں منتقل ہو گیا۔ پھر ایک دن آسیہ بھابی نے روتے ہوئے فون کیا اور بتایا کہ میں اکیلی عابد کو نہیں سنبھال سکتی۔ جب اُنھیں دورہ پڑتا ہے' تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ اکیلی نہیں رہ سکتی۔ میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ فلیٹ پہنچا' تو عابد دورے کی کیفیت سے نکل چکا تھا۔ البتہ اب بھی اُس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔

آسیہ بھابی نے بتایا کہ دورے کی حالت میں انھوں نے خود ہی اپنا ہونٹ کاٹ لیا تھا۔ بات چیت سے معلوم ہوا کہ موصوف نے اپنی مرضی سے دوائی کھانی چھوڑ رکھی تھی کہ دن بھر سستی اور طبیعت بوجھل رہتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے برہم ہوتے ہوئے کہا کہ روٹی کھاؤ یا نہ کھاؤ لیکن دوا ضرور کھانی ہے ورنہ کوئی بھی سنگین حادثہ پیش آ سکتا ہے۔ آسیہ بھابی کو بھی تاکید کی آپ عابد کی دوائی کا خیال رکھیں۔

وہ دن اور آج کا دن عابد نارمل زندگی گزار رہا ہے۔ عابد خود بتاتا ہے کہ دوائی کھانے کا یہ فائدہ ہے کہ دورہ پڑنے سے چند لمحے قبل ہی مجھے علم ہو جاتا ہے کہ کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے' لہٰذا میں فوراً حفاظتی تدبیر اختیار کرتا ہوں۔ مثلاً اگر موٹر سائیکل چلاتے ہوئے دورہ پڑنے کے آثار جنم لیں' تو میں مناسب جگہ بائیک کھڑی کر کے رک جاتا ہوں۔ جب وہ ساعتیں گزر جائیں' تب موٹر سائیکل چلاتا ہوں۔ پھر مسکرا کے کہنے لگا "میں جب پراٹھے روغنی نان یا بریانی وغیرہ پیٹ بھر کے کھا لوں' تو تھوڑی ہی دیر بعد دماغ بھاری ہونے لگتا ہے۔ پھر میں سمجھ جاتا ہوں کہ میں نے بدپرہیزی کی ہے۔"

سوانحی خاکہ

یہ غازی، یہ تیرے پُراسرار بندے

جنرل راحیل شریف

قائدانہ صلاحیتوں اور عمل پیہم سے وطن عزیز کو صرف پونے دو برس میں مضبوط و مستحکم بنادینے والے ہردلعزیز سپہ سالار پاکستان کی حیرت انگیز اور ڈرامائی داستان حیات

سید عاصم محمود

یہ اوائل جون ۲۰۱۴ء کی بات ہے۔ پاک بری فوج کے جنرل ہیڈکوارٹرز المعروف جی ایچ کیو میں ایک اہم میٹنگ منعقد ہوئی جس کی سربراہی پاک فوج کے چیف، جنرل راحیل شریف کر رہے تھے۔ یہ میٹنگ دہشت گردوں کے خلاف مجوزہ آپریشن، ضرب عضب کی تیاری کے سلسلے میں بلائی گئی تھی۔

اس میں پاک فوج XI کور کمانڈر، لیفٹیننٹ خالد ربانی بھی شریک تھے۔ اسی کور کے دو ڈویژنوں (۷ اور ۹) نے جنوبی وزیرستان میں دہشت گردوں کے ٹھکانوں پر ہلہ بولنا تھا۔ جب منصوبے پر غوروفکر شروع ہوا، تو خالد ربانی آرمی چیف سے مخاطب ہوئے:

"جناب! ضرب عضب میں ہمیں ایس ایس جی (اسپیشل سروسز گروپ) کمانڈوز کی دو بٹالینیں بھی درکار ہوں گی۔"

اس مطالبے کو تسلیم کرنا بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ وجہ یہ کہ کمانڈوز خاص قسم کے فوجی ہیں۔ ان کی عسکری و تنظیمی ضروریات عام فوجیوں سے بڑھ کر ہوتی ہیں۔ مزید برآں انھیں میدان جنگ تک پہنچانے اور پھر لڑانے میں اخراجات بھی زیادہ اٹھتے ہیں۔ علاوہ ازیں کئی کمانڈوز پہلے ہی فاٹا اور دیگر پاکستانی علاقوں میں پاکستان دشمنوں سے نبرد آزما تھے۔

درج بالا امور مدنظر رکھ کر جنرل خالد ربانی سوچ رہے تھے کہ ان کا مطالبہ شاید ہی پورا ہو۔ ان کی بات سن کر جنرل راحیل کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر انھوں نے ایس ایس جی کے جی او سی (جنرل کمانڈنگ آفیسر) کی طرف دیکھا اور پھر پُرعزم و پُریقین لہجے میں اپنے ساتھیوں سے گویا ہوئے:

"دو بٹالینیں کیا ہم تو پورا ایس ایس جی ڈویژن دینے کے لیے تیار ہیں۔ ہوائی جہاز، ٹینک، توپیں..... جو کچھ چاہیے، وہ آپ کو ملے گا۔ لیکن ہمیں یہ جنگ ہر حال میں جیتنی ہے۔"

میٹنگ میں بیٹھے سبھی جنرل جانتے تھے کہ تمام کمانڈوز کو جنوبی وزیرستان بھجوانا تقریباً ناممکن ہے، لیکن جنرل راحیل کے دو ٹوک اور فوری فیصلے نے انھیں بھی جوش و جذبے سے بھر دیا۔ وہ ذہنی و جسمانی طور پر آنے والی جنگ کا بھرپور مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ایک منفرد قول ہے: ''عظیم لیڈر وہ ہے جو دوسروں کو ساتھ لے کر چلے۔'' جنرل صاحب اس قول پر پورے اترتے ہیں۔

ان کے اس ایک فیصلے نے اعلیٰ عسکری کمان ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ عام فوجیوں پر بھی نہایت مثبت اثرات مرتب کیے۔ فیصلے پر عمل کرتے ہوئے جلد ہی ایس ایس جی کی دو بٹالینیں XI کور کے ہیڈکوارٹر پشاور پہنچ گئیں۔ یہ کمانڈوز پھر کور کے دونوں ڈویژنوں میں تقسیم کر دیے گئے۔

دہشت گردوں کے خلاف حالیہ جنگوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ عام سپاہ نے ایلیٹ کمانڈوز کو میدان جنگ میں شانہ بشانہ کھڑے پایا۔ اس منظر نے ان میں سیروں خون بڑھا دیا اور انھوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ دشمن کو سرنگوں کر کے رہیں گے۔ چناں چہ جوانوں نے دہشت گردوں پر ایسے زوردار حملے کیے کہ وہ دم دبا کر فرار ہو گئے۔

ایس ایس جی کمانڈوز کو بھی ضرب عضب میں شریک کرنے کا فوری فیصلہ جنرل راحیل شریف کی ذہانت، خوداعتمادی، دوراندیشی، دلیری اور حب الوطنی کا آئینہ دار ہے۔ حقیقتاً یہ ملک و قوم کی خوش قسمتی ہے کہ انتہائی نازک قومی موڑ پر ہمیں ایک بیدار مغز، عاقل اور سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے والا سپہ سالار نصیب ہوا۔

نومبر ۲۰۱۳ء میں جب نئے چیف آف سٹاف کے انتخاب کا مرحلہ آیا، تو پاکستانیوں کی اکثریت نے پہلی بار جنرل راحیل شریف کا نام نامی سنا۔ جب اُن کا اعلان ہوا تو سبھی کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ جنرل صاحب پاکستان کی آن پر جان قربان کر دینے والے میجر شبیر شریف کے بھائی ہیں۔

راحیل شریف ۱۶ جون ۱۹۵۶ء کو پہاڑیوں میں گھرے شہر کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ تب آپ کے والد، میجر محمد شریف کوئٹہ

چھاؤنی میں تعینات تھے مگر ان کا آبائی تعلق ضلع گجرات کے مشہور قصبے کنجاہ سے تھا۔ والدہ بھی نزدیک ہی واقع ایک اور معروف گاؤں لادیاں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی ایک رشتے دار بہن کا بیاہ میجر عزیز بھٹی سے ہوا تھا جنھوں نے جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء میں جام شہادت نوش کیا اور بہادری و جاں سپاری کی نئی داستاں رقم کی تھی۔

میجر محمد شریف ایک روایتی دیہی گھرانے کے سربراہ تھے جہاں بچے مسجد میں قرآن پاک پڑھ کر عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں۔ گھرانے کے بزرگ قول و عمل سے انھیں مذہبی آداب سکھاتے اور بلند کردار کے مالک شہری کی حیثیت سے پروان چڑھاتے ہیں۔ گھرانے کے سربراہ "کھلاؤ سونے کا نوالہ، دیکھو شیر کی نظر سے" والے مقولے پر یقین رکھتے تھے۔ مدعا یہی تھا کہ اولاد ادب و تہذیب کے دائرے میں رہے۔

جنرل راحیل کی والدہ، "امی جی"

اللہ تعالیٰ نے اس گھرانے کو تین بیٹوں اور دو بیٹیوں سے نوازا۔ پہلے خالدہ تولد ہوئی، پھر بیٹے شبیر شریف نے جنم لیا۔ بعدازاں ممتاز شریف، نجمی اور راحیل شریف دنیا میں آئے۔ ان بھی بہن بھائیوں کی تعلیم و تربیت اور کردار سازی مذہبی ماحول میں انجام پائی۔

اس زمانے میں ٹی وی نہیں تھا اور ریڈیو بھی خال خال سنا جاتا تھا لہٰذا شام کو بھی اہل خانہ ایک کمرے میں بیٹھ جاتے۔ تب والد یا والدہ بچوں کو سبق آموز کہانیاں اور واقعات سناتیں۔ پانچوں بچے انہی کہانیوں کے ذریعے اپنی عظیم مذہبی اور اخلاقی اقدار سے آگاہ ہوئے۔ انھوں نے جانا کہ راست بازی، رحم دلی، اعلائے کلمہ حق، انکسار اور سادگی اعلیٰ انسانی خصوصیات ہیں۔ یہی ایک انسان کا زیور ہیں اور بناؤ سنگھار بھی!

میجر محمد شریف اپنے دین اور وطن سے بہت الفت رکھتے تھے۔ انھوں نے یہی محبت اپنی اولاد میں کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ مشہور کالم نگار، عبدالقادر حسن ان کے جذبہ حب الوطنی کا ایک ایمان افروز واقعہ سناتے ہیں۔ وہ راوی ہیں:

میرے مرحوم چچا میجر شاہ جہاں نے نثار روڈ (لاہور کینٹ) میں گھر بنایا۔ حسن اتفاق سے ساتھ والے گھر میں میجر محمد شریف قیام پذیر تھے۔ جلد ہی دونوں دوست بن گئے اور اکٹھے جم خانہ کلب جانے لگے۔ میجر شریف ۱۹۷۱ء کے بعد لاہور منتقل ہو گئے تھے اور جم خانے میں وہ ذہنی ورزشوں والے مختلف کھیل کھیلا کرتے۔

ایک بار دونوں دوست جم خانے میں داخل ہوئے، تو دیکھا کہ سانحہ مشرقی پاکستان جنم دینے والا ایک کردار، جنرل نیازی وہاں بیٹھا ہے۔ اسے دیکھ کر میجر محمد شریف یک دم غصے میں آ گئے۔ کہنے لگے: "یہاں ایک ملعون اور منحوس شخص بیٹھا ہے۔ اگر وہ فوراً اٹھ کر نہ چلا گیا تو میں اُسے گولی مار دوں گا۔"

جنرل نیازی خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔ ایک شہید کے باپ کا یہ عمل بہت فطری اور توقع کے مطابق تھا۔

بچپن

میجر محمد شریف دشمنی اور شرپسندوں کے لیے فولاد تھے، تو دوستوں اور غربا سے نرمی و محبت سے پیش آتے۔ یہ شرافت کی ایک بڑی نشانی ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ

ہو حلقہ یاراں، تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو، تو فولاد ہے مومن

انھوں نے انہی خوبیوں سے اپنے بیٹوں کو بھی متصف کیا۔

ایک بار شبیر شریف موسم سرما میں نیا کمبل اوڑھے کسی غرض سے دکان گئے۔ واپسی پر دیکھا کہ ایک غریب سردی کے مارے ٹھٹھر رہا ہے۔ انھوں نے اسے نیا کمبل اوڑھا دیا اور کچھ رقم بھی دی۔ یہ واقعہ شہید کی رحمدلی کا عکاس ہے۔

دوسری طرف شبیر شریف شرپسندوں کی خوب خبر لیتے۔ جب بس میں سفر کرتے اور کوئی بدتمیز نوجوان بوڑھے کو نشست دینے سے انکار کرتا، تو وہ اسے جا دبوچتے اور نوجوان کو ایسا سبق سکھاتے کہ وہ ساری عمر یاد رکھتا۔ بگڑے نوجوانوں سے ان کی چند بار ہاتھا پائی بھی ہوئی۔

میجر محمد شریف اپنے دونوں بیٹوں کو تندرست و توانا رکھنے کی خاطر ان کے مابین باکسنگ کے میچ کراتے رہتے۔ ریفری خود بنتے، جبکہ اہل خانہ اور دوست احباب شبیر اور ممتاز کو بلہ شیری دیتے۔ ان مقابلوں نے دونوں بیٹوں کو میدان جنگ کی مشکلات اور سختیوں کا پامردی سے مقابلہ کرنے والا شیر دل بنا دیا۔

فوجی باپ کی قدرتاً خواہش تھی کہ ان کے تینوں بیٹے بھی پاک فوج کا حصہ اور ملک وقوم کی آن بان بنیں۔ اپنے فرماں بردار بندے کی رب کائنات نے دعا قبول فرمائی اور انھیں دنیاوی عزت بخشی جو بہت کم والدین کے حصے میں آتی ہے۔

بڑے فرزند میجر شبیر شریف کو پاک فوج کے سب سے زیادہ تمغے لینے والے شہید بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ نشان حیدر پانے اور وطن کی خاطر جان دینے والے یہ سورما رہتی دنیا تک اپنا نام سنہرے حروف سے لکھوا چکے۔ دوسرے بیٹے، ممتاز شریف بھی فوج میں بھرتی ہو کر کیپٹن کے عہدے تک پہنچے۔ افسوس کہ طبی وجوہ کی بنا پر انھیں قبل از وقت ریٹائرمنٹ لینا پڑی ورنہ وطن کی خاطر وہ بھی اپنی جان تک نثار کر دینے کی آرزو رکھتے تھے۔

بڑے بھائی کی نصیحت جب دونوں بھائی پاک فوج میں اپنی ذمے داریاں نبھا رہے تھے، تب تیسرے بھائی خاصے چھوٹے تھے۔ راحیل گھر میں "بوبی" کہلاتے اور سبھی کی آنکھوں کا تارا تھے۔ خاص طور پر بڑے بھائی، شبیر شریف انھیں بہت چاہتے تھے۔

بڑے بھائی کی حیثیت سے شبیر شریف کی یہی کوشش رہی کہ وہ چھوٹے بھائی کی نہایت اعلیٰ کردار سازی کریں اور انھیں ایک بااخلاق اور مضبوط کردار کے حامل مومن کی شکل میں ڈھال دیں۔ وہ وقت نکال کر اکثر راحیل کو خط لکھتے اور انھیں صحیح طرح زندگی گزارنے کے رنگ ڈھنگ بتاتے۔ انھوں نے چند بار بھائی کو ملٹری اکیڈمی کاکول بھی بلایا۔ دونوں بھائی پھر موٹر سائیکل پر کاغان اور ناران کی سیر کرنے نکل جاتے اور خوب سیر و تفریح کرتے۔

میجر شبیر شریف...... کسی شہری کی آمد سے بھی دن کانپ رہا ہے

محاذ جنگ پر جانے سے قبل ۲۹ نومبر ۱۹۷۱ء کو ٹیلی فون پر میجر شبیر شریف کی اہل خانہ سے آخری بار بات ہوئی۔ جب سبھی سے باتیں ہو چکیں، تو چھوٹے "بوبی" کی باری آئی۔ تب بڑے بھائی کی آواز میں پدرانہ شفقت عود کر آئی۔ انھوں نے پرامید لہجے میں راحیل سے کہا:

"مجھے یقین ہے، تعلیم مکمل کر کے تم بھی پاک فوج میں میرے پاس آ جاؤ گے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وطن عزیز کی حفاظت کرتے ہوئے میرا مشن ادھورا رہ گیا، تو ملک کو محفوظ بنانے کا خواب تم پورا کرو گے۔ یاد رکھنا، ایک سچا سپاہی جان کی پروا کیے بغیر اپنا مشن پورا کرتا ہے۔ جان دینا ایک سپاہی کی منزل ہے، مگر اس سے بھی بڑا کام یہ ہے کہ وہ اپنے حصے کی

ذمے داری پوری کر جائے۔"

حساس و ذہین بوبی نے اپنے بھائی سے وعدہ کیا کہ وہ ہر حال میں ان کا مشن پورا کریں گے۔ اگلے ہی ماہ ۶ دسمبر کو محبت کرنے اور ناز اٹھانے والے بھائی محاذ جنگ پر شہید ہو گئے۔ ان کی شہادت نے قدرتاً نوجوان راحیل کو بہت صدمہ پہنچایا۔ اسی واقعے نے انھیں بردبار اور سنجیدہ بھی بنا دیا' حالانکہ پہلے وہ خاصے شرارتی تھے۔ سب سے بڑھ کر شہید بھائی کے آخری الفاظ نوجوان کے لیے مشعل راہ بن گئے۔ ان کی بدولت انھیں اپنی منزل کا تعین کرنے میں مدد ملی..... یہ کہ ملک و قوم کی حفاظت' ترقی و خوشحالی کے لیے اپنا تن من دھن نچھاور کر دیا جائے۔

اس وقت پندرہ سالہ راحیل اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ انھوں نے میٹرک کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف اے کیا اور پھر فوج میں بھرتی کی درخواست دے دی۔ وہ شہید بھائی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان کا مشن پورا کرنا چاہتے تھے۔

حسن اتفاق

بااعتماد، مودب اور سنجیدہ نوجوان کو تمام روایتی امتحانات پاس کرنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی۔ وہ محنتی اور اپنے کام سے لگاؤ رکھنے والے نوجوان تھے۔ پھر والدین کی دعائیں بھی ان کے سر پر سایہ فگن تھیں' چناں چہ وہ عسکری تربیت کے لیے پی ایم اے، کاکول چلے گئے۔ راحیل شریف نے وہاں سے ۱۹۷۶ء میں گریجویشن کی اور اتفاق دیکھیے کہ ان کا پہلا تقرر فرنٹیر فورس رجمنٹ کی ۶ بٹالین میں ہوا۔ شہید شبیر شریف کی پہلی تقرری بھی اسی بٹالین میں ہوئی تھی۔

راحیل شریف تندہی اور جانفشانی سے اپنے فرائض انجام دینے لگے۔ وہ کام کو بے مقصد کلام پر ترجیح دیتے اور فارغ وقت تعمیری سرگرمیوں میں صرف کرتے۔ انھیں تیراکی بہت پسند ہے جو جسمانی اور ذہنی چستی کے لیے بہترین ورزش سمجھی جاتی ہے۔ مطالعے کے بھی شائق تھے اور ہر اچھی کتاب ضرور پڑھتے۔ بریگیڈیئر (ر) شوکت قادر ۱۹۷۶ء میں ۶ بٹالین کے کمانڈر تھے۔ عجب اتفاق کہ وہ شبیر شریف کے ساتھ تعلیم پا چکے تھے لہٰذا انھیں دونوں بھائیوں کی عادات و خصائل دیکھنے کا سنہرا موقع ملا۔ شوکت قادر اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں:

"میں جب کچھ عرصے میں راحیل شریف سے متعارف ہوا، تو مجھے بہت حیرت ہوئی۔ شبیر شریف جارحانہ مزاج کے حامل تھے اور مسائل کو خود دعوت دے ڈالتے' جبکہ میں نے راحیل کو نرم مزاج، عاقل اور دوستانہ طبیعت رکھنے والا نوجوان پایا۔ شبیر شریف جس تقریب میں جاتے، شمع محفل بن جاتے اور راحیل میں بھی ہم نے یہی کشش پائی' چناں چہ ۶ بٹالین کے بھی لوگ جو شبیر شریف سے لگاؤ رکھتے تھے، ان کی عزت کرنے لگے۔"

راحیل شریف کے سینئر بتاتے ہیں کہ وہ خاموشی سے اپنے کام کاج میں مصروف رہتے۔ جو ٹارگٹ بناتے، اسے بروقت حاصل کر کے رہتے۔ سخت محنت، خوش مزاجی اور بردباری کے باعث ہی وہ فوج میں ترقی کی منازل طے کرتے چلے گئے۔

خوش قسمتی کا ہما

پاک فوج نے بھی دل کھول کر اپنے اس ہونہار سپوت پر وسائل خرچ کیے اور راحیل شریف کو بہترین فوجی بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ جرمنی، کینیڈا اور برطانیہ کی اعلیٰ عسکری یونیورسٹیوں کے کورسوں میں شریک ہو کر جدید ترین جنگی اصول اور قوانین سے روشناس ہوئے۔

یہ جنرل راحیل شریف کی خوش قسمتی ہے کہ انھیں شعبہ عسکریات میں عملی اور نظریاتی، دونوں لحاظ سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ کبھی وہ عسکری کالج میں تختہ سیاہ کے سامنے طلبہ کو تعلیم دیتے نظر آتے ہیں اور کبھی ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بندوق سنبھالے اور سینہ تانے میدان جنگ میں دشمن کی راہ تک رہے ہیں۔

راحیل شریف کی زندگی جمود کا شکار نہیں ہوئی، بلکہ وہ عسکری شعبے کی دیگ میں موجود تمام چاولوں کا ذائقہ چکھتے رہے۔ اپنے وسیع تجربے اور سرد و گرم چشیدہ ذہانت کو وہ پی ایم اے (پاکستان ملٹری اکیڈمی) کاکول کے کمانڈر کی حیثیت سے بروئے کار لائے۔

ہر انسان کی زندگی میں ایسا لمحہ ضرور آتا ہے جسے انقلاب انگیز کہنا چاہیے۔ جنرل راحیل کی زندگی میں ایک ایسا ہی لمحہ ۲۰۰۲ء میں آیا۔ تب آرمی چیف جنرل پرویز مشرف بریگیڈیئر راحیل شریف کو اپنا ملٹری سیکرٹری مقرر کرنا چاہتے تھے اور ان کا تقرر نامہ بھی جاری ہو گیا۔

اسی دوران برطانیہ کے مشہور عسکری تعلیمی ادارے رائل کالج آف ڈیفنس اسٹڈیز سے ایک کورس کے لیے دعوت نامہ آیا۔ حسن اتفاق سے اس کورس میں شرکت کا قرعہ فال راحیل شریف کا نام نکل آیا۔ انھوں نے اپنے دوست احباب اور اہل خانہ سے مشورہ کیا۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ انھیں برطانیہ چلے جانا چاہیے۔ جنرل پرویز مشرف بھی اس تجویز سے متفق نظر آئے چنانچہ راحیل شریف برطانیہ سدھار گئے۔ یہ فیصلہ آگے چل کر ایک لحاظ سے خوشگوار ثابت ہوا۔ وجہ یہ کہ جنرل پرویز مشرف سے ایسی فاش غلطیاں سرزد ہوئیں جن کے باعث وہ متنازع ہوتے گئے۔ اگر ۲۰۰۲ء میں بریگیڈیئر راحیل شریف غیر مقبول ہونے والے جنرل مشرف کے ملٹری سیکرٹری بن جاتے تو ممکن تھا کہ مستقبل میں ترقی کی راہ مسدود ہو جاتی۔

ملک کے لیے اہم خدمات

راحیل شریف ایک سال برطانیہ میں مقیم رہے اور عسکری حکمت عملیوں کا گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کرتے رہے۔ کورس مکمل کر کے واپس آئے، تو کچھ عرصے بعد انھیں میجر جنرل کے عہدے پر ترقی دے کر پی ایم اے کاکول کا کمانڈر مقرر کر دیا گیا جو وطن عزیز میں مستقبل کے فوجی افسروں کو تعلیم و تربیت دینے والا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ اس کے کمانڈر کی حیثیت سے جنرل راحیل نے نصاب میں بنیادی تبدیلیاں کر کے اسے جدید عسکری خطوط پر استوار کیا۔ مزید برآں ملکی حالات کے پیش نظر نصاب میں نئے نظریات بھی متعارف کرائے۔

اس وقت تک قبائلی علاقہ جات میں پاک فوج مسلح باغیوں کے خلاف کارروائی شروع کر چکی تھی۔ یہ باغی پاکستانی قوم پر اپنے خود ساختہ نظریات ٹھونسنا چاہتے تھے۔ جب انھیں کامیابی نہ ہوئی، تو وہ پاکستان میں دہشت گردی پر اتر آئے۔ ہمارے دشمنوں نے اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھایا اور مالی لحاظ سے باغیوں کی سرپرستی کرتے رہے۔ جنرل راحیل نے پی ایم اے کاکول میں ''انسداد دہشت گردی'' (Counter-Insuragency) سے متعلق کورس نصاب میں متعارف کرائے۔ جن سے زیر تربیت جوانوں کو یہ سمجھنے میں مدد ملی کہ انجان جگہوں پر چھپے دہشت گردوں کا مقابلہ کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ نیز وہ یہ بھی جان گئے کہ کم شدت (Low-Intensity) والی جنگ کے کیا تقاضے اور اصول و ضوابط ہیں۔ یوں جنرل راحیل جوانوں کی نئی نسل کو دہشت گردوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرنے لگے۔ اور جب وہ کئی

سال بعد آگے چل کر کور کمانڈر گوجرانوالہ بنے، تو انھوں نے ہی پاک فوج میں پہلی بار انسداد دہشت گردی کی میدانی مشقوں کا آغاز کیا۔ مدعا یہی تھا کہ پاک فوج کے افسر اور جوان زیادہ مستعدی اور کامیابی سے دہشت گردوں کا مقابلہ کر سکیں۔ غرض انھوں نے عسکری چیلنجوں سے بخوبی نمٹنے کے لیے پاک فوج میں نئی سوچ متعارف کرائی۔

جنرل راحیل پی ایم اے میں تھے، تو انھیں لاہور کے تاریخی ۱۰ ڈویژن کا کمانڈر بنا دیا گیا۔ اسی ڈویژن کے جوانوں نے جنگ ستمبر ۶۵ء میں اپنی جانیں دے کر لاہور کی حفاظت کی تھی۔ بعدازاں وہ لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے پر ترقی پا کر گوجرانوالہ اور کوئٹہ میں کور کمانڈر مقرر ہوئے۔ گوجرانوالہ کور خاص طور پر بھارتی حملے کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے کھڑی کی گئی ہے چناں چہ بطور کور کمانڈر اپنی ذمے داریاں انجام دیتے ہوئے انھوں نے بھارتی عسکری حکمت عملیوں کا بغور مطالعہ کیا اور ان کا توڑ دریافت کرنے کے لیے شبانہ روز کام کرتے رہے۔

کوئٹہ میں بحیثیت کور کمانڈر انھیں افغان اور پختون راہنماؤں سے تال میل رکھنے کا موقع ملا۔ افغانستان میں دوست حکومت پاکستان کو مغربی سرحد کی طرف سے بےفکر رکھتی ہے اور اسی لیے پاکستان افغان معاملات میں دلچسپی لیتا اور لحظہ بہ لحظہ بدلتی صورت حال پر نظر رکھتا ہے۔

دہشت گردوں کا نظریاتی مقابلہ

گوجرانوالہ اور کوئٹہ میں تعیناتی سے جنرل راحیل شریف کو یہ بڑا فائدہ پہنچا کہ وہ بھارت اور افغانستان سے وابستہ اپنوں اور غیروں کی پالیسیاں نہایت جامع اور واضح انداز میں سمجھنے کے قابل ہو گئے۔ انھیں ادراک ہوا کہ دونوں پڑوسیوں سے تعلقات رکھنے کے ضمن میں کس قسم کی پالیسیاں تشکیل دینی چاہئیں۔ دو سال کور کمانڈر رہنے کے بعد جنرل راحیل کو انسپکٹر جنرل ٹریننگ اینڈ ایویلیوشن (Inspector General Training and Evaluation) بنا دیا گیا۔ اس عہدے کو پاک بری فوج کا چیف انسٹرکٹر یا استاد اول سمجھیے۔ اس نئی حیثیت میں بھی ان کے کارناموں کا تسلسل جاری رہا۔ یہاں عسکریات کا عملی اور نظریاتی تجربہ جنرل راحیل کے خوب کام آیا۔ نیا عہدہ سنبھالتے ہی انھوں نے ملک بھر میں پھیلے تمام ملٹری کالجوں میں انسداد دہشت گردی اور انسداد بغاوت کے کورس متعارف کرا

پاک فوج کے منفرد شہید

وطن پاک کی خاطر جان قربان کرنے والے میجر شبیر شریف ۲۸ اپریل ۱۹۴۳ء کو کنجاہ میں پیدا ہوئے۔ نوجوانی میں والد کے نقش قدم پر چلے اور ۱۹۶۴ء میں پاک فوج میں شامل ہوئے۔ دوران تربیت ''اعزازی تلوار'' (Sword of Honour) پانے کا اعزاز حاصل کیا۔

ابھی ۶ بٹالین میں پہنچے ہی تھے کہ ستمبر ۱۹۶۵ء میں جنگ چھڑ گئی۔ تب چھمب جوڑیاں کے محاذ پر بحیثیت لیفٹیننٹ انھوں نے داد شجاعت دی۔ ایک بار زخمی ہوئے، تو اسپتال پہنچ گئے مگر جذبہ حب الوطنی کی شدت کا یہ عالم رہا کہ وہاں چین سے نہ بیٹھا گیا اور فرار ہو کے واپس میدان جنگ جا پہنچے۔ شبیر شریف کی بہادری کو سراہتے ہوئے انھیں دوسرے بڑے جنگی اعزاز، ستارہ جرأت سے نوازا گیا۔

جنگ ۱۹۷۱ء برپا ہونے تک وہ میجر بن چکے تھے۔ ماہ دسمبر میں عسکری قیادت نے فیصلہ کیا کہ مغربی پاکستان سے بھارت پر حملہ کیا جائے۔ مقصد یہ تھا کہ بھارت کی توجہ مشرقی پاکستان سے ہٹی رہے۔ اس غرض سے ہیڈ سلیمانکی سے دھاوا بولنے کا پروگرام بنا۔

دیے۔ ایک جدت یہ اپنائی کہ "پیش تعیناتی تربیت" (Pre-Induction Training) کورس شروع کیا۔

پاک فوج کے جوان جب قبائلی علاقوں میں باغیوں سے لڑنے گئے، تو بیشتر جوانوں کو اجنبی تہذیب اور تمدن و ثقافت سے پالا پڑا۔ نتیجتاً انھیں علاقائی ماحول سے ہم آہنگی پیدا کرنے میں دشواری پیش آئی' مگر اب جو بھی جوان قبائلی یا پہاڑی علاقوں کی طرف جائیں، تو پہلے وہ پیش تعیناتی تربیت کورس مکمل کرتے ہیں۔ اسی کورس میں انھیں علاقے کی روایات تہذیب، جغرافیہ، لوک ریت وغیرہ غرض ہر ضروری بات کے متعلق بتایا جاتا ہے۔ اس کورس کی مدد سے جوانوں کو اب اجنبی ماحول سے مطابقت کرنے میں آسانی محسوس ہو رہی ہے۔ اس طرح جنرل راحیل شریف کے وضع کردہ کورسوں نے خصوصاً پاک بری فوج کے جوانوں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ پہلے سے زیادہ مہارت اور اعتماد سے دہشت گردوں کی بیخ کنی کر سکیں۔

بھارتی حکمت عملی کا توڑ

مقامی مسائل سے نمٹتے ہوئے جنرل راحیل بین الاقوامی نزاکتوں اور تقاضوں سے بھی بے خبر نہیں رہے۔ ان میں سرفہرست بھارت کی "کولڈ اسٹارٹ ڈاکٹرائن" ہے۔ ۲۰۰۱ء میں جب بھارتی پارلیمنٹ پر حملہ ہوا، تو بھارتیوں نے پاکستان پر حملے کرنے کا فیصلہ کیا' مگر بھارتی فوج نے تیاری میں تین ہفتے لگا دیے۔ اسی دوران بین الاقوامی دباؤ کارگر ثابت ہوا اور تصادم کسی قدر ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس ناکام تجربے کے بعد بھارتی جرنیل "کولڈ اسٹارٹ" کے نام سے ایک نئی عسکری حکمت عملی سامنے لائے جس کے تحت بھارتی افواج "اڑتالیس گھنٹوں" میں پاکستان پر محدود حملہ کرنے کی تیاری کر چکی تھیں.... ایک ایسا حملہ جس میں پاک افواج کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچ جائے، مگر ایٹمی ہتھیار چلانے کی نوبت نہ آئے۔ اس بھارتی حکمت عملی کا توڑ دریافت کرنے میں جنرل راحیل کی فراست اور تجربہ بہت کام آیا اور باہمی مشاورت سے وسیع پیمانے پر جنگی مشقیں شروع کی گئیں اور اس سلسلے کو "عزم نو" کا نام دیا گیا۔ اس منصوبے پر عمل کرتے ہوئے وطن عزیز کی بری اور فضائی افواج بھرپور انداز میں جنگی مشقیں کرنے لگیں۔ ان میں ہزار ہا جوانوں نے حصہ لیا۔ ان مشقوں کے ذریعے جوانوں کو یہ عملی تربیت ملی کہ وہ بھارتیوں کا برق رفتار حملہ کتنی خوبی اور مہارت

سلیمانکی سیکٹر پر بھارتیوں نے پہاڑی نما بند اور نہر بنا کر رکاوٹیں کھڑی کر رکھی تھیں۔ ٹینکوں سے لیس دو بٹالین بھارتی فوج اس علاقے کے دفاع پر مامور تھی۔ وہ بند "سیونہ" کہلاتا تھا جبکہ نہر پر بنے پل کو "گرم کھیڑا" کا نام دیا گیا تھا۔ یہ انسان ساختہ رکاوٹیں ہٹانا ضروری تھا تاکہ بھاری توپ خانہ اور ٹینک بھارتی علاقے میں داخل ہو سکیں۔ ان کی صفائی کا کام ۶ بٹالین کی دو کمپنیوں کو سونپا گیا۔ ایک کمپنی کی کمان میجر شبیر شریف کر رہے تھے۔ کمپنی میں ایک سو جوان شامل تھے۔ ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام میجر شبیر شریف نے جوانوں کی قیادت کرتے ہوئے بھارتی مورچوں پر بھرپور حملہ کیا۔ ہر حملے میں کمانڈر پیش پیش رہے اور بڑھ چڑھ کر دشمن کا مقابلہ کیا۔ قائد کی زبردست شجاعت نے دیگر جوانوں کو بھی جوش و جذبے سے معمور کر دیا اور وہ جان کی پروا کیے بغیر لڑتے رہے۔

ایک ایک کر کے بھارتی مورچے فتح ہوتے گئے۔ تمام رکاوٹیں عبور کر کے آخر کار پاکستانی جوان سیونہ بند پر جا پہنچے جو ان کی منزل تھا۔ اس کامیابی کے بعد پاک فوج کا پلہ بھاری ہو گیا' کیونکہ اب اونچائی سے بھارتیوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا آسان تھا۔ سیونہ بند دوبارہ حاصل کرنے کے لیے بھارتیوں نے پے در پے اٹھارہ حملے کیے' مگر ہمارے دلیر جوانوں نے ہر حملہ ناکام بنا دیا۔ ۵ دسمبر کی رات حملہ آور ایک بھارتی کمپنی کے کمانڈر میجر نارائن سنگھ نے اپنے مدمقابل

سے روک سکتے اور دشمن کو چھٹی کا دودھ یاد دلا سکتے ہیں۔ "عزمِ نو" جنگی مشقوں کو عملی جامہ پہنانے اور کامیاب بنانے میں جنرل راحیل شریف نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی عمدہ خدمات پر دوست احباب سے خوب داد پائی۔ یوں ان کی کامیابیوں اور کارناموں کے تاج میں ایک اور کلغی کا اضافہ ہوگیا۔

مقامی طالبان کا ظہور

اسی دوران پاکستان دشمن طاقتوں کے مالی سرمائے سے "تحریک طالبان پاکستان" کا ظہور ہوا۔ اس تحریک کے قائدین پاکستان میں اپنی پسند کا اسلام نافذ کرنا چاہتے تھے۔ پاکستانی طالبان پھر پاکستان بھر میں دہشت گردی کی کارروائیاں کرنے لگے اور قتل و غارت کا بازار گرم کیے رکھا۔ پاک افواج نے وقتاً فوقتاً تحریک طالبان کے خلاف فوجی آپریشن کیے۔ ان سے خاطر خواہ فائدہ بھی ہوا، مگر پاکستانی طالبان کی کمر نہ توڑی جا سکی۔ خاص طور پر وہ شمالی وزیرستان کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا کر وہاں سے مملکت پاکستان پر حملہ آور ہوتے رہے۔ اس وقت کے سربراہ فوج، جنرل پرویز کیانی کو خطرہ تھا کہ اگر شمالی وزیرستان میں آپریشن شروع کیا گیا، تو دہشت گرد شہروں میں بڑے پیمانے پر تباہی پھیلا سکتے ہیں۔ مختلف پہلوؤں پر سوچ بچار کرتے رہے اور عملی قدم نہ اٹھا سکے۔ آخر کار ان کی سبکدوشی کا وقت آ پہنچا۔ اب وزیراعظم پاکستان کو تین سینئر ترین جرنیلوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ رفقا سے مشاورت کے بعد ۲۳ نومبر ۲۰۱۳ء کو جنرل راحیل شریف پاک بری فوج کے پندرہویں سپہ سالار مقرر کیے گئے۔ ممکن ہے کہ جنرل صاحب کے انتخاب میں یہ خوبی مدنظر رکھی گئی کہ وہ غیر سیاسی ہیں اور اقتدار سنبھالنے کے عزائم نہیں رکھتے۔ اس وقت عام تاثر یہ تھا کہ جنرل راحیل شریف نے کسی لڑائی میں عملی طور پر حصہ نہیں لیا۔

نواز شریف حکومت جنرل پرویز مشرف کو غدار قرار دینے پر تلی بیٹھی تھی۔ جنرل راحیل نے سیاست دانوں کو سمجھایا کہ یہ وقت پاک فوج کی کردار کشی نہیں بلکہ اُسے حوصلہ دینے کا ہے۔ قوم حالتِ جنگ میں ہے اور پاک فوج کی کردار کشی سے دشمن فائدہ اٹھائے گا۔ یوں اپنے دلائل کی مدد سے جنرل راحیل نے حکومت اور فوج کے مابین مفاہمت اور ہم آہنگی کی فضا قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے دستاویزی ثبوتوں کے

میجر شبیر شریف کو دوبدو جنگ لڑنے کی دعوت دی۔ میجر شبیر شریف نے یہ چنوتی قبول کر لی۔ دونوں میجروں کے مابین زبردست باکسنگ میچ ہوا۔ میجر شبیر شریف ماہر مکے باز تھے۔ ان کا پلہ بھاری رہا اور اس لڑائی میں میجر نارائن سنگھ مارا گیا۔ بعدازاں نارائن سنگھ کو بھارتی حکومت نے جنگی اعزاز "ویر چکر" سے نوازا۔ بھارتی میجر کی پتلون کی جیب سے اہم عسکری دستاویزات برآمد ہوئیں۔

۶ دسمبر کی سہ پہر بھارتیوں نے ٹینکوں کے ذریعے بڑا حملہ کیا۔ جب چوکی کی توپ کا توپچی شہید ہوگیا، تو میجر شبیر شریف نے اس کی جگہ سنبھالی اور ٹینکوں پر گولوں کی بارش کر دی۔ ایک ٹینک تباہ ہوگیا۔ دوسرا نشانے پر تھا کہ اس سے پھینکا گیا گولہ میجر شبیر شریف کے قریب آ کر پھٹا۔ آپ نے اسی وقت شہادت کا عظیم درجہ پایا اور خدائے بزرگ و برتر کے حضور پیش ہوئے۔

حکومت پاکستان نے بعدازاں شہید کو نشان حیدر سے نوازا۔ میجر شبیر شریف کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ آپ نشان حیدر اور ستارہ جرأت پانے والے واحد فوجی افسر ہیں۔

●●●

ذریعے حکومت پر افشا کیا کہ بھارتی خفیہ ایجنسی "را" پاکستانی طالبان کی فنڈنگ کر رہی ہے اور بلوچستان میں فرقہ ورانہ فساد میں بھی ملوث ہے۔ ان حقائق نے وزیراعظم پاکستان کو چوکنا کر دیا اور وہ پھونک پھونک کر قدم رکھنے لگے۔

پچھلے سال کے آغاز میں جب حکومت نے تحریک طالبان سے گفت وشنید کا آغاز کیا، تو اسے جنرل راحیل کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ بدقسمتی سے ان مذاکرات کو ٹی ٹی پی کے لیڈروں نے حکومت کی بزدلی جانا اور اپنی لرزہ خیز کارروائیاں جاری رکھیں۔ جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، تو پاک فوج نے سیاسی جماعتوں کی حمایت سے شمالی وزیرستان میں "آپریشن ضرب عضب" شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۵ جون ۲۰۱۴ء کو فوجی آپریشن کا آغاز ہوا جو اب تک کامیابی سے جاری ہے۔ اس عسکری مہم نے تحریک طالبان کے گرد وہ دیومالائی ہالہ ریزہ ریزہ کر ڈالا جس نے انھیں ناقابل شکست بنا ڈالا تھا۔ بہادر فوج کے پے در پے حملوں سے طالبان اس طرح تتر بتر ہو رہے ہیں کہ اب شاید ان کے قدم جم نہیں سکیں گے۔ ان بزدلوں نے آخر پشاور میں بچوں کے اسکول پر وار کیا اور اپنی رہی سہی انسانیت بھی کھو بیٹھے۔ یہ جنرل راحیل شریف ہی ہیں جنھوں نے آپریشن ضرب عضب کی منصوبہ بندی اور عمل درآمد میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے اپنے ساتھی جرنیلوں کی اعانت سے ایسا جامع عملی منصوبہ بنایا کہ اس نے دہشت گردوں کے انفراسٹرکچر کا تار و پود بکھیر ڈالا ہے۔ یہ کامیابی پاکستانی جرنیلوں کے تجربے اور صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

پاک افواج کی شاندار فتح نے دوست دشمن سب پر آشکار کر دیا کہ وہ دنیا کی بہترین لڑاکا فوجوں میں شامل ہے۔ اس جیت نے جوانوں کے ساتھ ساتھ عوام کا بھی اعتماد بحال کیا اور قوم خوف اور دہشت کے اس منحوس حول سے نکل آئی ہے جو پچھلے آٹھ دس برسوں سے ملک پر مسلط ہوا تھا۔

"را" کے خلاف اعلان جنگ

دہشت گردی سے نمٹنے کے ساتھ ساتھ جنرل راحیل شریف پاکستان کے دوسرے اندرونی و بیرونی دشمنوں سے نبرد آزما ہیں۔ وہ پہلے کمانڈر انچیف ہیں جنھوں نے اعلان کیا کہ بھارتی خفیہ ایجنسی "را" پاکستان میں دہشت گردی کی پشت پر ہے چناں چہ اس کے ایجنٹوں اور کارندوں کو گرفتار کرنے کی کوششیں تیز کر دی گئیں۔ اب تک ہماری خفیہ ایجنسیاں پاکستان میں "را" کے کئی "سلیپنگ سیل" دریافت کر چکی ہیں۔ بھارتی حکمران کو منہ توڑ جواب دینے اور اسے آئینہ دکھانے کے بعد جنرل راحیل شریف تحریک آزادی کشمیر کی سمت بھی متوجہ ہوئے ہیں۔ واقعہ نائن الیون نے اس تحریک آزادی کو دہشت

کنجاہ سے لادیاں تک

گجرات سے پھالیہ کی سمت چلیں، تو گیارہ کلومیٹر بعد کنجاہ کا قصبہ نظر آنے لگتا ہے۔ یہ ایک تاریخی قصبہ ہے جو سکندر اعظم کے زمانے میں آباد ہوا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ کنج پال نامی راجا نے اس قصبے کی بنیاد رکھی تھی۔

مغل دور حکومت میں یہ قصبہ پھلا پھولا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے یہاں ایک مسجد تعمیر کرائی۔ دیگر حکمران بھی وقتاً فوقتاً کنجاہ میں عمارات تعمیر کراتے رہے جو تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔ قصبے کے باسی "کنجاہی" کہلاتے ہیں۔

کنجاہ کی پہلی مشہور شخصیت فارسی شاعر غنیمت کنجاہی تھے۔ ان کی مثنوی نیرنگ عشق نے بہت شہرت پائی۔ معروف پنجابی شاعر اور دانشور، شریف کنجاہی کا تعلق بھی اسی قصبے سے ہے۔

گردی کا روپ دے ڈالا تھا جس سے بھارتی حکومت کو بہت فائدہ پہنچا' مگر اب عالمی برادری دوبارہ تحریک آزادی اور دہشت گردی کے مابین فرق محسوس کرنے لگی ہے۔ جنرل راحیل شریف چاہتے ہیں کہ مقبوضہ کشمیر میں بھارتیوں سے نبرد آزما مجاہدین کی ہر ممکن اخلاقی' سفارتی اور سیاسی مدد کی جائے۔

بھارتی حکومت نے ظلم و جبر کے ذریعے ان سکھوں کو خاموش کر دیا تھا جو "خالصتان ریاست" کے حامی تھے۔ ماضی میں پاکستان ان سکھوں کی نظریاتی اور عملی حمایت کرتا رہا ہے۔ مشرقی پنجاب میں اب دوبارہ سکھ نوجوان تحریک خالصتان کو زندہ کر رہے ہیں اور بھارت پر دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔

افغانستان کے محاذ پر بھی جنرل راحیل نے بڑی سرگرمی دکھائی ہے۔ وہ کابل جا کر صدر اشرف غنی سے ملے تاکہ دونوں پڑوسی ممالک اختلافات اور غلط فہمیاں دور کر کے دوست بن جائیں۔ جنرل صاحب کی مثبت پالیسیوں کو چین اور امریکہ کے علاوہ تمام عالمی طاقتیں سراہ رہی ہیں۔

کرپشن کے خلاف آپریشن

پچھلے ۲۵ برس سے کراچی بدامنی کا شکار چلا آ رہا ہے۔ رفتہ رفتہ وہاں جرائم پیشہ گروہ بہت طاقتور ہو گئے اور خاص و عام سے بھتہ لینے اور اغوا برائے تاوان کا سلسلہ دراز کرتے تھے۔ اب روشنیوں کے شہر کی رونقیں لوٹانے کے لیے جنرل راحیل شریف سرگرم ہوئے۔ کراچی ویسے بھی وطن عزیز کی معاشی اور تجارتی شہ رگ ہے' لہٰذا وہاں امن و امان کی بحالی معاشی ترقی کی اوّلین شرط ہے۔ کراچی کو جرائم پیشہ گروہوں سے صاف کرنے کے لیے پچھلے سال سندھ رینجرز نے آپریشن شروع کیا۔ جسے سیاسی اور فوجی قیادت کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی۔ رینجرز نے بڑی سرعت سے بڑے مگرمچھوں پر ہاتھ ڈالے اور بلاتفریق سب مجرمانہ گروہوں کے تحت خلاف کارروائی کا سلسلہ شروع کیا۔ اس زبردست آپریشن کے نتیجے میں کراچی کی رونقیں خاصی حد تک واپس لوٹ آئی ہیں۔ بھتہ خور کافور اور اغوا کار قانون کی گرفت میں آ رہے ہیں اور کاروباری سلسلے پہلے سے زیادہ آزادی سے بزنس کر رہے ہیں۔

اسی دوران جنرل راحیل شریف کی ایما پر وفاقی و صوبائی حکومتوں میں پھیلی کرپشن کے خلاف بھی آپریشن شروع ہو چکا ہے۔ اس محاذ پر نیب' ایف آئی اے اور دیگر اینٹی کرپشن ادارے سرگرم عمل ہیں۔ جب سندھ کی صوبائی حکومت کے وزیر، مشیر اور سرکاری اہلکار بھی اسی مہم کی زد میں آئے' تو قائد پیپلز پارٹی فوج کے خلاف چیخ اٹھے اور دھمکی بھی دی کہ وہ جرنیلوں کے بھی پول کھول دیں گے جو نظرانداز کر دی گئی۔

کنجاہ کو نشان حیدر پانے والے، میجر شبیر شریف کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت ملی اور اس قصبے کو منفرد مقام حاصل ہوا۔ مقبول جنرل راحیل شریف بھی اسی قصبے سے آبائی تعلق رکھتے ہیں۔ کنجاہ کی موجودہ آبادی تقریباً پینتیس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔

کنجاہ سے آزاد کشمیر کی طرف چلیں، تو تقریباً پچاس کلومیٹر بعد لادیاں نامی قصبہ آتا ہے۔ شبیر شریف شہید اور جنرل راحیل شریف کی والدہ کا تعلق اسی قصبے سے تھا۔ وہ گھر میں "امی جی" کہلاتی تھیں۔ بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت میں شوہر کے ساتھ ساتھ انھوں نے بھی بھرپور حصہ لیا اور وطن کی خاطر جان تک قربان کر دینے والے بیٹے قوم کو دیے۔ ان کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند فرمائے!

امی جی کی ایک رشتے دار بہن میجر عزیز بھٹی شہید کی بیگم تھیں۔ کنجاہ اگر شبیر شریف کے ذریعے جانا گیا ہے' تو عزیز بھٹی شہید کی وجہ سے تاریخ پاکستان میں لادیاں بھی امر ہو گیا ہے۔

بڑے مگرمچھوں کے خلاف صوبہ سندھ میں آپریشن بھرپور انداز میں جاری ہے۔ امید ہے کہ صوبہ سندھ میں کرپٹ عناصر کا جلد خاتمہ ہو جائے گا اور قانون کی حکمرانی قائم ہوگی۔

یہ امر بہت خوش آئند ہے کہ کرپشن کے خلاف مہم کا دائرہ فوج تک بھی جا پہنچا ہے۔ جنرل راحیل شریف کے حکم پر تین ریٹائرڈ جرنیلوں کے خلاف چھان بین شروع ہوئی اور انھیں فرائض سے کوتاہی برتنے پر سزا سنا دی گئی ہے۔ اس واقعے نے پاکستانی عوام پر آشکار کر دیا کہ اب کوئی بااثر اور طاقتور شخصیت بھی قانون کے شکنجے سے نہیں بچ سکے گی۔

اسی دوران پاک چین اقتصادی راہداری کا عظیم الشان منصوبہ سامنے آیا۔ اس کی کامیابی کے لیے بھی جنرل راحیل شریف اپنے ساتھیوں سمیت تن من دھن کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ پاک فوج نے اعلان کیا ہے کہ راہداری کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے نیا ڈویژن کھڑا کیا جا رہا ہے جو دس ہزار تربیت یافتہ فوجیوں پر مشتمل اور منصوبے کی تکمیل تک چینی اور پاکستانی ملازمین کی سلامتی کا ذمے دار ہوگا۔

غرض چیف آف آرمی اسٹاف کا طاقتور اور بااختیار عہدہ سنبھالتے ہی جنرل راحیل شریف نے مختصر مدت میں ایسے دوررس اور انقلابی اقدامات کیے ہیں کہ صرف پونے دو برس میں پاکستان کی صورت حال بڑی حد تک بدل ڈالی ہے۔ ہماری خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ وہ نام و نمود سے بلند و ماورا ہیں اور قانون کے مطابق چلنا پسند کرتے ہیں۔ حلال کی کمائی مرغوب ہے، جبکہ سفارش سخت ناپسند۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی کے شفیق باپ ہیں۔ دونوں بیٹوں نے اپنے زور بازو سے ترقی کی ہے اور انہیں بھی والد کے عہدے سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی شخصیات کی آپ بیتیاں آشکار کرتی ہیں کہ بہت سے لوگوں نے حق اور قانون کی راہ پر چلتے ہوئے اپنے مشن کا آغاز کیا مگر جب وہ اقتدار میں آئے، تو جلد ہی خوشامدیوں اور نااہل مصاحبوں میں گھر کر جادہ حق سے ہٹ گئے اور آخرکار پھر عبرت ناک انجام سے دوچار ہوئے۔ امید ہے کہ جنرل راحیل ان شخصیات سے سبق سیکھتے ہوئے خوشامدیوں اور چاپلوسوں سے دور رہیں گے تاکہ اپنے مقصد حیات سے انصاف کر سکیں۔

قومی مسئلہ ہو یا بین الاقوامی معاملہ، جنرل راحیل بڑے مدبرانہ اور سپے تلے انداز میں انھیں حل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ان کی توانائی اور وقت ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے وقف ہے۔ جب وہ ستاتے ہوں گے، تو یقیناً ان کے ذہن میں اپنے عظیم بھائی کے الفاظ گونجنے لگتے ہوں:

"میرا مشن ادھورا رہ گیا، تو ملک کو محفوظ و مامون بنانے کا میرا خواب تم پورا کرو گے۔"

جنرل راحیل شریف تمام تر توانائیوں کے ساتھ اسی خواب کو عملی روپ دینے کے لیے ہمہ تن معروف ہیں۔ آئیے ایک خوشحال، مضبوط اور ترقی یافتہ پاکستان کی تشکیل میں فوج کا ہاتھ بٹائیں، جمہوری نظام کو شفاف بنائیں اور اپنے اپنے حصے کی شمع جلائیں۔ ہم اسی طرح اپنا اور اپنے بچوں کا مستقبل روشن بنا سکتے ہیں۔ کسی فلسفی نے کیا خوب کہا ہے:

"ماضی سے سبق سیکھیے، حال میں کام کرتے رہیے اور مستقبل کے سلسلے میں اچھی امید رکھیے۔ اہم بات یہ کہ خواب دیکھنا کبھی نہ چھوڑیے۔"

◆◆◆

پاک بھارت جنگ کا آنکھوں دیکھا حال

پہلی پاکستانی پی ایچ ڈی خاتون کی زبانی سترہ دنوں کا سنسنی خیز ماجرا

ڈاکٹر مریم الٰہی

میں پنجاب یونیورسٹی میں لیکچرار کے علاوہ لڑکیوں کے ہوسٹل کی وارڈن بھی تھی۔ ہوسٹل کے لیے یونیورسٹی کے اساتذہ ہی کو وارڈن مقرر کیا جاتا۔ ان دنوں لڑکیوں کے ہوسٹل کی عمارت زیرِ تعمیر تھی۔ چناں چہ عارضی طور پر یونیورسٹی کے رہائشی مکانات ہی ٹائپ کو ہوسٹل کی شکل دے دی گئی۔

پچھلی رات کا وقت تھا۔ میں اور ایک طالبہ ہوسٹل کی گیلری میں سو رہے تھے۔ اچانک طالبہ نے مجھے جگایا اور کہا "ڈاکٹر باجی ذرا سنیے، کتے کتنی آوازیں نکال رہے ہیں۔" لگتا تھا، وہ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر رو رہے ہیں۔ اچھی خاصی ڈراؤنی آوازیں تھیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ کبھی کبھی یہ ایسی آواز نکالتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد تڑاکا جہازوں کے اڑان کی آوازیں سنیں اور فکر ہوئی کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ دو روز سے کشمیر کے علاقے چھمب جوڑیاں میں بھارت سے جنگ ہو رہی تھی۔ توقع تھی کہ بھارت یہ جنگ ہماری سرحدوں تک نہیں لائے گا۔

صبح اٹھ کر ہم نے ناشتا کیا اور معمول کے مطابق اپنے اپنے شعبوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں شعبہ جغرافیہ اور طالبہ شعبہ کیمیا میں پہنچ گئی۔ یہ عمارت نئی نئی تعمیر ہوئی تھی۔ شعبے کا سارا سامان نیو کیمپس لایا جا چکا تھا۔ میں بکھرا سامان ٹھیک جگہ رکھوانے لگی۔ ساڑھے نو بجے کا وقت تھا کہ میرا ایک شاگرد پریشان حال میرے پاس آیا اور کہا کہ میڈم، بھارت نے

پاکستان پر حملہ کر دیا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ ایسی سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔

شاگرد نے بتایا کہ میڈم میں جس ٹیکسی میں آیا، اس میں خون لگا ہوا تھا۔ ٹیکسی والے نے بتایا کہ وہ باناپور سے آ رہا ہے۔ یہ سن کر تھوڑی سی پریشانی ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد ہوسٹل کی طالبہ ہانپتی کانپتی میرے پاس آئی اور اس نے بھی یہی خبر سنائی۔ مشرقی محاذ پر گھمسان کی جنگ ہو رہی ہے اور ہماری رینجرز فورس بڑی دلیری سے مقابلہ کر رہی ہے۔ یہ سن کر والہانہ طور پر میرے منہ سے نکلا "ہماری فوجیں کہاں ہیں؟"

تھوڑی دیر بعد ریڈیو پاکستان سے اعلان ہوا کہ فیلڈ مارشل ایوب خان گیارہ بجے کے قریب قوم سے خطاب کریں گے۔ ہمارے شعبے میں دو تین لوگوں کے پاس ریڈیو تھے۔ سب تقریر کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے اور ہمہ تن گوش تھے۔ تقریر بڑی مختصر تھی جس کا متن یہ تھا کہ دشمن نے بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بین الاقوامی سرحد پر جنگ چھیڑ دی ہے مگر اُسے یہ نہیں معلوم کہ اس نے کس قوم کو للکارا ہے۔ یہی وہ لمحہ تھا جو ساری قوم کو بیدار کر گیا اور قوم ایک سیسہ پلائی دیوار بن گئی۔ کیا افسر کیا ماتحت، کیا کسان کیا مزدور، تاجر، بچے، بوڑھے سب دشمن سے مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔

حملہ بڑا اچانک تھا اور ہماری فوجوں کو محاذ پر پہنچنے میں کچھ وقت لگا۔ محاذ پر پہنچ کر کئی مشکلات کا سامنا تھا۔ رانی توپ کے لیے مناسب جگہ نہ تھی، ایک بھوسے کے گڈ کی آڑ میں زمین میں گاڑی گئی۔ پہلا گولا ساڑھے گیارہ بجے کے قریب داغا گیا۔ دھماکے کی شدت سے کیمپس کی عمارتوں کے شیشے جھنجھنا اٹھے مگر یہ ارتعاش ہمارے حوصلے بلند کر گیا۔

گرمیوں کی تعطیلات ختم ہو چکی اور طالب علم آنے شروع ہو گئے تھے۔ جنگ شروع ہونے کے بعد کچھ اساتذہ اور طلبہ گھر واپس چلے گئے۔ میں اور میری ساتھی ہوسٹل واپس آ گئے اور ریڈیو سننے لگے۔ دوپہر کے وقت ریڈیو پاکستان سے خبروں کا سلسلہ بند ہو گیا جس پر بڑی گھبراہٹ ہونے لگی۔ یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں دشمن نے ہمارے ذرائع ابلاغ پر قبضہ تو نہیں کر لیا؟

خبروں کا سلسلہ منقطع ہونے سے خوف نے آن گھیرا۔ بزرگوں سے سنا ہوا تھا کہ ایسی مشکل گھڑی میں رب تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگی جائے۔ ہم نے وضو کیا اور صحن میں جائے نماز بچھا کر دو نفل ادا کرنے کی نیت باندھی۔ خدا جانے ہم نے کیا پڑھا، آنسو رکتے نہ تھے، رکوع سجود بھی کیا اور پھر مالک دو جہاں کے سامنے ہاتھ پھیلا دیے کہ مالک یہ ملک تیری دین ہے، تو ہی اس کی حفاظت فرما اور ہماری فوج کو فتح سے ہمکنار فرما۔ ان نوافل میں عجیب کیفیت طاری رہی، خودی، بےخودی اور حضوری!

دوپہر کا کھانا کھایا تو پریشانی کی وجہ سے کچھ معلوم نہ ہوا کہ کیا ذائقہ ہے۔ کان ریڈیو پر لگے تھے۔ آخر پچھلے پہر کوئی پانچ بجے ریڈیو سے خبریں آنا شروع ہو گئیں اور ہماری جان میں جان آئی۔ ریڈیو پاکستان نے یہ خبر دی کہ دشمن کی بمباری سے اسٹیشن کی عمارت کو نقصان پہنچا جس کی وجہ سے کچھ دیر کے لیے نشریات کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ اب یہ نشریات ملتان روڈ پر واقع ایک عارضی اسٹیشن سے آپ تک پہنچ رہی ہیں۔

باناپور اور اس کے گردونواح میں گھمسان کی جنگ جاری رہی اور ہوائی حملے بھی ہوتے رہے۔ حملے کے وقت ہوٹر بج جاتے کہ سب لوگ محفوظ جگہ پر رہیں اور باہر نہ نکلیں۔ جب ہوائی حملہ پسپا ہو جاتا تو دوبارہ ہوٹر بجتا جس کا مطلب تھا کہ اب آپ معمول کے کام کر سکتے ہیں۔ چھ ستمبر کو رات ہونے سے پہلے یہ اعلان کر دیا گیا کہ جنگ کے دوران پاکستان کے تمام شہروں میں بلیک آؤٹ رہے گا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر کالے کاغذ لگائیے یا کوئی ایسا انتظام کریں کہ روشنی کی کوئی کرن باہر نہ جائے۔ موم بتی یا لالٹین جلا کر کسی کونے میں رکھ دی جائے۔

میں اور میری ساتھی طالبہ نے ساری رات بے چینی سے

گزاری۔ خطرے کے وقت ہم نیچے راہداری میں بیٹھ رہتے۔ ۷ ستمبر کی صبح باورچی نے ناشتے کے لیے جگایا۔ وہ دن بھی اضطراب میں گزرا۔ شام کو اچھی خبریں آنے لگیں کہ دشمن کا حملہ ناکام بنا دیا گیا ہے اور بھارت کے بہت سے جنگجو قیدی بنا لیے گئے۔ جس راہ سے یہ قیدی لے جائے جا رہے تھے، لوگوں کا ہجوم انھیں دیکھنے سڑک کنارے جمع ہو جاتا۔

لڑکیوں کے اس ہوسٹل کے سامنے پانچ گھر پروفیسروں کے تھے۔ ایک کوٹھی میں رجسٹرار شاہ صاحب، دوسری میں میجر رفیع (ر) سربراہ ادارہ تعلیم و تحقیق، تیسری میں پروفیسر گیلانی سربراہ شعبہ نفسیات، چوتھی میں حمید صاحب سربراہ شعبہ تاریخ اور پانچویں میں پروفیسر امتیاز علی شیخ رہائش پذیر تھے۔ سات تاریخ کی شام ان لوگوں نے میٹنگ بلائی جس میں، میں بھی شامل ہوئی۔ یہ میٹنگ پروفیسر رفیع کے گھر ہوئی۔ سب نے فیصلہ کیا کہ اس مشکل وقت میں ایک دوسرے کی خبر گیری کرنا چاہیے۔ عورتیں اور بچے گھر کے سامنے باغیچے میں سوئیں اور مرد پچھلی طرف۔ یونیورسٹی کے یہ گھر آٹھ کنال پر محیط تھے اور وسیع برآمدے رکھتے۔

پروفیسر صاحبان نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم بھی ان کے ساتھ ہی رات گزاریں۔ وہ بہت ہی ہمدرد اور خلیق انسان تھے۔ میں اور ساتھی طالبہ سرِشام کھانا کھا کر میجر رفیع کے گھر چلے جاتے۔ رات کوئی مرتبہ ہوائی حملے کے وقت ہم گھر کی راہداری میں بیٹھ جاتے۔ صبح ہوسٹل واپس آتے۔ میجر صاحب کی بیگم بہت خوش مزاج اور مہمان نواز تھیں۔ ہم دونوں کو ناشتا کروا کر ہوسٹل آنے دیتیں۔

رات کو سب گھروں کے زیادہ تر لوگ ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے، ریڈیو سے خبریں اور نغمے سنتے۔ یہ پروگرام رات دس بجے تک جاری رہتے۔ آخری پروگرام اشفاق احمد کا 'سوسنار کی ایک لوہار کی' ہوتا۔ شیخ امتیاز نے یہ مشورہ دیا کہ چائے کا انتظام بھی ہو جائے، تو وقت اچھا گزرے گا۔ چائے کا انتظام میرے

کوئی کسی کو فعل پر طعنہ نہ دے

ایک چور نے ایک گداگر سے کہا، تجھے چاندی کے ایک جو برابر وزن کی گدائی کے لیے ہر چھوٹے بڑے کے آگے ہاتھ پھیلاتے شرم نہیں آتی؟ اس پر اس نے کہا کہ اتنی سی چاندی کے لیے ہاتھ پھیلانا اس سے بہتر ہے کہ لوگ تھوڑا سا مال چوری ہونے پر دوگنا کر کے کسی کے نام لکھوائیں۔

درسِ حیات:

۱۔ کسی کے برے اور گھٹیا پیشے پر اسے طعنہ نہ دیں،
۲۔ چوری کر کے کھانا، مانگنے سے ہزار درجہ بدتر ہے،
۳۔ کسی کی چوری کرنا اور نام دھرانا بہت بے عزتی ہے،
۴۔ چوری خواہ تھوڑے مال کی یا زیادہ، بہت ہی برا فعل اور گھٹیا حرکت بلکہ لعنت و پھٹکار ہے۔

(شیخ سعدی شیرازیؒ، انتخاب: عائشہ، لاہور)

ذمے ہوا کہ میرے پاس ہوسٹل کا باورچی خانہ تھا۔ سب نے دس دس روپے جمع کیے اور مجھے دے دیے۔ روز رات کو چائے پی جاتی۔ ریڈیو پاکستان کی نشریات شامل رہتیں۔ میڈم نور جہاں، نسیم بیگم اور مہدی حسن کے گائے نغمے جذبہ حب الوطنی دوچند کر دیتے۔ نغمے لکھنے والے تازہ کلام لکھتے اور موسیقار انھیں سرتال بخشتے، ایک سماں بندھ جاتا۔

میڈم نور جہاں نے جب یہ نغمہ گایا 'اے نی جرنیل نی کرنیل نی' تو سپاہیوں نے شکوہ کیا کہ ہمارے لیے کون سا نغمہ گایا گیا ہے؟ اس پر 'میریا ڈھول سپاہیا' والا نغمہ تخلیق کیا گیا۔

اسی اثنا میں ۱۰ تاریخ کو چونڈہ میں ٹینکوں کی تاریخی جنگ لڑی گئی۔ دشمن کی یلغار روکنے کے لیے نوجوانوں نے جسم کے ساتھ بم باندھ کر ٹینکوں کو اڑا دیا اور فتح پائی۔

مجھے تین دن اپنے گھر کی کوئی خبر نہ ملی کہ ٹیلی فون کی سہولت

میسر نہیں تھی۔ میرے والد کا گھر مصری شاہ میں تھا۔ چوتھے دن میں اور سب ہی طالبہ ٹیکسی میں سوار مصری شاہ روانہ ہوئے۔ راستے میں ابھی ہم وسن پورہ سے گزر رہے تھے کہ ہوائی حملہ ہوگیا۔ ہم سواری سے اتر ایک گھر کے تھڑے پر کھڑے ہوگئے۔

گھر والوں کو پتا چلا تو ہمیں اندر بلالیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ پڑتی رہی۔ آخر حملہ پسپا کردیا گیا اور ہم خیریت سے مصری شاہ پہنچ گئے۔ جب اپنے گھر کی گلی میں داخل ہوئے، تو عجیب نظارہ دیکھنے کو ملا۔ محلے کے سات آٹھ سالہ لڑکے دو ٹولیوں میں بٹے ہوئے اور ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے ڈنڈے تھے۔ ایک ٹولی بھارت اور دوسری پاکستان کی طرف سے لڑ رہی تھی۔ ڈنڈے ٹکرا رہے تھے، ٹک ٹک کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر پاکستان کی ٹیم جیت گئی اور لڑکوں نے نعرہ لگایا ''پاکستان جیت گیا، پاکستان جیت گیا۔'' یہ منظر دیکھ کر میں نے کہا کہ اس قوم کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

کشمیر کے محاذ سے بھی اچھی خبریں آرہی تھیں۔ سری نگر ہماری توپوں کی زد میں تھا مگر جانے کیا سازش ہوئی کہ کمانڈ تبدیل کردی گئی اور بھارت کو ۴۸ گھنٹوں کی مہلت مل گئی۔ یوں ہم نے کشمیر کھودیا۔

پنجاب یونیورسٹی کی انتظامیہ نے فیصلہ کیا کہ اساتذہ اور انتظامیہ کے لوگوں کو فوری طبی امداد کی تربیت دینی چاہیے۔ چناں چہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر باقاعدہ کلاس لینے لگے۔ ہم سب نے یہ تربیت حاصل کی۔ یونیورسٹی کی رہائشی کالونی میں ایک ڈاکٹر کی ہمہ وقت موجودگی کا بھی انتظام کردیا گیا۔

جنگ کے دوران عوام کا جذبہ بھی قابل قدر تھا سوائے امرا کے۔ وہ لوگ اپنی متاع عزیز زیور اور رقم لیے لاہور چھوڑ گئے۔ راوی کے پل پر گاڑیوں کی لمبی قطاریں دیکھنے کو ملیں۔ عام لوگ تو پاکستان ہی کو اپنی متاع تصور کرتے تھے۔ انھوں نے وہ دن بہت بے خوف ہو کر گزارے۔ ان ۱۷ دنوں میں کوئی چوری ہوئی نہ کوئی ڈاکا پڑا۔ سارے جرائم ناپید ہوگئے۔ یہ جذبہ حب الوطنی کی کرامت تھی کہ سب لوگوں نے کندھے سے کندھا ملا کر وقت گزارا۔ کاش اس جذبے کو جنگ کے بعد کوئی صحیح سمت دے دی جاتی۔

۱۷ دن کے بعد جنگ بندی ہوگئی اور رات کو روشنیوں سے شہر جگمگا گیا۔ طویل عرصہ تاریکیوں میں گزار کر یہ منظر بہت ہی دل خوش کن لگا۔

ہماری فوجیں کچھ عرصہ محاذ پر رہیں۔ سردیوں کی آمد کے پیش نظر فوجیوں کے لیے گرم کپڑوں کا انتظام کیا جانے لگا۔ ہمارے ہوسٹل میں اون بھیج دی جاتی اور سوئیٹر بنائے جاتے۔ چار لڑکیاں ایک دن میں ایک سوئیٹر بنا لیتیں۔ ہمیں پھر صابن، کنگھیاں اور دیگر اشیا مہیا کی گئیں کہ فوجیوں کے واسطے پیکٹ بنائے جائیں۔

میدان جنگ میں نوزائیدہ مملکت کی شیر دل افواج نے پاکستان کا دفاع کیا اور بھارت کے اچانک حملے کو پسپا کردیا مگر افسوس ہم مذاکرات میں جنگ ہار گئے۔ معاہدہ تاشقند ہمارے حق میں نہ تھا اور یہیں سے بھٹو اور جنرل ایوب خان کا اختلاف شروع ہوا۔

جنگ کے بعد یہ قوم بکھر گئی، مگر بھارت کی دشمنی نے کئی روپ دھار لیے اور ہمیں پتا بھی نہ چلا کہ پاؤں تلے سے زمین سرک گئی اور سقوط ڈھاکہ کا سانحہ پیش آیا۔

منصوبہ بندی قوموں کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ پاکستان کے حکمران صرف ''ڈنگ ٹپاؤ'' کی پالیسی پر عمل کرتے رہے جبکہ منصوبہ بندی کا خانہ خالی ہی رہا اور ابھی تک یہی حال ہے۔

پاکستان اللہ کی عطا ہے، وہی اس کی حفاظت کرتا چلا آرہا ہے۔ اس دیگ سے ہر کوئی مستفید ہوتا رہا ہے۔ دیگ بھی ایسی برکت والی ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتی اور نہ ہوگی ان شاء اللہ۔

(ڈاکٹر مریم الٰہی کو پی ایچ ڈی کرنے والی پہلی پاکستانی خاتون ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ نیز آپ ہی نے پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ جغرافیہ کی بنیاد رکھی اور اسے پروان چڑھایا۔)

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

ائیر وائس مارشل (ر)

فاروق عمر

جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء میں پے در پے حملوں سے دشمن کی سٹی گم کردینے والے دلیر مجاہد کا ولولہ انگیز قصہ حیات

ایم اے لودھی

پاکستان کی دھرتی اتنی زرخیز ہے کہ اس میں جنم لینے والے سپوت زندگی کے ہر شعبے میں اپنی خداداد صلاحیتیں منوا کر دنیا بھر میں وطن عزیز کا نام روشن کرتے آئے ہیں۔ یوں تاریخ کی کتابیں ایسے سپوتوں سے بھری پڑی ہیں لیکن اس وقت میں ایک ایسی ذہین، جرأت مند اور قائدانہ صلاحیتوں کی حامل شخصیت کا تعارف کروانا چاہتا ہوں جن کو دنیا ایئر وائس مارشل (ر) فاروق عمر کے نام سے جانتی ہے۔ ایئر وائس مارشل (ر) فاروق عمر کی تمام تر زندگی جہد مسلسل سے عبارت ہے۔ لڑکپن ہی سے ان کی اٹھان دوسرے بچوں سے یکسر مختلف اور برتر تھی۔ آگے بڑھنے کا جذبہ، ستاروں پہ کمندڈالنے کا عزم، دنیا بھر میں وطن عزیز کا نام بلندیوں پر پہنچانے کا ارادہ انھیں دوسرے تمام "ہیروز" سے ممتاز اور منفرد بناتا ہے۔ ایئر وائس مارشل (ر) فاروق عمر پاکستان ایئر فورس کے وہ عظیم ہیرو ہیں جنھوں نے نہ صرف ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں بھارتی فضائیہ کو اپنی جرأت اور بہادری کے طفیل ناقابل تلافی نقصان پہنچایا بلکہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں بھی انھوں نے کئی بھارتی جنگی جہازوں کو مار گرا کے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ اس جرأت اور بہادری کے صلے میں انھیں نہ صرف ہلال امتیاز (ملٹری)، ستارہ جرأت، ستارہ امتیاز (ملٹری) بلکہ تمغہ بسالت سے بھی نوازا گیا۔ اتنے اعزازات حاصل کرنا شاید ہی کسی اور شخص کے نصیب میں لکھا ہو۔

گزشتہ دنوں ایئر وائس مارشل (ر) فاروق عمر بطور خاص اردو ڈائجسٹ کے دفتر واقع ۳۲۵۔جی تھری جوہر ٹاؤن لاہور تشریف لائے۔ اردو ڈائجسٹ کے ایگزیکٹو ایڈیٹر جناب طیب اعجاز قریشی، محمد اسلم لودھی اور غلام سجاد کے ساتھ تقریباً دو گھنٹے پر مشتمل طویل نشست ہوئی جس میں سابق ایئر وائس مارشل فاروق عمر نے اپنی زندگی کے مختلف گوشوں، مختلف شعبوں اور میدان جنگ میں ہونے والی کامیابیوں کی داستان سنائی۔ پُراثر اور ذہنوں کو مبہوت کر دینے والی یہ داستان ہر محب وطن پاکستانی کے لیے مثال اور اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو ڈائجسٹ کے قارئین کے لیے یہ داستان شجاعت پیش خدمت ہے۔

☆☆

فاروق عمر ۲۴ جولائی ۱۹۴۱ء کو فیصل آباد کے محلہ طارق آباد کے ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ دینی تعلیم اپنی والدہ ماجدہ اور مسجد نور کے امام سے حاصل کی۔ پانچویں تک آپ برن ہال (Burn Hall) گرامر پبلک اسکول ایبٹ آباد میں زیر تعلیم رہے۔ مزید تعلیم کا حصول آپ کو لاہور کے مشہور سینٹ انتھونی ہائی اسکول لے آیا۔ نمایاں پوزیشن حاصل کرنے کے بعد آپ سنٹرل ماڈل اسکول لاہور میں داخل ہوئے۔ وہاں سے میٹرک کا امتحان ہائی فرسٹ ڈویژن سائنس گروپ میں پاس کر کے عظیم تعلیمی درسگاہ گورنمنٹ کالج لاہور پہنچے۔ دوران تعلیم ایک ساتھی طالب علم ایئر فورس کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا جسے دیکھ کر آپ نے بھی تیاری شروع کی۔ وہ تو ایئر فورس کے امتحان میں کامیاب نہ ہو سکا لیکن آپ آئی ایس ایس بی میں بہترین گریڈ حاصل کر کے پاکستان ایئر فورس میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۵۷ء میں آپ رسالپور اکیڈمی پہنچے۔ جون ۱۹۶۰ء میں گریجوایشن کے وقت بیک وقت Sword of Honor, Best Pilot Trophy and Academics Trophy حاصل کی جو ایک ریکارڈ ہے۔ جنگی مہارت کے کئی کورسز مکمل کیے جن میں Fighter Leader School, Masoor Base Karachi ۱۹۷۱ء میں Top Gun Award بھی حاصل کیا۔ گریجوایشن کے بعد اور ان کورسوں کے بعد آپ سکوارڈن نمبر ۵ (Number 5 Fighter Squadron) سے منسلک ہو گئے۔ ابتدائی دنوں میں آپ کراچی شفٹ ہو گئے۔ جہاں ان دنوں "رن آف کچھ" کے محاذ پر بھارتی فوج پاک سرزمین پر یلغار کر رہی تھی۔ وہاں پاک فوج کی مدد کا فریضہ آپ کے سکوارڈن کو سونپا گیا۔ آپ نے اسٹار فائٹر کی حیثیت سے کئی فضائی مشن کامیابی سے مکمل کیے اور بھارتی فضائیہ کو جنگ میں مداخلت سے باز رکھا۔ ایک طرف پاک فوج دشمن کے چھکے چھڑا رہی تھی، تو دوسری جانب پاکستان ایئر فورس کے غیور ہواباز اپنی جرأت اور مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے بھارتی ایئر فورس کا ناطقہ بند کیے ہوئے تھے۔

معرکہ "رن آف کچھ" میں کامیابی کے بعد آپ کو سرگودھا میں پرتعینات کر دیا گیا۔ وہاں آپ کو ایک دلیر اور بہترین لڑاکا ہواباز کی شکل میں کمانڈر انچیف ایئر مارشل نور خان کی سرپرستی میں دفاع وطن کے تقاضے پورے کرنے کا موقع ملا۔ ایئر مارشل نور خاں نہ صرف بہادر انسان تھے بلکہ فلائنگ کے بے حد شوقین اور خطرات سے بے نیاز دشمن پر جھپٹنے کا پختہ عزم رکھتے تھے۔ ایک دن ایئر کموڈور ڈوگر (ستارۂ جرأت) نے حکم دیا کہ فاروق کشمیر میں حالات تیزی سے خراب ہو رہے ہیں، کسی بھی وقت تمھاری ضرورت وہاں پڑ سکتی ہے۔ چناں چہ ذہنی طور پر کسی بھی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہو۔

آپ تو پہلے ہی ایسے مواقع کی تلاش میں تھے جہاں بھارتی ایئر فورس کے ساتھ دو دو ہاتھ کیے جا سکیں۔ انھی دنوں کشمیر میں ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔ جنرل اختر علی ملک بھارتی فوج کو شکست فاش دیتے ہوئے جب کشمیر کی طرف اکھنور سیکٹر

میں تیزی سے پیش قدمی کر رہے تھے، تو بھارتی فضائیہ کے جنگی طیاروں نے ان پر حملہ کر دیا۔ جونہی حملے کی اطلاع سرگودھا ائیر بیس پہنچی، تو سکواڈرن لیڈر سرفراز رفیقی اور فلائٹ لیفٹیننٹ بھٹی نے ایف ۸۶ میں جا کر نہ صرف چاروں بھارتی طیاروں کو مار گرایا بلکہ پاک فوج کو فضائی چھتری بھی فراہم کر دی۔ پھر ہائی کمان کی جانب سے جنرل اختر علی ملک کو روک کر جنرل محمد یحیٰی خان کو اکھنور کی جانب پیش قدمی کرنے کا حکم جاری ہوا۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اکھنور بھارتی فوج کی وہ شہ رگ ہے اگر اسے دبا دیا جائے، تو سارا کشمیر پلیٹ میں رکھ کر پاکستان کی گرفت میں آ سکتا۔ چناں چہ حکمت عملی کے تحت اکھنور پر قبضے کو ضروری سمجھا گیا۔

اس وقت کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کے بقول امریکا نے پاکستان کو یقین دہانی کروائی تھی کہ کسی بھی حالت میں بھارتی فوج بین الاقوامی سرحد عبور نہیں کرے گی۔ اس یقین دہانی کے بعد ہی آپریشن جبرالٹر پر عمل درآمد شروع کیا گیا اور پاکستان ائیر فورس کو بین الاقوامی سرحدوں سے ہٹا کر کشمیر میں اکھنور کی جانب منتقل کر دیا گیا۔ لیکن جب بھارتی فوج کو اکھنور سیکٹر میں واضح شکست دکھائی دی اور کشمیر ہاتھ سے نکلتا محسوس ہوا تو کسی اعلان کے بغیر بھارتی فوج نے پاکستان کے دل لاہور پر رات کے اندھیرے میں صبح چار بجے ایک ڈویژن فوج سے حملہ کر دیا۔ اس حملے کا مقصد یہ تھا کہ صبح دس بجے سے پہلے پہلے لاہور پہنچ کر بھارتی جرنیلوں نے لاہور جم خانہ کلب میں جام سے جام ٹکرانے اور پاکستان کو کشمیر میں پیش قدمی کا سبق بھی چکھانے کا عہد کیا تھا۔ واہگہ سرحد پر بھارتی فوج کا حملہ قطعی اچانک تھا۔ سرحد پر باقاعدہ فوج موجود نہ تھی۔ رینجر کے چند جوان ڈیوٹی پر مامور تھے جن کے لیے بھارتی ڈویژن فوج کو روکنا ممکن نہ تھا چناں چہ وہ پے در پے شہادتوں کے جام پیتے رہے اور ان کا لہو پاک سرزمین کی مٹی میں جذب ہو کر پاکستانی قوم کو نئی توانائی بخشتا رہا۔ آپ نے مزید گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ ابھی جنگ کا بین الاقوامی سرحدوں پر آغاز نہیں ہوا تھا لیکن حفظ ماتقدم کے طور پر ۵ ستمبر ۱۹۶۵ء کو مجھے ائیر ڈیفنس کی جانب سے حکم ملا کہ میں امرتسر شہر کے اوپر سپر سونک (Super Sonic) دھماکا کروں اور دشمنوں کے دلوں پر دہشت و ہیبت بٹھا دوں۔ اس دھماکے کا واحد مقصد یہ تھا کہ بھارتی ائیر فورس کو بتا دیا جائے کہ پاکستان ائیر فورس مقابلے کے لیے تیار ہے۔ جب میں ۱۰ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتا ہوا سرگودھا سے لاہور پہنچا، تو میری رفتار ۵۴۰ ناٹ تھی۔ میں آہستہ آہستہ نیچے آتا چلا گیا تاکہ امرتسر کا ریڈار (Radar) مجھے دیکھ نہ سکے۔ پھر جیسے ہی میں نے ۹۰ ڈگری پر سرحد عبور کی، تو امرتسر شہر میرے سامنے تھا۔ میں نے Full after Burner آن کر کے ۲۰۰ فٹ کی بلندی پر جہاز کی رفتار بڑھائی اور امرتسر کو نشانہ بناتے ہوئے تقریباً ۲۵۰ فٹ کی بلندی پر امرتسر شہر کے اوپر پرواز کی۔ اس دوران امرتسر ائیر فیلڈ پر نصب بھارتی توپوں نے مجھے مارنے کی کوشش کی، لیکن ان کے گولے میری تیز رفتاری کی وجہ سے میرے پیچھے رہتے رہے۔ سپر سونک بوم نے بہت دہشت پھیلائی اور اردگرد کی عمارتوں کے شیشے توڑ دیے، مٹی کا طوفان پیدا ہوا، گاڑیاں الٹا دیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ مشن مکمل کرنے کے

ہمارے دو عظیم جنگی ہیرو..... ایم ایم عالم اور فاروق عمر

بعد مجھے آرڈر ملا کہ دوبارہ سیکنڈ اٹیک کرو! لہٰذا جب میں حملہ کرنے کے لیے مڑا، تو میں نے دیکھا کہ اس دفعہ بھارتی توپیں میرے لیے تیار تھیں اور انھوں نے ایک توپ کے گولوں کی چھتری بچھائی ہوئی تھی، آسمان سرخ تھا اور گزرنے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ لیکن میں اللہ کا نام لے کے اُن گولوں کی چھتری میں گھس گیا اور گولے میرے اوپر، نیچے، میرے دائیں، بائیں سے گزرتے رہے۔ لیکن میں نے پروانہ کی اور اپنا مشن مکمل کیا۔ (جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے) مشن مکمل کرنے کے بعد اپنی رفتار میں اضافہ کرتے ہوئے سرگودھا کا رخ کیا اور بھارتی ایئرفورس کی مداخلت کے بغیر میں بحفاظت سرگودھا لینڈ کر گیا، تو میں نے آل انڈیا ریڈیو پہ سنا ''آج پاکستان کے آٹھ سیبر طیاروں (Sabre jets) نے راکٹ اور گنز کے ساتھ امرتسر پہ حملہ کیا۔ جبکہ اصل میں، میں ایک تنہا اسٹار فائٹر تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بھارتی سونک بوم کی وجہ سے بوکھلا گئے اور یہ بھی ظاہر ہوا کہ وہ بزدل ہیں۔ ۶ ستمبر کو جب بھارتی فوج نے لاہور کے محاذ پر حملہ کیا، تو سرحد خالی ہونے کی بنا پر بی آر بی تک پیش قدمی کرتے پہنچ گئی۔ انھیں اس وقت ہڈیارہ ڈرین بیدیاں روڈ کی جانب میجر شفقت بلوچ کی کمپنی نے ۱۰ گھنٹے تک روکے رکھا۔ برکی واہگہ اور سائفن کا علاقہ خالی تھا جہاں پاک فوج کا کوئی جوان موجود نہیں تھا۔ جب حملہ ہوا، تو میجر عزیز بھٹی کی قیادت میں بی آر بی کے کنارے ہنگامی طور پر مورچے کھود کے پاک فوج کے جوان جنگ میں مصروف ہو گئے۔ جبکہ سائفن کی جانب میجر حبیب اپنے ساتھیوں کے ساتھ بھارتی فوج کی پیش قدمی روکنے کے لیے پہنچ چکے تھے۔

میجر عزیز بھٹی نے بی آر بی پر مورچہ بندی کر لی، تو میجر شفقت بلوچ اپنے جوانوں سمیت پیچھے آ گئے لیکن انھوں نے صرف ۱۱۰ جوانوں سے پورے بھارتی بریگیڈ کو دس گھنٹے تک روک کے دنیا کی عسکری تاریخ میں اپنا نام سنہرے لفظوں سے لکھوا لیا جن کو دو مرتبہ ستارہ جرأت عطا کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی تائید و حمایت اور پاک فوج کے افسروں اور جوانوں نے ۶ ستمبر کو اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے بھارتی فوج کا لاہور پر قبضے کا ابتدائی خواب چکنا چور کر دیا۔ اب باقاعدہ جنگ شروع ہو چکی تھی۔ پاکستان ایئرفورس بھی باقاعدہ جنگ میں کود پڑی۔ ونگ کمانڈر سجاد حیدر سیبر فائٹر جہازوں کے ساتھ پٹھان کوٹ کے ہوائی اڈے پر حملہ آور ہوئے۔ اس حملے میں عباس خٹک، دلاور حسین بھی شریک تھے جو بعد میں ایئر چیف مارشل اور ایئر مارشل کے عہدوں تک پہنچے۔

پٹھان کوٹ کے ہوائی اڈے پر روسی مگ ۲۱ جنگی جہاز حملے کے لیے تیار کھڑے تھے جو روس نے بطور خاص بھارت کو دیے تھے۔ یہ جدید ترین سہولتوں سے آراستہ جہاز پاکستان ایئرفورس کے پاس موجود جنگی جہازوں سے کہیں زیادہ موثر، متحرک اور فن حرب میں اپنی مثال آپ تھے۔ اسی لیے ہائی کمان کی جانب سے حکم دیا گیا کہ پٹھان کوٹ پر روسی مگ طیاروں پر حملہ کر کے انھیں اڑنے سے پہلے ہی راکھ کا ڈھیر بنا دیا جائے۔ ہمارا یہ مشن بہت کامیاب رہا اور پاکستان ایئرفورس کے طیاروں نے پٹھان کوٹ ایئر فیلڈ پر روسی مگ ۲۱ جہازوں کو تباہ کر دیا۔ یہ جارحانہ حملہ بھارتی ایئرفورس کے لیے بڑے صدمے کا باعث تھا۔

اس کامیاب حملے کے بعد بھارتی جہازوں نے سرگودھا پر حملہ کیا۔ جہاں میں اور فلائٹ لیفٹیننٹ عارف اقبال ایف ۱۰۴ اسٹار فائٹر میں پہلے ہی فضا میں موجود تھے۔ دوسری جانب خطرے کو بھانپتے ہوئے سکواڈرن لیڈر ایم ایم عالم بھی اپنے ساتھی ہوا باز سمیت فضا میں نمودار ہو گئے۔ جونہی بھارتی جہاز سرگودھا کی حدود میں داخل ہوئے، تو اینٹی ایئر کرافٹ گنوں نے فائر داغنے شروع کر دیے۔ ریڈار چینل پر ایم ایم عالم ہم سے پہلے بھارتی جہازوں کے تعاقب میں پہنچ چکے تھے۔ وہ شعلے اگلتی اینٹی ایئر کرافٹ گنوں کی پروا نہ کرتے ہوئے بھارتی

طیاروں پر جھپٹ پڑے اور دو منٹ کے اندر اندر پانچ بھارتی جہاز مار گرائے۔ یہ بھارتی ایئر فورس کا آدم پور اور ہلواڑہ سے پہلا جارحانہ حملہ تھا جو بری طرح ناکامی سے ہمکنار ہوا۔

اس فارمیشن کی ناکامی کے بعد مزید بھارتی جہازوں نے سرگودھا ائیر بیس پر کھڑے دو پاکستانی جنگی طیاروں پر حملہ کر دیا۔ ان میں سے ایک جہاز تباہ ہو گیا جبکہ دوسرا محفوظ رہا۔ جوابی کارروائی کے لیے میں نے ساتھی ہواباز کے ساتھ بھارتی طیاروں کا تعاقب کیا لیکن وہ اپنے اڈوں پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر چھے کینبرا بھارتی بمبار جہازوں نے رات کے اندھیرے میں یلغار کی، تو ان کے ساتھ آنکھ مچولی چلتی رہی لیکن جب بھی ہم ان کو اپنی گرفت میں لا کر تباہ کرنے لگتے، تو وہ نہایت آسانی سے ہمارے چنگل سے بچ نکلتے۔ اس واقعے اور گہری سوچ بچار کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ بھارتی جنگی طیاروں کو امرتسر ریڈار سے راہنمائی ملتی ہے۔ یہ ہیوی ڈیوٹی ریڈار Russian 3D روس نے بھارت کو دیا تھا۔ ہائی کمان نے فیصلہ کیا کہ اس روسی ریڈار کو ہر صورت تباہ کیا جائے تاکہ پاکستان پر حملے کی غرض سے آنے والے بھارتی طیاروں کو اس ریڈار سے راہنمائی نہ مل سکے اور حملے سے پہلے ہی ہم ان کی گردن دبوچ سکیں۔

ریڈار پر حملے کے لیے ونگ کمانڈر انور شمیم (بعد میں چیف آف ائیر اسٹاف) فلائٹ لیفٹیننٹ منیر الدین احمد، فلائٹ لیفٹیننٹ سیسل چودھری اور اسکوارڈ امجد حسین پر مشتمل فضائی سرفروشوں کے قافلے نے سرگودھا سے پرواز کی۔ یہ کارروائی اس قدر جارحانہ انداز میں کی گئی کہ بھارتی فضائیہ کو مقابلے کی جرأت نہ ہوئی اور امرتسر کے روسی ریڈار کو مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا جس کے بعد بھارتی فضائیہ یتیم ہو کر رہ گئی۔ اب اکثر بھارتی ہواباز اپنے ہوائی اڈوں سے حملے کی غرض سے اڑتے ضرور لیکن وہ حملہ آور ہوئے بغیر ہی ڈر کے واپس چلے جاتے۔

پھر ہائی کمان کو اطلاع ملی کہ بے شمار فوجی گاڑیاں، ٹینک اور توپیں جی ٹی روڈ پر سرحد کی جانب آرہی ہیں۔ چناں چہ سکواڈرن لیڈر سجاد حیدر کی قیادت میں فلائٹ لیفٹیننٹ محمد اکبر، فلائٹ لیفٹیننٹ دلاور حسین، فلائٹ لیفٹیننٹ غنی اکبر، فلائٹ لیفٹیننٹ خالد لطیف، فلائنگ آفیسر محمد ارشد چودھری اور فلائٹ لیفٹیننٹ فاروق عمر نے بھارتی سرحد عبور کی اور نیچی پرواز کرتے ہوئے بھارتی فوج کے اس قافلے کو منٹوں میں راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔

لاہور کی جانب پیش قدمی روکنے کے بعد بھارتی فوج نے سیالکوٹ کی جانب چونڈہ کے محاذ پر پانچ سو ٹینکوں سے یلغار کر دی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کسی بھی محاذ پر ٹینکوں کی سب سے بڑی جنگ تھی۔ بھارتی مشن تھا کہ سیالکوٹ کو کچلتے ہوئے گوجرانوالہ کے قریب پہنچ کر پاکستان کی ریلوے لائن پر قبضہ کیا جاتا اور خاکم بدہن شمالی پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ بھارتی فوج کو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ ۵۰۰ ٹینکوں سے کیا جانے والا یہ حملہ بھی ناکام بھی ہو سکتا ہے۔ پاک فوج کے نڈر جوان بدن سے بم باندھ کر ٹینکوں کے نیچے گھس گئے اور انھیں روئی کے گالوں کی طرح فضا میں اڑا دیا۔ اُدھر پاک فضائیہ کے شدید ترین حملوں نے بھارتی فوج کی کمر توڑ دی اور چونڈہ کا محاذ بھارتی ٹینکوں کا قبرستان بن گیا۔

ایک دن مجھے اور فلائٹ لیفٹیننٹ عباس مرزا کو حکم ملا کہ

شکر گڑھ کے نزدیک دو بھارتی طیارے موجود ہیں ان کو حملے سے روکا جائے۔ ہم دونوں بہت تیزی سے شکر گڑھ کی جانب بڑھے، تو وہاں بھارتی طیاروں کی تعداد توقع سے بھی زیادہ نظر آئی۔ پاک فضائیہ کے دلیر اور نڈر ہواباز فلائٹ لیفٹیننٹ یوسف علی خاں تنہا ہی اُن سے مقابلہ کر رہے تھے۔ تعداد میں زیادہ ہونے کی بنا پر فلائٹ لیفٹیننٹ یوسف علی کے طیارے کو نقصان پہنچ چکا تھا، لیکن انھوں نے جان کی پروا نہ کرتے ہوئے مقابلہ جاری رکھا۔ جیسے ہی ہم وہاں پہنچے، تو بھارتی طیارے ہمیں دیکھ کر بھاگ نکلے اور اللہ کے فضل و کرم سے فلائٹ لیفٹیننٹ یوسف علی بحفاظت سرگودھا ائیر بیس پر اترنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی طرح ۹ ستمبر کی صبح گیارہ بجے اطلاع ملی کہ پسرور کے علاقے میں دو بھارتی جہاز حملہ آور ہیں، ان کا تعاقب کیا جائے۔ فلائٹ لیفٹیننٹ حکیم اللہ (بعد میں ائیر چیف مارشل) نے سرگودھا سے پرواز کی اور پسرور کے علاقے میں اُن کے سروں پر پہنچ گئے۔ بھارتی ہواباز بغیر حملہ کیے ہی بھاگنے لگے، تو فلائٹ لیفٹیننٹ حکیم اللہ نے ان پر حملہ کیا اور ڈر کے مارے وہ بجائے لڑنے کے پسرور کے ناکارہ رن وے پر اپنی جان بچانے کے لیے لینڈ کر گئے۔ یہ نیٹ (Gnat) جہاز اب بھی پاک فضائیہ کے عجائب گھر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اسی طرح بائی کمان سے حکم ملا کہ آدم پور اور ہلواڑہ کے ہوائی اڈوں کی تصویریں بنائی جائیں تاکہ وہاں کے حالات کے مطابق مشن تشکیل دیے جا سکیں۔ ہمارے پاس قدرے پرانے (R T-33) جہاز تھے جن کو بھارت کے اندر دور تک بھیجنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ چناں چہ ایف ۱۰۴ دو نشستوں والے جہاز پر میں، اسکواڈرن لیڈر مڈل کوٹ اور فلائٹ لیفٹیننٹ آفتاب عالم دستی کیمرے باری باری لیے مشن پر روانہ ہوئے۔ جب ہم نیچی پرواز کرتے آدم پور پہنچے، تو جہاز کو آواز کی رفتار تک تیز کر لیا تاکہ بھارتی بمبار طیارے ہمیں پکڑ نہ سکیں۔ آدم پور کے اوپر پہنچ کر جہاز کو الٹا کر کے اڑایا گیا تاکہ کیمرہ پورے ہوائی اڈے کی تصویریں بآسانی بنا سکے۔ اگلے دن یہی کارروائی ہلواڑہ کے ہوائی اڈے کے اوپر دہرائی گئی جو نہایت کامیاب رہی۔

اسی دوران بائی کمان کو اطلاع ملی کہ اسلحے سے بھری ایک گاڑی گرداسپور ریلوے اسٹیشن پر کھڑی ہے جو سرحد کی جانب بھارتی فوج کو اسلحہ سپلائی کرنے جا رہی ہے۔ اسکواڈرن لیڈر علاؤ الدین اپنے تین ساتھی ہوابازوں کے ہمراہ اس مشن پر روانہ ہوئے اور گرداسپور کے ریلوے اسٹیشن پر کھڑی اسلحے سے بھری گاڑی کو آگ کے شعلوں میں نہلا دیا۔ بھارتی فضائیہ کو ہمت نہیں ہوئی کہ مقابلے کے لیے نکلے لیکن سکواڈرن لیڈر علاؤ الدین جب نیچی پرواز کر کے یہ جائزہ لے رہے تھے کہ آیا گاڑی کا کوئی ڈبا تباہ ہونے سے بچ تو نہیں گیا، تو ایک گولہ سکواڈرن لیڈر علاؤ الدین کے جہاز کو آلگا جس سے جہاز میں آگ لگ گئی۔ سکواڈرن لیڈر علاؤ الدین نے پیراشوٹ کے ذریعے چھلانگ تو لگا دی، لیکن بھارتی فوج نے انھیں گرفتار کر کے گولی مار کر شہید کر دیا۔ انھیں بعد از شہادت "ستارہ جرأت" سے نوازا گیا۔

یہ ۱۹ ستمبر کی بات ہے کہ چار بھارتی جنگی جہاز لاہور پر حملہ آور ہوئے، تو سکواڈرن لیڈر چنگیزی کی قیادت میں فلائٹ لیفٹیننٹ ملک، جیلانی، امان اللہ خان اور فاروق عمر نے بھارتی جنگی جہازوں کی سرکوبی کے لیے سرگودھا سے پرواز کی۔ لاہور کی فضا میں بھارتی طیاروں سے زبردست آنکھ مچولی چل رہی تھی۔ جب بھی بھارتی طیارے ہماری دسترس میں آتے، تو نیچے چھتوں پر کھڑے لاہور کے زندہ دلان شہری دکھائی دیتے۔ ہم اس لیے بھارتی طیارے پر فائر نہ کر سکتے تھے کہ نیچے ہماری معرکہ آرائی دیکھنے والے شہری بہت بڑی تعداد میں اپنے گھروں کی چھتوں پر موجود تھے۔ ہمیں اس وقت حیرت ہوئی کہ موت کا خوف نہ تو ہمیں

تھا اور نہ ہی لاہور کی غیور عوام کو۔

اس دوران ملکہ ترنم نور جہان نے اپنے ملی نغموں کی بوچھاڑ جاری رکھی جس سے فوجیوں کے حوصلے مزید بلند رہے۔ جب بھی ہمارے جہاز بھارتی جہازوں کے تعاقب میں پہنچے، تو وہ اپنے ہوا باز کی جرأت اور بہادری کی داد تالیاں بجا کر دیتے۔ اس سے ہمارا حوصلہ بڑھتا اور ہم موت کے خوف سے بے نیاز پاک سرزمین کی حفاظت کے لیے تابڑ توڑ حملے کرتے۔ ۶۵ء کی جنگ ختم ہوگئی لیکن بھارتی فوج اور فضائیہ کو یہ پتا چل گیا کہ پاکستان ان کے لیے تر نوالا نہیں بلکہ فولاد کا وہ چنا ہے جسے چباتے ہوئے دانت ٹوٹ بھی سکتے ہیں۔

جنگ ختم ہونے کے بعد یہ بھی احساس ہوا کہ امریکا پر بھروسا نہ ہی کیا جائے کیونکہ عین اس وقت جبکہ جنگ عروج پر تھی، اس نے فاضل پرزہ جات کی سپلائی بند کردی۔ ہم ائیر چیف مارشل محمد اصغر خان کی دور اندیش حکمت عملی کی وجہ سے کسی بڑے بحران سے محفوظ رہے کہ انھوں نے وقت سے پہلے مطلوبہ پرزہ جات اچھی مقدار میں محفوظ کر لیے تھے جس کی وجہ سے ہماری جنگی صلاحیت میں کمی واقع نہ ہوئی۔ امریکا کے ناپسندیدہ رویے کو پیش نظر رکھتے ہوئے ائیر مارشل نور خان نے عوامی جمہوریہ چین سے مگ ۱۹ اور مگ ۱۵ ٹرینر طیاروں کے سات سکواڈرن خریدے اور ہوا بازی تربیت اور مرمت و بحالی کا پروگرام ترتیب دیا۔

اس وقت میں (فاروق عمر) ایف ۱۰۴ اسٹار فائٹر اور نمبر ۵ اسکواڈرن کا فلائٹ کمانڈر تھا۔ میں نے اس پروگرام کو دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ پہلی فلائٹ اسٹار فائٹر اور دوسری فلائٹ کو مگ ۱۹ کا نام دیا گیا۔ پاک فضائیہ میں اسے ایف ۶ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ابتدا میں ہمیں سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ مرحلہ بھی بالآخر طے کر ہی لیا۔ اب ہم ان چینی طیاروں کو کامیابی سے اڑانے اور دیگر ہوا بازوں کو تربیت بھی دینے لگے۔ میں چونکہ اس وقت فلائٹ کمانڈر تھا اس لیے دونوں قسم کے جہاز اڑانے کا مجھے موقع ملتا رہا۔ چینی جہازوں کے انسٹرومنٹ (پرزہ جات) کی لکھائی چائنیز زبان میں تھی اس لیے ہمیں سمجھنے میں وقت کا سامنا کرنا پڑتا لیکن جذبہ جوان اور عزم صمیم ہو، تو ہدف مشکل نہیں رہتا۔ ہم نے مختصر مدت میں چینی جہاز اڑانے میں مہارت حاصل کر لی جس پر خود چینی انجینئرز بھی حیران تھے۔

پھر فرانس سے میراج طیارے خریدنے کا معاہدہ ہوا، تو مجھے ایم ایم عالم اور چند دیگر تجربے کار ہوا بازوں کو تربیت کے لیے فرانس بھیج دیا گیا جہاں ہم نے کم ترین مدت میں میراج طیارہ اڑانے اور ہنگامی حالت میں درست کرنے کے طریقے سیکھ لیے۔ وہاں بھی ہمیں فرانسیسی زبان سے واسطہ پڑا لیکن زبان کی مشکل کو ہم نے آسان کر ہی لیا۔ وہاں ہماری ملاقات اسرائیلی ہوا بازوں سے بھی ہوئی جو خود وہاں تربیت لینے آئے ہوئے تھے۔ جب ان کا آمنا سامنا ایم ایم عالم سے ہوا، تو ان کی زبانیں گنگ ہوگئیں۔ یہی وہ عظیم پاکستانی لڑاکا ہوا باز ہے جس نے ایک منٹ میں پانچ بھارتی جنگی طیارے گرا کے عالمی ریکارڈ قائم کیا تھا۔ پھر ہمیں چین کی سرحد سے نو سو کلومیٹر دور جرمن بارڈر پر (Strass Burg) ائیر بیس لے جایا گیا جہاں ہمیں دس دس گھنٹے فی پائلٹ سمولیٹر کی مشق کروائی گئی۔

فلائنگ کی تربیت مکمل کر کے ہم پاکستان واپس پہنچے، تو ملک میں سیاسی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ مشرقی اور مغربی

ایک قومی تقریب میں سلامی لیتے ہوئے

پاکستان کی سیاسی جماعتیں ووٹروں کو ترغیب دینے کے لیے اپنا اپنا منشور بنا رہی تھیں۔ پھر ۱۹۷۰ء کے انتخابات ہوئے اور مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی کے حالات پیدا ہو گئے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ کس سیاسی لیڈر نے کیا کردار ادا کیا، ہمیں تو اپنی ذمے داریاں ہر حال میں نبھانی تھیں وہ ہم نبھاتے رہے۔ مشرقی پاکستان کی خانہ جنگی نے پاکستان ائیر فورس کو اس اعتبار سے نقصان ضرور پہنچایا کہ اس میں جو بنگالی ہوا باز اور عملہ موجود تھا، ان کو گراؤنڈ کر دیا گیا۔ ہماری فضائیہ کی آپریشنل کمانڈ مغربی پاکستان میں تھی جبکہ ایک ایف ۸۶ سکواڈرن مشرقی پاکستان یعنی ڈھاکہ میں بھی تھا۔ ان حالات میں جبکہ بنگالی اور مکتی باہنی کے لوگ ''را'' کے اکسانے پر پاکستان اور پاکستان آرمی کے خلاف ہو گئے، تو نتیجہ یقیناً ہمارے خلاف ہی نکلنا تھا۔ پھر مشرقی پاکستان میں بھارت کی جانب سے جو مشکل حالات پیدا کیے گئے تھے، ان کا دباؤ کم کرنے کے لیے ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مغربی سرحدوں پر پاکستان نے یلغار کر دی۔ پاک فوج کے افسروں اور جوانوں نے ایک بار پھر جرأت اور بہادری کی انمٹ داستانیں اپنی لہو سے رقم کیں۔

۵ دسمبر ۱۹۷۱ء کی رات سرگودھا کی فضا میں بھارتی کینبرا طیارے نمودار ہوئے، تو انھوں نے رسالے والا' سرگودھا' پشاور' سکیسر' میانوالی' شورکوٹ اور کراچی پر پے در پے حملے کیے۔ اس جنگ میں پاک فضائیہ کی پوزیشن ۱۹۶۵ء کی نسبت مختلف تھی لیکن ہم نے ہر ممکن کوشش کی کہ بھارتی جنگی طیاروں کو حملوں سے باز رکھا جائے۔ بھارت کے پاس جدید ٹیل وارننگ ریڈار کے ساتھ بمبار طیارے موجود تھے جو ہمارے ریڈار پر دکھائی نہ دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارتی طیارے ہم سے بچ کر نکل جاتے۔ ایک بار ہمیں اطلاع ملی کہ بھارتی طیارہ پہاڑیوں کی آڑ میں چھپتے چھپاتے سکیسر کی جانب جا رہا ہے تاکہ وہاں بمباری کر سکے۔ میرے ساتھی فلائٹ لیفٹیننٹ نعیم عطا اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ جب وہ کھیوڑا سالٹ رینج کے قریب پہنچا، تو اس نے ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز شروع کر دی۔ اسی اثنا میں فلائٹ لیفٹیننٹ نعیم عطا نے میزائل داغا جو نشانے پر لگا اور وہ بھارتی بمبار طیارہ پہاڑیوں میں جا گرا۔ اس طیارے کے گرنے سے بھارتی فضائیہ کو پیغام مل گیا کہ ان کے بمبار طیارے بھی پاک فضائیہ گرا سکتی ہے۔

اپنے طیاروں کی تباہی کے بعد بھارتی فضائیہ نے ایک نئی تکنیک استعمال کرنا شروع کی۔ دھماکا خیز بم کے بجائے (سپائک) بم استعمال کیے جنھیں اینٹی پرسنل بھی کہا جاتا ہے۔ اس طریقہ کار سے بموں کے ٹکڑے کچھ اس انداز میں بکھر کر رن وے میں پیوست ہو جاتے کہ وہ استعمال کے قابل نہ رہتا۔ اس حالت میں کوئی بھی گاڑی یا جہاز وہاں سے گزر نہیں سکتا تھا۔ رات کے اندھیرے میں یہ رکاوٹیں دور نہ ہو پاتیں۔ خوش قسمتی سے ہمارے کسی جہاز کو نقصان تو نہ پہنچا، لیکن رن وے چند گھنٹوں کے لیے ناقابل استعمال ہو گیا۔ دوران جنگ ہم بھارتی جنگی طیاروں کو اپنی تکنیک اور مہارت سے بھگاتے اور تھکاتے رہے اور ممکن حد تک حملے سے باز رکھتے رہے لیکن ایک مرتبہ جب بڑی تعداد میں بھارتی طیارے سرگودھا' میانوالی اور پشاور کے ہوائی اڈوں پر حملہ آور ہوئے، تو واقعی صورت حال کچھ پریشان کن ہو چکی تھی۔ میں اس وقت فضائی نگرانی پر مامور تھا۔ اس دوران میرے جہاز میں نقص پیدا ہو گیا، تو میں نے لینڈ کرنے کی اجازت مانگی۔ سرگودھا ایئر کنٹرول کا پیغام ملا کہ بم پر حملہ ہو چکا، اس لیے میانوالی چلے جائیں۔ جب میانوالی پہنچا، تو وہاں سے پشاور جانے کا پیغام ملا۔ جب میں پشاور پہنچا، تو پشاور والوں نے بھی لینڈ کرنے سے یہ کہتے ہوئے اجازت نہیں دی کہ بھارتی طیارے حملہ آور ہو رہے ہیں اس لیے لینڈ کی سہولت فراہم نہیں کی جا سکتی۔ جب خطرہ کچھ کم ہوا، تو اجازت ملنے پر میں نے پشاور ائیر بیس پر لینڈ کیا۔ وہاں فلائٹ لیفٹیننٹ ذوالفقار علی شاہ اپنے میراج طیارے کے ہمراہ موجود تھے۔ انھوں نے بھی بھارتی طیاروں

کے حملے رات کو ناکام بنائے تھے۔

پشاور سے واپسی پر میں اور فلائٹ لیفٹیننٹ ذوالفقار علی شاہ نے میراج طیاروں کو لیے دس ہزار فٹ کی بلندی پر سرگودھا کا رخ کیا، تو ریڈار کو اطلاع دی کہ اگر کوئی بھارتی فارمیشن نظر آئے، تو بتائیں تاکہ ہم انھیں مار گرائیں۔ ہم چوکنے ہو کر محو پرواز تھے۔ جب ہم کھیوڑا کے قریب سالٹ رینج عبور کر رہے تھے تو ریڈار نے بتایا کہ رسالے والا ائیر فیلڈ پر چھے بھارتی بمبر طیارے حملہ کر رہے ہیں، آپ انھیں جا کر روکیں۔ ہم نے فیول ٹینک گرا کر جہازوں کو ہلکا کیا۔ اب دو میراج طیاروں کی چھے بمبر طیاروں کے ساتھ جنگ تھی۔ ہم انھیں مار گرانے کی جستجو میں تھے اور وہ ہمیں نقصان پہنچا کر بھاگنا چاہتے تھے۔ پھر قدرت نے ہمیں موقع فراہم کر دیا۔ دھند کے باوجود ہم نے دو طیاروں کو زخمی کیا اور باقی طیارے موسم کی آڑ لیتے ہوئے چھپتے چھپاتے انڈیا کی طرف بھاگ نکلے۔

اس کامیاب معرکہ آرائی کے بعد ہمیں ہائی کمان کی جانب سے حکم ملا کہ سیالکوٹ سیکٹر میں بھارتی فوج پانچ سو ٹینکوں سے حملے کرنے کی تیاری میں مصروف ہے۔ آپ وہاں جائیں اور فوٹو ریکی مشن مکمل کر کے آئیں۔ میں اور فلائٹ لیفٹیننٹ ریاض شیخ نے وہاں پہنچ کر کامیابی سے کم وبیش ایک ہزار تصویریں بنائیں اور سرگودھا پہنچ کر ائیر ہیڈ کوارٹر کو پیش کر دیں۔ پھر مجھے پٹھانکوٹ ائیر فیلڈ کی تصویر کشی کا مشن سونپا گیا۔ یہ ایک مشکل کام تھا کیونکہ وہاں دو سو چالیس ملی میٹر طیارہ شکن توپیں نصب تھیں اور میں اکیلا تھا۔ میزائل اور جہاز ائیر فیلڈ کی حفاظت پہ مامور تھے اور بچنا مشکل تھا۔ لیکن مشن ضروری تھا۔ میں پسرور کے راستے نیچی پرواز کرتا پٹھانکوٹ پہنچا، تو بھارتی گنوں نے طیارے پر گولیوں کی بارش کر دی اور مجھے گرانے کی کوشش کی۔ پھر ایک زوردار دھماکا ہوا، تو جہاز کانپ اٹھا۔ بلکہ جہاز کے انجن نے وائبریٹ کرنا شروع کر دیا جیسے ابھی گر جائے گا۔ میں نے سکیسر کے ریڈار کو بتایا کہ میں نے مشن تو مکمل کر لیا ہے، لیکن میرے جہاز میں خرابی پیدا ہو گئی ہے، ہو سکتا ہے کہ بخیر واپس نہ پہنچ سکوں۔ اس لمحے میرا جہاز جھٹکے کھا رہا تھا اور جہاز کی رفتار ۵۱۰ ناٹ تھی۔ بھارتی طیارے تب مجھے آسانی سے گرا سکتے تھے، لیکن اللہ کے فضل و کرم سے ان کو میرے قریب آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں زگ زیگ کرتا شکرگڑھ کے راستے بخیریت سرگودھا پہنچ گیا۔ جیسے ہی رن وے پر اترا، تو انجن کا کمپریسر سٹال کر گیا اور جہاز کی پشت سے آگ کے شعلے نکلنے لگے۔ جب قریب ہو کر دیکھا، تو معلوم ہوا ایک پندرہ کلوگرام کی بڑی گدھ جہاز کے ریڈار کو ہٹ کرتی، دائیں انجن کو پھاڑتی کمپریسر کو نقصان پہنچاتی اور فیوز لاج کو توڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ یہ بہت بڑا حادثہ تھا جس سے اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ رکھا۔

اپنے میراج طیارے کے ساتھ

ابھی بھارتی طیاروں سے ہماری آنکھ مچولی جاری تھی کہ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ ہم سب نے یہ خبر نہایت دکھ اور افسوس کے ساتھ سنی اور ہماری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

۱۹۷۱ء کی جنگ کے فوراً بعد ۱۹۷۲ء میں مجھے حکومت پاکستان نے کرنل قذافی، صدر لیبیا کی معاونت کرنے کے

لیے مجھے عمدہ میراج لڑاکا ہوابازوں کے ہمراہ لیبیا بھیجا تاکہ ہم نیشنل ایئر فورس قائم کرسکیں اور اُدھر رہتے ہوئے مصری ہوائی بازوں کو بھی تربیت دیں۔ یہ ہمارے تربیت یافتہ مصری ہواباز ہی ہیں جنھوں نے عرب اسرائیل جنگ ۱۹۷۳ء میں عرصہ دراز کے بعد عربوں کو سوئز کینال اور Barlev line کے مقام پر اسرائیل کے خلاف پہلی دفعہ لڑائیوں میں فتح یاب کیا۔ ساتھ ساتھ ہمارے تربیت شدہ ہوابازوں کی بدولت مصر نے سوئز کینال پہ قبضہ واپس لیا۔ یہ عربوں کے لیے بہت بڑی فتح تھی جس سے سارے مسلمان ملکوں کے سر فخر سے بلند ہوگئے۔

بعدازاں پاکستان میں واپسی کے بعد مجھے کامرہ ایئر نوٹیکل کمپلیکس کا چیف ایگزیکٹو اور ڈائریکٹر جنرل بنادیا گیا۔ میرے زمانے میں کمپلیکس کے ہنرمندوں نے قراقرم ٹرینی جیٹ طیارہ تیار کیا۔ یہ پاک چین مشترکہ پروجیکٹ تھا جو اب ساری دنیا میں شہرت حاصل کرچکا۔ اسی دوران میں نے جے ایف ۱۷ تھنڈر منصوبے کی ابتدائی بنیاد بھی رکھی جس پر پاکستان کو اب بلاشبہ فخر ہے۔ کامرہ سے رخصتی کے بعد مجھے شاہین ایئرلائن بنانے کا حکم ملا۔ مجھے شاہین ایئرلائن کے پہلے بانی چیف ایگزیکٹو ہونے کا اعزاز حاصل ہے جو ایئر بلیو کی طرح اچھا کام کررہی ہے۔

دسمبر ۱۹۹۲ء میں ایئر وائس مارشل کی حیثیت سے میں پاک فضائیہ سے سبکدوش ہوگیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وزیراعظم میاں محمد نواز شریف کے حکم پر مجھے گریڈ ۲۲ میں پروموشن دے دی گئی۔ ساتھ ہی پاکستان ایئرلائن پی آئی اے کا سربراہ بنادیا گیا۔ پی آئی اے کو منافع بخش رکھنے کے لیے میں نے چھے ممالک میں پروازیں شروع کرائیں تاکہ ایئرلائن کی معاشی حالت اور بزنس مضبوط ہوسکے۔ پاکستانیوں کی دنیا کے وسیع ترین ورک تک رسائی ممکن بنائی اور مارچ ۱۹۹۶ء میں ایئرلائن کو بڑی اچھی فنانشل پوزیشن میں خیرباد کہا۔ میرے جانے کے بعد دو سال کے اندر اندر ایئر لائن مالی بحران کا شکار ہونا شروع ہوئی اور اس وقت پی آئی اے دیوالیہ ہونے کے قریب پہنچ چکی ہے۔

پی آئی اے کے ساتھ ساتھ مجھے پاکستان ہاکی فیڈریشن کا صدر بھی منتخب کیا گیا جہاں میں نے سفارش اور رشوت کے رجحان کی ہر سطح پر حوصلہ شکنی کرتے ہوئے میرٹ کو اپنایا۔ نتیجے میں پاکستان ہاکی ٹیم نے ۱۹۹۲ء میں لاہور میں منعقد ہونے والا عالمی چمپئن ٹرافی جیت لی۔ اس کے بعد آسٹریلیا کے شہر سڈنی میں ہونے والے آٹھویں ورلڈ کپ میں بھی پاکستانی ہاکی ٹیم کو گولڈ کپ کی کامیابی حاصل کرائی اور پاکستان ہاکی ٹیم کو زیرو سے ہیرو بنادیا۔ اس سے چودہ سال پہلے پاکستان متواتر ہار رہا تھا۔ اس فتح کے بعد جب میں چلا گیا تو آج تک اٹھارہ سال مزید گزرنے کے بعد پاکستان ہاکی ٹیم کوئی اہم فتح حاصل نہیں کرسکی۔

۱۹۹۶ء میں پی آئی اے اور پاکستان ہاکی فیڈریشن، دونوں کو خیرباد کہہ دیا اور اب ایک فلاحی تنظیم ''فاروق فاؤنڈیشن'' چلا رہا ہوں جو چار سال پہلے قائم کی گئی تھی۔ اس کے تحت نوجوان نسل کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا جارہا ہے۔ میں مختلف کتابیں بھی لکھ رہا ہوں۔ اور میری پہلی کتاب جو کہ نوجوانوں کے لیے ہے جس کا نام ''Learn the Secrets of Success'' ہے۔ اس کا اداریہ ایم ایم عالم ''ہیرو آف پاکستان'' نے خود اپنے ہاتھ سے لکھا۔ اس کے بعد اب میں دوسری کتاب ''سوانح حیات جلد اول'' مکمل کررہا ہوں جو تقریباً تقریباً پروف ریڈنگ کے مراحل پار کررہی ہے۔ اس کے بعد مزید کتابیں لکھ کر شائع کروں گا۔ میرا نوجوان نسل کے لیے بس ایک ہی پیغام ہے: ''پاکستان کے لیے زندہ رہو اور پاکستان کے لیے مرمٹو۔'' ◆◆◆

اعلیٰ جذبوں سے مزین

سفید چادر

ایثار و قربانی کی لازوال داستان

عارف سہارنی

وہ لڑکی جب کالج سے نکلی، تو اس نے سفید رنگ کی جالی دار خوبصورت بارڈر والی چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ وہ بے حد نفیس اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ چچا باغ علی کی نگاہ اچانک اس پر پڑی۔ باغ علی نے اسے غیرارادی طور پر دیکھا اور جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوئی، اسے دیکھتا ہی چلا گیا۔ شاید وہ اسے آسمانی حور معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ حوریں اور فرشتے سفید نورانی لباس پہنتے ہیں۔

باغ علی پرانے زمانے کا آدمی تھا۔ عمر ساٹھ سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ کالج کے سامنے مدت سے اسٹیشنری کی چھوٹی سی دکان چلا رہا تھا اور سڑک پار ایک کرائے کے کوارٹر میں رہتا تھا۔ عرصہ گزرا اس کی بیوی فوت ہو گئی تھی۔ اس کے ہاں صرف ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی جو بہت پہلے گاؤں میں رہنے والے ایک عزیز کے ساتھ بیاہ دی۔ وہ اب اپنے غریبانہ گھر میں چند بچوں کے ساتھ مطمئن زندگی بسر کر رہی تھی۔ غربت زندگی کا سب سے بڑا اطمینان ہے بشرطیکہ اسے اپنا لیا جائے۔ مگر اس کا اپنانا ہی، تو زندگی کا سب سے مشکل کام ہے۔

سب لوگ اسے چچا باغ علی کہتے تھے۔ وہ ہر روز پچیس تیس روپے کما لیتا جس میں سے اپنے کوارٹر اور دکان کا کرایہ بھی ادا کر دیتا۔ صبح و شام کسی سستے ہوٹل میں بیٹھ کر دال یا سبزی کھا اپنا گزارہ کر لیتا۔ البتہ چائے وہ خود اپنے کوارٹر میں تیار کرتا۔ اسے اپنے ہاتھ کی بنائی چائے ہی پسند تھی۔ کپڑے بھی خود ہی دھو لیتا۔

اسے معلوم تھا کہ پچیس تیس روپے روزانہ کمانے سے اس کا گزارہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے وہ زیادہ کمانا پسند نہ کرتا۔ جب وہ اتنے روپے کما لیتا، تو دکان بند کر جاتا۔

وہ سوچتا "باغ علی! اب بس..... کل والا کل تیرے ساتھ ہوگا۔" وہ مطمئن ہو کر دکان بند کر دیتا۔ یہ زندگی تو ہمیشہ کل کی محتاج ہے اور اگر کل والے پر بھروسا کر لیا جائے، تو پھر زندگی کے چہرے پر کسی تھکن، کسی خراش کے نشان نظر نہیں آتے۔

باغ علی نے جب اس لڑکی کے سر پر سفید رنگ کی خوبصورت چادر دیکھی، تو جانے کیوں بے چین ہو گیا۔ حالانکہ عرصہ گزرا اس کا دل ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ کوئی لہر، کوئی موج اور کوئی ارتعاش اس کی زندگی کی سطح پر نہیں ابھرا تھا۔ زندگی کی سودائی راتوں میں آرزوؤں کے جو قافلے چلتے ہیں، ان کے نشان مدت سے مٹ گئے تھے۔ وہ تو کسی خاموش چٹان کا ایک چھپا ہوا گوشہ بن چکا تھا جو جھرنوں اور آبشاروں کے ترنم سے بے نیاز ہو۔

پتا نہیں کیوں جب اس نے اس لڑکی کو وہ سفید چادر اوڑھے دیکھا، تو بے چین ہو گیا۔ اس کے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی..... یہ خواہش کہ وہ ایسی چادر خرید کر اپنی بیٹی کے پاس گاؤں لے جائے اور اس کے سر پر ڈال کر خوش ہو۔ وہ بھی تو اتنی خوبصورت چادر اوڑھ کر بڑی مسرت کا اظہار کرتی۔

باغ علی کی یہ خواہش بظاہر بڑی عجیب مگر شاید فطرت کا ایک حصہ تھی۔ اب وہ ہر روز کالج کے دروازے پر نگاہیں جمائے رہتا۔ جب لڑکی کالج سے چھٹی ہونے پر باہر آتی، تو باغ علی اسے دیکھ کر بے چین ہو جاتا۔

ایک روز وہ ہمت کر کے اس لڑکی کے راستے میں کھڑا ہو گیا۔ جب وہ قریب آئی تو نرمی سے پوچھا "بیٹی! یہ چادر کتنے میں آئی ہے؟"

"کیوں بابا! تم بھی اوڑھنا پسند کرتے ہو؟ لڑکی نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں شاید....." باغ علی ایک دم اداس ہو گیا اور دور دور تک

صاحب تحریر

افسانہ نگار عارف سہارنی ۱۳ اپریل ۱۹۲۷ء کو ضلع حافظ آباد کے گاؤں سہارن چٹھہ میں پیدا ہوئے۔ مدارس کی حیثیت سے زندگی گزاری اور اکیسویں صدی کے اوائل میں فوت ہوئے۔ زیر نظر افسانہ آپ کے افسانوی مجموعے "سفید چادر" سے لیا گیا ہے۔ آپ نے معاشرتی موضوعات پر عمدہ افسانے لکھے اور نیک نام شہرت پائی۔

پھیلے نیلے نکھرے آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ "میری بھی ایک بیٹی ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"بابا! یہ پانچ سو روپے کی آتی ہے۔ اگر تمھیں بیٹی کے لیے ضرورت ہے، تو تم چاہو تو میں اپنے پاس سے خرید دوں.....؟ تم شاید یہ چادر نہ خرید سکو۔"

"نہیں بیٹی! ایسی کوئی بات نہیں، دینے والا اوپر بیٹھا ہے۔ وہ دے سکتا ہے۔ شکریہ بیٹی!" باغ علی نے آہستہ سے کہا۔

شام کو باغ علی جب کوارٹر میں اپنے بستر پر لیٹ گیا، تو اچانک پھر وہ لڑکی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"بابا! اگر تم چاہو تو میں اپنے پاس سے چادر خرید دوں؟"

"نہیں نہیں باغ علی! یہ تو بھیک اور خیرات ہے۔ زندگی کی انا سب سے قیمتی سرمایہ ہے اگر تم..... پھر تم..... تم اس لڑکی کے سامنے ہمیشہ کے لیے جھک جاؤ گے۔ تم اپنی زندگی کو ہمیشہ کے لیے مفلس کر لو گے۔ اگر تم نے اپنی انا بیچ دی، تو پھر اپنی بیٹی کے واسطے چادر خریدنے کے لیے تمھارے پاس کیا رہے گا؟ تم یہ چادر خود ہی خرید دو گے۔"

"مگر کیسے؟" دل و دماغ سے سوال اٹھا۔

"تمھیں پچیس تیس روپے سے زیادہ کمانا ہوگا۔ اگر تم ہر روز پانچ روپے زیادہ کماؤ گے، تو تین چار ماہ میں یہ چادر خرید سکو گے۔"

"کیا تم ایسا کر سکو گے.....؟"

"باغ علی! زندگی اور اس کے کاروبار میں ہر آدمی کا ایک حصہ مقرر ہے۔ جو لوگ اپنے حصے سے زیادہ طلب کریں، وہ لالچی، غاصب اور بے ایمان بن جاتے ہیں۔ ان کے چراغ بجھ جاتے اور وہ روشنی کھو جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات سے رابطہ بخشتی ہے۔ باغ علی! جب تم اس سے پانچ روپے روزانہ طلب کرو گے، تو کیا شرمندہ نہیں ہو گے ..... وہ سب سے بڑی اور خوبصورت شے جس کو توکل کہتے ہیں، کیا وہ مجروح نہیں ہوگی .....؟ یہ بڑا مشکل کام ہے باغ علی!"

"وہ کہے گا، باغ علی تم ایک چادر دیکھ کر بے چین ہو گئے؟ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ غریبوں کے لباس کیسے ہوتے ہیں۔ پھٹے پرانے پیوند لگے مگر سادہ سے لباس! باغ علی! بھکاری مت بنو، تمھاری بیٹی کے سر پر عصمتوں کی پاکیزہ چادر ہے جو بہت ہی کافی ہے، سب سے عظیم اور خوبصورت ہے۔"

وہ بہت دیر تک اپنے آپ سے ہم کلام رہا اور سوچتے سوچتے اسے نیند آ گئی۔ سحر کی دہلیز دوڑتے ستارے نے جب اس کو جگایا، تو پھر سفید چادر والی لڑکی، وہی لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"دیکھو! دیکھو! باغ علی! کیا خوبصورت چادر ہے۔ فرشتوں اور حوروں کے رنگ والی! وہ پھر ایک دم بے چین ہو گیا۔

"سنو باغ علی! اگر تم اپنے بازوؤں کی قوت سے حلال روزی کماتے ہو، تو تمھارے مالک کو اس پر کیا اعتراض ہے؟ زندگی محنت، ایمانداری اور حرکت سے عبارت ہے۔ اگر تم ایسا کرو گے، تو وہ ناراض نہیں بلکہ خوش ہوگا۔ تمھارے ہاتھ پاؤں حرکت کے لیے ہی، تو بنائے گئے ہیں۔ تم زیادہ محنت کرو۔ زیادہ وقت لگاؤ اور ہر روز پانچ روپے زیادہ کما کر علیحدہ رکھتے جاؤ۔ جب وہ پانچ سو روپے بن جائیں، تو اپنی بیٹی کے لیے چادر خرید لینا۔

"باغ علی! تمھاری ایک ہی بیٹی ہے۔ وہ چادر اوڑھ کر کس قدر خوش ہوگی۔ اولاد کا والدین پر بڑا حق ہوتا ہے نا! اور یہ مرتے دم تک باقی رہتا ہے۔ جب تک والدین زندہ ہوں انھیں اپنی اولاد کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرتے رہنا چاہیے۔ تم بسم اللہ کر کے صبح اپنی دکان پر بیٹھنے کا وقت بڑھا دو۔"

"کوئی بات نہیں باغ علی! زندگی کی انا صرف حلال روزی ہے۔"

اور پھر اس نے اگلے روز سے اپنی دکان کا وقت ایک گھنٹا بڑھا دیا۔ جب پانچ روپے زیادہ ہو جاتے، تو وہ گھر آ جاتا۔ اس نوٹ کو وہ اپنے ایک پرانے بکس میں رکھ دیتا۔

دن گزرتے چلے گئے۔ ہر روز پانچ روپے جمع ہو جاتے۔ ایک روز باغ علی نے حساب لگایا، تو وہ پورے پانچ سو روپے ہو چکے تھے۔ یہ جان کر اس کا دل باغ باغ ہو گیا۔

اگلی صبح اس نے پانچ سو روپے چھوٹے سے تھیلے میں ڈالے اور دکان پر لے آیا۔ وہ کالج سے چھٹی ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ جب وہ لڑکی نکلی، تو وہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے لبوں پر تبسم کی کرن تھی اور آنکھوں میں طمانیت کی جھلک۔

"بیٹی! پانچ سو روپے ہو گئے۔ آج مجھے چادر خرید کر دو۔"

"اتنا عرصہ کہاں رہے بابا؟"

"غریبوں کے دن ہولے ہولے چلتے ہیں نا کیونکہ ان کے پاؤں کمزور ہوتے ہیں۔"

"میں نے کہا تھا کہ میں آپ کو چادر خود خرید کر دوں گی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں بیٹی! اب میرے پاس پیسے ہیں اور پھر....."

لڑکی نے ایک ٹیکسی روکی، باغ علی کو ساتھ لے جا بازار سے وہ چادر خریدی اور پھر واپس اسے اس کی دکان تک پہنچا اپنی کوٹھی کی طرف چلی گئی۔

باغ علی جب گھر پہنچا، تو اسے عجیب سی راحت ہو رہی تھی۔ اس کی بوڑھی رگوں میں خون تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ جب وہ بستر پر لیٹا، تو آسمان پر ننھے منے جلتے دیے اسے بڑے روشن اور خوبصورت نظر آئے۔ آج چاندنی کرنوں میں بڑی جگمگاہٹ تھی۔ اس نے زندگی میں ان گیتوں کی آواز ایک بار پھر سنی جو

مدتوں سے فضاؤں میں خاموش ہو گئے تھے۔ اور پھر اچانک آسمان کے ایک گوشے سے روشنی نمودار ہوئی۔

"باغ علی کیسے ہو؟ اپنی بیٹی کے لیے چادر خرید لائے ہو؟" یہ اس کی بیوی کی آواز تھی۔

"ہاں ناصرہ! یہ سفید چادر مجھے بڑی پسند تھی۔ تمہاری بیٹی یہ چادر اوڑھ کر اور بھی مقدس ہو جائے گی۔ یہ سفید رنگ اللہ کا نور ہوتا ہے نا۔ جب اس دھرتی کی تخلیق ہوئی تو سب سے پہلے اس پر سفید رنگ اترا تھا اور پھر..... دنیا والوں نے اس رنگ کو میلا کر دیا۔ اس میں کئی رنگ ملا دیے۔

"ہاں ناصرہ تم اداس تو نہیں ہونا.....؟ بس میں جلدی آ جاؤں گا۔ اس زندگی میں انسان کے ذمے بہت قرض ہوتے ہیں۔ جب وہ قرض چکا لے، تو اسے یہاں سے چھٹی ہو جاتی ہے۔ ہر انسان کو یہاں سے پاک اور صاف ہو کر جانا چاہیے۔ کیونکہ وہ ذات بڑی پاک اور صاف ہے جس کے حضور ہمیں حاضر ہونا ہے۔"

باغ علی کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

آنسو..... انسانیت نے جن کا ہمیشہ سے احترام کیا ہے۔

اگلے روز باغ علی چادر اپنی بیٹی کو پہنچانے کے لیے تیار تھا۔ اسے ریل گاڑی میں بیٹھ کر دو تین اسٹیشن چھوڑ اگلے اسٹیشن سے تین میل دور ایک گاؤں میں پیدل اپنی بیٹی کے پاس جانا تھا۔

باغ علی صبح صبح روانہ ہو گیا۔ اس نے سفید چادر ایک تھیلے میں ڈال مضبوطی سے بغل میں دبا رکھی تھی۔ گاڑی لیٹ تھی.....

یہ گاڑیاں نجانے لیٹ کیوں ہو جاتی ہیں؟ انھیں لیٹ تو نہیں ہونا چاہیے۔ باغ علی جلد از جلد اپنی بیٹی کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد گاڑی آ گئی۔ باغ علی ریل پر سوار ہوا اور اس اسٹیشن پر اتر گیا جہاں سے اس کی بیٹی کا گاؤں تین میل دور تھا۔

باغ علی نے اپنا ٹکٹ دروازے پر کھڑے پڑتال افسر کے حوالے کیا اور اسٹیشن سے باہر آنے لگا۔ اچانک اس کی نظر سامنے پڑی۔ ایک نوجوان لڑکی سر سے برہنہ بھیک کے لیے ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی۔

مقدس اور عظیم قوم کی بیٹی سر سے ننگی.....؟؟

باغ علی ایک دم اس کشتی کی طرح ہو گیا جو چپوار کے بغیر لہروں کے حوالے ہو چکی ہو۔

"بیٹی! بیٹی!"

باغ علی ایک دم چیخا۔ اس نے بغل سے چادر نکال اس لڑکی کی طرف بڑھا دی۔ پھر باغ علی نے دیکھا کہ وہ چادر بلند ہو کر ایک دم پھیل گئی۔ چاروں طرف دور دور تک خوبصورت اور سفید چادر پوری دھرتی پر ایک شامیانے کی طرح تن گئی اور پھر.....

باغ علی اور اس کی بیٹی چادر کے نیچے کھڑے مسکرا رہے تھے۔

باغ علی نے لڑکی کو وہ چادر اوڑھاتے وقت وہ آنسو اپنے دل کے دامن میں اتار لیا جو اس کی پلکوں پر جاگا تھا۔ ◆◆◆

ایک دوست (دوسرے سے) اچھا بھائی یہ تو بتاؤ کہ سب سے زیادہ کتابیں کس نے لکھی ہیں؟

واہ یہ بھی کوئی مشکل بات ہے سب سے زیادہ کتابوں کا مصنف تو ختم شد ہے تب ہی تو ہر کتاب کے آخر میں اس کا نام لکھا ہوتا ہے۔

☆☆

باپ..... (بیٹے سے) کسی چیز کو دن میں کئی بار کھانا اچھی عادت نہیں۔

بیٹا..... لیکن پاپا میں تو دن میں کئی بار ماسٹر صاحب سے ڈنڈے کھاتا ہوں۔

☆☆

مالک..... (نوکر سے) تم نے میرا آئینہ توڑ دیا ہے۔

نوکر..... جناب! یہ میری نقلیں اتار رہا تھا۔

مغلیہ سلطنت کا پہلا مقامی وزیراعظم

شاہجہانی دور کی ایک ہرفن مولا شخصیت کا تذکرہ بے بدل

پروفیسر سلیم شیخ

قندھار سے ایک تجارتی قافلہ پھل اور خشک میوہ جات لیے دہلی کی سمت روانہ ہوا۔ جب چنیوٹ کے قریب پہنچا، تو ایک شخص دوڑتا ہوا امیر قافلہ کے پاس گیا اور درخواست کی کہ اسے کچھ کابلی انار چاہئیں۔ سالار قافلہ نے اس شخص کا معمولی حلیہ دیکھتے ہوئے پوچھا کہ تمھیں انار کس مقصد کے لیے درکار ہیں؟

اس شخص نے بتایا "میری گھر والی امید سے ہے اور آٹھواں ماہ ہے۔ وہ کہتی ہے کہ میرا دل کابلی انار کھانے کو چاہتا ہے۔ اگر ولایتی انار نہ پاؤں گی، تو مر جاؤں گی۔"

قافلے کے سالار نے پھر پوچھا کہ تمھارا ذریعہ معاش کیا ہے؟

اس نے جواب دیا "میں ایک معمولی زمیندار ہوں۔"

سالار قافلہ نے انار پیش کرتے ہوئے کہا "یقیناً جو بچہ پیدا ہوا وہ غیرمعمولی دل و دماغ کا مالک ہوگا۔ اگر اس کی صحیح تعلیم و تربیت ہوئی، تو وہ اپنے زمانے کی منفرد شخصیت بنے گا۔"

سالار قافلہ کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی۔ امیر بخش کے ہاں پیدا ہونے والا تاریخ ہند میں نواب سعداللہ خاں کے نام سے مشہور ہوا اور مغل بادشاہ شاہ جہاں کا وزیراعظم بنا۔ وہ برصغیر پاک و ہند کا پہلا مقامی شخص تھا جو اس اہم عہدے پر

محض اپنی علمی قابلیت کی بنیاد پر فائز ہوا۔

☆☆

سعد اللہ ۱۰ صفر ۱۰۰۰ھ بمطابق ۱۶۰۹ء، چنیوٹ کے موضع پتراکی میں پیدا ہوئے۔ اسی شام والد کا انتقال ہو گیا۔ والد کی شفقت سے محرومی کے بعد پرورش کا ذمہ ماں کے سپرد ہوا، لیکن وہ بھی زیادہ دیر تک زندہ نہ رہ سکی۔ کہتے ہیں کہ والدین کے سایۂ عاطفت سے محروم ہونے کے بعد سعد اللہ کو چنیوٹ کے مشہور صوفی بزرگ، حضرت شاہ برہان الدین کے دامن میں پناہ ملی۔ انھوں نے ہی سعد اللہ کی ابتدائی پرورش اور نگہداشت فرمائی۔ چنیوٹ میں تھوڑا عرصہ گزارنے کے بعد سعد اللہ لاہور چلے گئے۔

وہ نہایت کسمپرسی کی حالت میں لاہور جیسے علمی مرکز پہنچے۔ وہاں اندرون دہلی دروازہ کی ایک مسجد میں ملّا خواجہ بہاری کا مدرسہ قائم تھا، وہیں علوم و فنون کے حصول میں مصروف رہے۔ انھوں نے ملا عبدالسلام لاہوری سے بھی کسب فیض حاصل کیا۔ سعد اللہ لاہور کے علاوہ سیالکوٹ میں بھی حصول تعلیم کے لیے مقیم رہے۔ وہاں انھوں نے ملا کمال کشمیری جیسے فاضل استاد کے سامنے زانوائے تلمذ طے کیا اور حضرت مجدد الف ثانی اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹی جیسی نامور ہستیاں ان کے خوشہ چیں تھے۔ سیالکوٹ میں بڑے بڑے جید علما رہائش پذیر تھے۔

مولانا کمال کشمیری کی درس گاہ سے صدہا بلکہ ہزاروں طالب علم دستار فضیلت لے کر نکلے۔ مگر صاحب کمال تین شاگردوں .... علامہ فہامی نواب سعد اللہ خاں، علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی اور مجدد الف ثانیؒ نے استاد کے نام کو بقائے دوام کا خلعت پہنا دیا۔ سعد اللہ نواب کہلائے، اور صاحب قرآن شاہجہان کے دستور معظم بنے۔ حضرت شیخ سرہندی نے، تو ظاہری اور باطنی علوم میں وہ عروج حاصل کیا کہ بڑے بڑے شہنشاہ ان کی چوکھٹ کی جبہ سائی کرتے رہے۔ آپ نے تصوف طریقت کو دکاندار صوفیوں سے ایسا صاف کیا کہ طریقت و شریعت میں کوئی فرق نہ آیا۔ ایران میں عمر خیام نے شاعری میں شہرت حاصل کی، تو مولوی عبدالحکیم نے منطق فقہ، حدیث، تفسیر میں وہ نام پیدا کیا کہ ہندوستان کے علاوہ مصر، قسطنطنیہ، حجاز، بخارا اور مراکش تک ان کا نام مشہور ہوا۔

سعد اللہ ماں کی گود سے نکل کر چنیوٹ، لاہور اور پھر سیالکوٹ کی خاک حصول علم کے لیے چھانتے رہے۔ ذہین اور فطین آدمی تھے، لہٰذا مختلف فنون میں کامل اور یکتائے زمانہ ہو گئے۔ قدرت نے فیصلہ کر دیا کہ اپنے علم و فضل کی بدولت سلطنت مغلیہ میں اونچا مقام حاصل کریں گے۔ یہ مقام حاصل کرنے کے لیے پہلی سیڑھی تب طے ہوئی جب مغل بادشاہ شاہجہان کے دربار میں انھیں حاضری کا موقع ملا۔ سعد اللہ خاں دسمبر ۱۶۴۰ء میں موسوی خاں صدر کل کی سفارش سے بادشاہ کے حضور پیش ہوئے۔

شاہجہاں کی مردم شناس نگاہوں نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا کہ یہ جوہر قابل معاملہ فہمی کی پوری استعداد رکھتا ہے۔ چناں چہ اسے عرض مکرر کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ یہ عہدہ بادشاہ کے خاص معتمد کو ملا کرتا تھا۔ بڑے بڑے امرا اس کی تمنا کیا کرتے تھے۔ یہ عہدہ براہ راست بادشاہ کے ماتحت ہوتا تھا۔ اس کا کام شاہی احکام پر نظر ثانی کر کے انھیں دوبارہ بادشاہ کے سامنے بغرض منظوری پیش کرنا تھا۔ نواب سعد اللہ خاں نے عہدے کی اہمیت سمجھتے ہوئے جانفشانی سے اپنی ذمے داری نبھائی اور اپنی قابلیت اور اہمیت کی بنا پر مختصر مدت میں بہت ترقی کرلی۔ انھیں ایک سال کے اندر اندر "خان" کا خطاب ملا اور ساتھ ہی دولت خانہ خاص کے داروغہ بن گئے۔

یہ وہ مقام تھا جہاں بادشاہ خاص امور کے متعلق اپنے معتمد امیروں سے مشورہ کرتا تھا۔ وہاں فقط وہی امیر جا سکتا تھا جسے بادشاہ خود طلب کرے۔ حتیٰ کہ شہزادے بھی بغیر اجازت وہاں داخل ہونے کے مجاز نہ تھے۔ سعد اللہ نے اپنی وفا، دیانت اور اخلاص کا اتنا اثر بادشاہ اور اہل دربار پر چھوڑا کہ اسی سال انھیں میر سامان کا عہدہ بھی مل گیا۔ یہ محکمہ ان گوداموں اور کارخانوں پر مشتمل تھا جو حکومت نے اپنے کاموں کی خاطر قائم کیے تھے۔ یہ محکمہ فوج، نقل و حمل اور شاہی شکار کے لیے جانوروں کا انتظام کرتا تھا۔ ان فرائض کی انجام دہی کے دوران نواب سعد اللہ کا بادشاہ سے روزانہ واسطہ رہتا۔ انھوں نے اپنی ذمہ داریوں کو

پیشروؤں سے بڑھ کر پورا کیا۔

نواب سعد اللہ خاں ترقی کی منزلیں طے کرتا، ۱۶۴۵ء میں دیوان خالصہ پر فائز ہوا۔ شاہی فرمانوں کی اصلاح اس کے سپرد کرتے ہوئے اسے یہ اعزاز بخشا گیا کہ فرامین پر بادشاہی مہر کے بعد اپنے دستخط بھی ثبت کر دیا کرے۔ ساتھ ہی وہ چار ہزار ذات کے منصب پر فائز ہوا۔ دیوان خالصہ وزیراعظم کے ماتحت تھا اور اس کے ذمہ خالصہ اراضی کے معاملات تھے۔ یہ تمام ذمے داریاں نبھاتے نبھاتے سعد اللہ خاں نے اپنی استعداد و صلاحیت سے دربار میں بڑا رسوخ پیدا کر لیا۔ جوہر شناس اور قدر دان بادشاہ نے اس کے جوہر کو بخوبی پرکھ لیا تھا۔ چناں چہ دو ماہ بعد ۱۶۴۵ء ہی میں شاہ جہاں نے سعد اللہ خاں کو وزارت کل (وزیراعظم) کا عہدہ سونپ دیا۔

یوں پینتیس برس کی عمر میں ایک گمنام فرد، جسے شاہی ملازمت سے منسلک ہوئے چار سال ہی گزرے تھے، مغل سلطنت کا وزیراعظم بن گیا۔ اسے علامہ فہامی اور جملۃ الملک کے خطاب سے نوازا گیا۔ اس سے پہلے مغل سلطنت میں یہ منصب کسی مقامی شخص کو نہیں ملا تھا، سب شاہی خاندان ہی سے تعلق رکھتے تھے۔

سعد اللہ خاں کو سلطنت کے تمام وزرا میں ممتاز ترین حیثیت حاصل ہوگئی۔ انھوں نے اپنی ذمے داریوں کو قابل اور منتظم کی طرح کامیابی سے نبھایا۔ بہت سی انتظامی و فوجی خدمات انجام دیں۔ پہلے یہ عام قاعدہ تھا کہ کروڑیوں کو تحصیل زر کے معاوضے میں پانچ فیصد معاوضہ دیا جاتا تھا۔ یعنی ایک کروڑی اگر سو روپیہ وصول کرے، تو پچانوے روپے شاہی خزانے میں داخل کرے باقی پانچ روپے بطور معاوضہ اپنے پاس رکھ لے۔

سعد اللہ نے کفالت سرکار کے خیال سے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ کروڑی ایک سو پانچ روپے رعایا سے وصول کرے۔ لیکن اس ترمیم سے رعایا کو پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ سعد اللہ نے جب سوچ بچار کی، تو وہ رعایا کی پریشانیوں کا خیال کر کے کانپ گیا اور اس ترمیم پر وہ عمر بھر تاسف کرتا رہا۔ وہ کہا کرتا تھا ”کاش اس دن میرا ہاتھ سوکھ گیا ہوتا، میرا قلب ناکارہ ہو جاتا، جب میں نے ایسا کرنے کا حکم دیا۔“

سعد اللہ خاں کو غریب رعایا کی پریشانیوں کا از حد احساس تھا۔ ایک بار سرکاری بقایاجات ادا کرنے والوں کی فہرست اس کے سامنے رکھی گئی۔ اس پر وزیراعظم نے یہ حکم لکھا ”اس برف کے مینار کو آفتاب کے سامنے رکھو۔ سورج کی گرمی کے بعد جو بچ رہے، اسے وصول کرنے کی کوشش کرو۔“ مفہوم یہ تھا کہ جن لوگوں میں بقایا ادا کرنے کی طاقت نہیں، ان سے وصول کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ ۱۶۶۱ء پنجاب میں پہلے خشک سالی کے باعث خریف کی تمام فصل خشک ہوگئی اور پھر اس شدت سے بارش ہوئی کہ سیلاب کی کیفیت پیدا ہوگئی اور ربیع کی فصل بوئی ہی نہ جا سکی۔ شاہجہاں نے کشمیر جاتے ہوئے نواب سعد اللہ خاں کو حالات کا جائزہ دے کر مؤثر اقدامات اٹھانے کا حکم دیا۔ سعد اللہ خاں نے کمال یکسوئی سے عوام کے دکھوں کا مداوا کیا اور حالات پر قابو پایا۔

سعد اللہ خاں نے مالگزاری میں کئی مفید اصلاحات کیں۔ شاہجہاں کی تخت نشینی کے وقت کل سالانہ آمدنی سترہ کروڑ روپے تھی جو سعد اللہ خاں جیسے قابل منتظم کی بدولت چوبیس کروڑ تک جا پہنچی۔ انھوں نے اپنے وطن چنیوٹ کے نومسلم تاجروں کو نئے شہر، شاہجہاں آباد میں لا کر بھی بسایا۔ جس جگہ یہ لوگ آباد ہوئے یہ پنجابی کٹڑہ کہلایا۔

ان پنجابی سوداگران نے شہر دہلی کی تجارت، کاروبار، صنعت و حرفت اور مسلمانوں کی اقتصادی خوش حالی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان سے قبل دہلی کی معاشرتی اور معاشی زندگی پر اس برادری کے افراد چھائے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کو دہلی میں آباد کر کے مرفع الحالی کے جو دروازے سعد اللہ نے ان پر کھولے، وہ دراصل حکیم علم الدین انصاری المعروف بہ وزیر خاں کا وہ قرض حسنہ تھا جو ایک ہم وطن کی دست گیری کے سلسلے میں سعد اللہ خاں پر واجب چلا آ رہا تھا۔

نواب سعد اللہ خاں صاحب قلم ہی نہیں صاحب سیف بھی تھا۔ کئی اہم فوجی مہموں میں فوج کی قیادت کی۔ بلخ، قندھار اور چتوڑ کی مہموں میں حصہ لیا۔ علمی و ادبی میدان میں بھی ان کی

شہرت عام تھی۔ سعد اللہ خاں کی وجہ سے شاہجہان عہد میں قابل اور دیانت دار آدمیوں کی قدر میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ سعد اللہ خاں کو مختلف علوم پر دسترس ہونے کے ساتھ ساتھ کئی زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔

ایک روز وہ خلاف معمول تاخیر سے دربار پہنچے۔ شاہجہاں نے سبب پوچھا، تو عرض کیا کہ ایک بیاض میں چند اچھے فقرے نظر آ گئے تھے، ان کی نقل میں مصروف ہو گیا کہ حضور میں پیش کروں گا۔ فقرے یہ ہیں:

۱۔ سلطنت کی بنیاد عدل پر قائم ہے۔

۲۔ ملک و مال میں افزائش شجاعت و سخاوت سے ہوتی ہے۔

۳۔ علما، فضلا کی ہم نشینی اور جاہلوں کے قرب سے پرہیز عقل و دانش کا نشان ہے۔

۴۔ اپنے نظریات پر کاربند رہنا چاہیے۔ سختیوں میں بھی رشتہ استقلال ہاتھ سے جانے نہ پائے۔

۵۔ دنیوی امور سے متعلق مناسب تدبیریں اختیار کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کرنی چاہیے تاہم سعی و کوشش کے باوصف جو صورت حال پیش آ جائے، اسے مقدر سمجھ کر شکر گزار رہنا لازم ہے۔

۶۔ حکومت محتاجوں کے لیے رحم و کرم پر موقوف ہے۔ یہ بھی جان لینا چاہیے کہ حاجت مندوں کی ضرورتیں اس طرح پوری کرنی چاہئیں کہ انسان خود محتاج نہ ہو جائے۔

۷۔ امور ملکی کا انصرام وزیروں کے مشورے اور صوابدید سے ہو۔

۸۔ نصرت و ظفر خدا کے پاک بندوں سے طلب ہمت پر موقوف ہے۔

۹۔ تندرستی کی آرزو اس بنا پر کی جائے کہ مصیبت زدوں کے دکھ کا ازالہ کیا جا سکے۔

شاہجہاں کا بیٹا، شہزادہ دارالشکوہ نواب سعد اللہ خاں سے پرخار رکھتا تھا۔ جبکہ انھوں نے ہمیشہ اس سے محبت و شفقت کا سلوک روا رکھا۔ دارالشکوہ کی کوتاہ اندیشیوں سے شاہجہاں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ دارالشکوہ کی نسبت شہزادہ اورنگ زیب کو سعد اللہ خاں سے خاص انس تھا۔ بلکہ انھیں اورنگ زیب کے استاد ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ دونوں کے مابین ذاتی اور خاندانی محبت و الفت کے جذبات موجود تھے۔

سعد اللہ خاں کو آخری عمر میں قولنج کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ دو مہینے قرب خاں سے علاج کرایا مگر افاقہ نہ ہوا۔ بالآخر اسی بیماری کے سبب ۱۷ اپریل ۱۶۵۶ء کو فضائل دانش و تدبر اور مکارم علم و دیانت کا یہ آفتاب افق حیات سے ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ جسد خاکی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے احاطہ مزار میں دفن ہوا۔ شاہجہاں کو سعد اللہ خاں کی وفات کا بہت رنج ہوا۔ اس نے ایک مکتوب لکھا جس میں درج ہے کہ وہ مملکت کا اعلیٰ ترین فرد اور ہر دلعزیز دیوان تھا۔ بڑے ظاہری اور باطنی کمالات کا مالک تھا۔

نواب سعد اللہ خاں فنون لطیفہ کا ذوق بھی رکھتا تھا۔ اس ذوق کی تسکین کے لیے انھوں نے دہلی، آگرہ، متھرا، سعد آباد اور لاہور میں عمارات تعمیر کرائیں۔ کچھ تعمیرات بادشاہ شاہجہان کے حسب الحکم انجام دیں۔ مثال کے طور پر بادشاہ کے حکم سے جامع مسجد دہلی تعمیر کرائی اور زرنگار حویلی (دہلی) بنوائی۔ اس کے ساتھ بازار بنوایا جو بازار سعد اللہ خاں کہلایا۔ دہلی میں ان کے نام پر ایک چوک بھی تھا۔

مسجد فتح پوری، بیگم کی سرائے، سعد آباد متھرا، شاہی مسجد چنیوٹ، رنگ محل لاہور، حویلی پتھراں والی لاہور، سعد اللہ پور گجرات اور سرائے سعد آباد جھبر کی تعمیرات بھی فن تعمیر سے ان کے لگاؤ کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ دہلی کے لال قلعہ کی دو محرابوں پر سعد اللہ خاں کا انشا کیا ہوا کتبہ سونے کے پانی سے لکھا ہے۔ ان نثری جواہر ریزوں کے بعد علامی سعد اللہ خاں کے اشعار نہایت خوش خط باب زر لکھے ہیں۔

مختصر یہ کہ سعد اللہ خاں برصغیر پاک و ہند کی وہ نامور شخصیت ہیں جو ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے، مگر اپنی علمی قابلیت اور انتظامی صلاحیت کے سبب مختصر مدت کے اندر ہندوستان کے اعلیٰ ترین عہدے پر جا پہنچے۔ وہ بلاشبہ ایک ادارہ تھے جس کے اندر سے علم و حکمت، تدبر، سیاست اور فنون لطیفہ کے دریا پھوٹ پڑے۔

جنگ ستمبر کے دن

ان دنوں کا ولولہ خیز قصہ جب افواجِ پاک اور پوری قوم متحد ہو کر دشمن کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن گئی

سعد اختر

رات کی تاریکی نے واہگہ بارڈر سے ملحق سرحدی گاؤں ”لابان والا“ کو اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔

۵ ستمبر کی رات قریباً اپنا سفر طے کر چکی تھی، چار سو نفوس پر مشتمل چھوٹا سا سرحدی گاؤں، لابان والا مکمل طور پر سناٹے کی لپیٹ میں تھا۔ البتہ کبھی کبھار کسی آوارہ کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دے جاتی جس سے فضا میں ارتعاش پیدا ہو جاتا۔ گاؤں کے تمام لوگ محوِ خواب تھے۔ لابان والا میں رینجرز والوں نے ایک چیک پوسٹ بھی قائم کر رکھی تھی۔ اس پر مامور رینجرز کے شاہین سرحدی نگرانی کا کام انجام دیتے۔ اسمگلروں اور دشمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا بھی انہی کی ذمے داری تھی۔ گاؤں کے باہر ایک اونچا ٹاور نصب تھا جس پر رینجرز کے جوان بیٹھ کر سرحد کے پار ہونے والی سرگرمیوں کی دوربین کے ذریعے چوبیس گھنٹے کڑی نگرانی کرتے۔ نگرانی کرنے والوں کی ڈیوٹیاں ہر دو گھنٹے بعد بدل جاتی تھیں۔ یہ سلسلہ چوبیس گھنٹے اسی طرح جاری رہتا۔

لیکن اس رات لابان والا کے مکینوں کو قطعی معلوم نہیں تھا کہ اگلی صبح اُن پر یہ قیامت گزرے گی کہ پاکستان کا ازلی دشمن بھارت اچانک اُن پر حملہ کر دے گا۔ سترہ سالہ صابرہ بھی اپنے مکان کے صحن میں سوئی ہوئی تھی۔ اُس کے دائیں جانب

چھوٹے بھائی دس سالہ ارشد اور بائیں جانب والد نور دین اور والدہ سکینہ بی بی کی چارپائیاں تھیں۔ وہ سب گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔

فجر ہونے میں ابھی ایک گھنٹا باقی تھا۔ تمام گھر والے نماز کے وقت باقاعدگی سے اٹھ جایا کرتے۔ یہ اُن کا روز مرہ معمول تھا لیکن تین بجے کے قریب ایک زوردار دھماکے نے پورے گاؤں کو لرزا دیا۔ صابرہ چارپائی پر اٹھ بیٹھی۔ نور دین اور والدہ سکینہ بی بی کی بھی آنکھ کھل گئی۔ بھائی ارشد بھی اپنی چارپائی پر ہلنے لگا۔ "یااللہ! کیسا دھماکا ہے یہ؟" صابرہ نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ پھر اپنے والد اور والدہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی حیرت زدہ تھے کہ کیسی دل ہلا دینے والی آواز ہے۔

نور دین سابقہ فوجی تھا، سمجھ گیا کہ یہ گولے کا دھماکا ہے۔ اس وقت نور دین کے ذہن میں فوراً خیال آیا "کہیں دشمن نے تو حملہ نہیں کر دیا"؟ پھر خود ہی جواب اس کے ذہن میں منڈلانے لگا۔ "نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، بھارت ایسی جرأت کبھی نہیں کر سکتا۔" لیکن یہ ایک گولے کی آواز نہیں تھی۔ وقفے وقفے سے مزید کئی گولوں کی گرج دار آوازیں فضا میں گونجنے لگیں۔ پورا گاؤں لرزنے لگا اور سبھی مکین بیدار ہو گئے۔ نور دین، صابرہ، سکینہ بی بی اور دوسرے گاؤں والے گھروں سے باہر نکل آئے۔ انھیں یقین ہو گیا کہ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے۔

اس وقت رینجرز بطور سرحدی فورس سرحد پر موجود تھے۔ ان کے پاس صرف ہلکے ہتھیار تھے۔ لیکن وہ انہی سے دشمن پر فائر کر رہے تھے۔ دشمن جو طاقت میں پانچ گنا زیادہ تھا، بی آر بی نہر کی طرف پیش قدمی کرنے لگا۔ یہ پاکستان کی مضبوط دفاعی لائن تھی۔ گو تب وہاں کوئی فوجی موجود نہیں تھا۔ جی ایچ کیو کو بھارت کے اس بزدلانہ حملے کی اطلاع ہو چکی تھی۔ صدر پاکستان فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب خاں کو بیدار کر حملے کی اطلاع دی گئی۔ سیالکوٹ کے محاذ پر بھی دشمن کی پیش قدمی ۶۰۰ ٹینکوں کے ساتھ جاری تھی۔ اس نے مغربی سرحد پر تمام اہم محاذ کھول دیے تھے۔ وہ واہگہ اور سیالکوٹ کے سرحدی علاقے سے بڑھ کر پاک فوج کی کمک و رسد کے تمام راستے بند کرنا چاہتا تھا۔ اس کے مذموم عزائم بہت خطرناک تھے۔ اس وقت رینجرز اہلکاروں نے سرحد کی حفاظت کا مشکل ترین کام سنبھالا۔ شہادتیں بھی ہو رہی تھیں لیکن وہ ملک و قوم کی حفاظت کے لیے سینہ سپر تھے۔

واہگہ کے سرحدی دیہات لاہان والا، اچی چونڈل، رچ میاں وغیرہ میں اگرچہ خوف کا عالم تھا۔ کافی لوگ دو تین گھنٹوں ہی میں نقل مکانی کر کے محفوظ مقامات پر اپنے عزیز و اقارب کے ہاں جانا شروع ہو گئے۔ لیکن نور دین اور اُس کی بیٹی صابرہ نے فیصلہ کیا کہ وہ ہرگز گاؤں نہیں چھوڑیں گے۔

دشمن کی گولا باری تیز ہو چکی تھی۔ رات نے بھی اپنا سفر طے کر لیا۔ اب بارود کی بو میں رچی بسی ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی چمکتی دمکتی صبح نمودار ہوئی۔ نور دین صبح کی ان روپہلی کرنوں میں اپنے فوجی دستوں کو کنٹرول لائن کی طرف جاتے دیکھنے لگا۔ جہاں اس وقت گھمسان کا معرکہ ہو رہا تھا۔ جنگی جہاز بھی فضا میں اڑنے لگے تھے۔ بڑا گمبھیر ماحول تھا۔ ان دنوں صرف اخبارات اور سرکاری ریڈیو ہی عوام تک کسی بھی خبر کی رسائی کا اہم ذریعہ تھے۔

۶ ستمبر کی صبح اخبارات شائع ہو چکے تھے جن میں حملے سے متعلق کوئی خبر نہیں تھی۔ وجہ یہی کہ جس وقت حملہ ہوا، اخبارات مارکیٹ میں آ چکے تھے۔ اسی لیے لوگ تازہ ترین حالات جاننے کے لیے ریڈیو کے گرد جمع تھے۔ معمول کی نشریات روک کر صرف بھارتی حملے کی خبر دی جا رہی تھی۔ لوگ بی بی سی ریڈیو بھی سن رہے تھے جو بُری خبریں دے رہا تھا۔ اس نے یہ جھوٹی اور بے بنیاد خبر دی کہ بھارتی فوج نے لاہور پر قبضہ کر لیا ہے اور اس کے افسروں اور جوان لاہور جم خانہ میں فتح کا جشن منا رہے ہیں۔ پاکستان اور بیرون ملک مقیم پاکستانیوں میں خاصی تشویش پھیل گئی، لیکن وہ لوگ جو لاہور میں تھے، اس خبر کو کیسے سچ مان سکتے تھے؟ تاہم بی بی سی اور انڈین ریڈیو "آکاش وانی" سے

ایسی بے بنیاد خبریں نشر کی جا رہی تھیں، جو لوگوں میں خوف پھیلانے لگیں۔ پاکستانی میڈیا نہ ہونے کے برابر تھا، اس لیے بی بی سی اور آکاش وانی کا منفی پروپیگنڈا پوری دنیا پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ اس کے اثرات پاکستان پر پڑ رہے تھے۔ غیر ممالک میں مقیم پاکستانی تو اس صورت حال پر بہت فکر مند تھے۔

اس دوران ریڈیو پاکستان سے اعلان کیا گیا کہ صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خاں ٹھیک گیارہ بجے قوم سے خطاب کریں گے۔ یہ اعلان سن کر لوگ جوق در جوق ایسی جگہوں پر جمع ہونے لگے جہاں ریڈیو موجود تھا۔ یہ یاد رہے کہ ان دنوں ریڈیو سیٹ بھی کہیں کہیں اور کسی کسی کے پاس ہی ہوتا تھا۔ وہ صرف سیلوں (بیٹری سیل) سے چلتا۔ گیارہ بجے، تو ریڈیو پاکستان سے اناؤنسر کی آواز سنائی دی جو کہہ رہا تھا ”اب صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خاں قوم سے خطاب کریں گے۔“ اس اعلان کے بعد فضا میں قومی ترانہ گونجنے لگا۔ ”پاک سرزمین شاد باد، کشورِ حسین شاد باد“ ترانے کے فوری بعد ایک گرج دار آواز سنائی دی جو صدر جنرل محمد ایوب خاں کی تھی۔ وہ دشمن کو للکارتے ہوئے گویا ہوئے:

”تم نے کس قوم کو للکارا ہے۔ جب تک دشمن کی توپوں کے دہانے ہمیشہ کے لیے بند نہیں ہو جاتے، ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔“ صدر کی ولولہ انگیز تقریر پر پوری قوم یک جان ہوگئی۔ کسی سندھی، پنجابی، پٹھان اور بلوچی کی تخصیص نہ رہی۔ فوج تو اپنے محاذوں پر دادِ شجاعت دے ہی رہی تھی، قوم بھی دشمن کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن گئی۔

لاہور، قصور، سیالکوٹ، چونڈہ، چھمب جوڑیاں، شکر گڑھ اور ہیڈ سلیمانکی سیکٹر میں بھی دشمن فوج جدید روسی اسلحے سے لیس حملہ آور تھی۔ ہماری فوج بھی بیرکوں سے نکل کر سرحدوں پر پہنچ گئی اور دشمن کا مقابلہ کرنے لگی۔ اس نے نہ صرف یلغار روکی بلکہ بعض بھارتی علاقوں کی طرف پیش قدمی بھی شروع کر دی۔ اس دوران بھارتی جنگی جہازوں نے پاکستان کے مغربی حصے پر بمباری کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہ فضائی حملے اکثر رات کو ہوتے جس کے باعث پورا ملک ”بلیک آؤٹ“ میں ڈوبا رہتا۔ پاک فوج نے صورت حال کے پیش نظر تمام اہم عمارتوں اور دریائی پلوں پر جو اہم شہروں کو ایک دوسرے سے ملاتے تھے، طیارہ شکن توپیں نصب کر دیں۔ ہمارے جنگی جہاز بھی دشمن کے علاقوں میں جا کر کارروائیاں کرنے لگے۔ ایک فضائی حملے میں ہمارے ایک جانباز ہواباز نے پٹھان کوٹ ایئربیس کو جنگی جہازوں سمیت مکمل طور پر تباہ کر دیا۔

۶۵ء کی جنگ میں لاہور بھارتی جارحیت کا اہم مرکز تھا۔ بھارت نے وہاں اپنی تمام فوجی طاقت مرکوز کر دی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر لاہور پر قبضہ ہو گیا، تو پورے پاکستان کا رابطہ کٹ جائے گا اور وہ آسانی سے اپنا ہدف حاصل کر لیں گے۔ مگر میجر عزیز بھٹی نے جو اس وقت واہگہ کی کمان سنبھالے ہوئے تھے، نہایت جواں مردی سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ ان کے پاس بہت کم نفری تھی اور ہتھیاروں کی تعداد بھی محدود تھی لیکن وہ قطعی خوفزدہ نہیں ہوئے۔ وہ خود اگلے مورچوں پر بہادری سے دشمن کو منہ توڑ جواب دینے لگے۔ دشمن کو محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت بڑی نفری مقابلے میں ہے۔ دونوں جانب سے گولا باری اور جدید گنوں سے فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ اس اثنا میں ایک گولا میجر عزیز بھٹی کو آ کر لگا اور وہ شہید ہو گئے۔ انھیں اس بہادری کے صلے میں حکومت پاکستان نے سب سے بڑے فوجی اعزاز ”نشان حیدر“ سے نوازا۔

لایان والا کے وہ لوگ جو نقل مکانی کر گئے تھے، اپنی بہادر افواج کی فتوحات کا سن کر واپس آ گئے۔ تاہم صابرہ، نورین اور سکینہ بی بی نے ان حالات میں بھی گاؤں نہیں چھوڑا۔ وہ جنگ کے سترہ دنوں میں گاؤں ہی میں رہے۔ گاؤں کے مکینوں نے جہاں اپنی بہادر افواج کا حوصلہ بڑھانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، وہاں ریڈیو پاکستان سے نشر ہونے والے جنگی ترانے ان کے جوش و جذبے میں اضافہ کرتے رہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ہماری مسلح افواج کے ساتھ ساتھ یہ جنگ ہمارے شاعروں، موسیقاروں اور گلوکاروں نے بھی لڑی تو بے جا نہ ہوگا۔ ریڈیو پاکستان لاہور کا کردار اس جنگ میں ثقافتی محاذ پر بڑا اہم رہا۔ وہاں سنٹرل پروڈکشن کے سینئر پروڈیوسر اعظم خاں میوزک کی ریکارڈنگ کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ جیسے ہی جنگ کی اطلاع آئی، ریڈیو پاکستان لاہور کے سنٹرل پروڈکشن نے اپنی معمول کی ریکارڈنگ روک دی۔ اسلام آباد ہیڈ کوارٹر سے ہدایت ملی کہ شاعروں سے جنگی گیت لکھوائے جائیں جن کی فوری ریکارڈنگ کا سلسلہ بھی شروع کیا جائے، تو پروڈیوسر اعظم خاں رابطے کرنے لگے۔ شعرا میں صوفی تبسم سرفہرست تھے۔ وہ ایک ہی کال پر ریڈیو پاکستان سنٹرل پروڈکشن کی عمارت میں پہنچ گئے اور جنگی ترانوں کی تیاری کا عمل شروع ہوگیا۔ ریڈیو کے تنخواہ دار موسیقار بھی بلالیے گئے۔ میڈم نور جہاں، مسعود رانا، مہدی حسن اور عنایت حسین بھٹی جیسے نامور گلوکاروں سے بھی اعظم خاں کا رابطہ ہوگیا۔ توپوں کی گھن گرج اور فضا میں جنگی جہازوں کی آمدورفت اور سائرنوں کی گونج میں جنگی ترانے لکھے جانے لگے جن کی دھنیں بھی اسی وقت تیار ہورہی تھیں جبکہ انھیں گانے کے لیے گلوکار بھی اسٹوڈیوز میں موجود تھے۔ جیسے ہی کوئی نغمہ ریکارڈ ہوتا، فوراً ہی اسے نشر ہونے کے لیے متعلقہ ڈیپارٹمنٹ بھیج دیا جاتا۔ پھر وہ ترانہ ریڈیو کے ذریعے پورے ملک میں گونجنے لگتا۔

"ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے" نشر ہوا تو قوم اور محاذ جنگ پر لڑنے والے فوجیوں میں ولولہ تازہ پیدا ہوگیا۔ اسی طرح میریا ڈھول سپاہیا، میرے نغمے تمہارے لیے ہیں، اے وطن کے شہیدو، رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو۔ بانکے نی جرنیل نی، کرنیل نی، جاگ اٹھا ہے سارا وطن ساتھیو، مجاہدو جیسے جنگی ترانوں نے جنگ کی کایا ہی پلٹ دی۔ قوم اور فوج میں جو جوش و جذبہ پیدا ہوا اس نے دشمن کو ہر محاذ پر شکست دی۔ ہماری دھاک ہر بھارتی فوجی اور باسی پر بیٹھ گئی۔ اس سترہ روزہ جنگ میں اپنے سے پانچ گنا بڑے دشمن کو شکست دے کر پاک فوج اور پوری قوم نے جس میں فن کار، شاعر، گلوکار، موسیقار اور ہر مکتبہ فکر کے لوگ شامل تھے، یہ ثابت کردیا کہ ہم ایک بہادر فوج اور بہادر قوم ہیں۔ گاؤں لابان والا آج بھی آباد ہے۔ نوردین اور اس کی بیوی سکینہ بی بی فوت ہوچکے۔ صابرہ زندہ ہے۔ اس کی شادی ہوچکی جو ایک فوجی سے ہوئی۔ صابرہ کا چھوٹا بھائی ارشد بھی فوج میں چلا گیا اور اب بھی فوج میں ہے۔ ۶ ستمبر کو وہ اپنے باپ اور ماں کی قبروں کے علاوہ ان شہدا کی قبروں پر بھی ضرور حاضری دیتی اور فاتحہ پڑھتی ہے جو اس وطن کی حفاظت کے لیے قربان ہوگئے۔ اللہ شہدائے ستمبر پر ہزار بار اپنی رحمت نازل کرے اور جنت میں اونچا واعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

◆◆◆

اقوالِ حضرت ابوبکر شبلیؒ

☆ دنیا کو فراموش کردینا اور آخرت کو بھی یاد نہ کرنا زہد ہے اور معنی اس کے یہ ہیں کہ تمام اشیا سے دل موڑ کر خالق اشیا کی طرف دل کو متوجہ کرنا۔

☆ جس کسی کے دل میں دنیا اور آخرت کا خیال ہے اسے میری مجلس میں بیٹھنا حرام ہے۔

☆ اپنے آپ سے بڑھ کر مخلوق کی صلاحیت اور بہتری کے طلبگار رہنا جوانمردی ہے۔

☆ علم الیقین وہ ہے جو حضرات انبیائے کرامؑ کے ذریعے ہم تک پہنچتا ہے اور عین الیقین اسے کہتے ہیں کہ جس تک اس عالم میں رسائی ہی نہیں۔

☆ صادق کی علامت یہ ہے کہ حرام چیز کو منہ سے نکال دے۔

☆ فقیر کی علامت یہ ہے کہ وہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی چیز سے متوجہ نہ ہو۔

☆ اس کی عبادت شریعت ہے اس کی طلب طریقت اس کو دیکھنا حقیقت ہے اور سب سے بالاتر ذکر یہ ہے کہ مذکور کے مشاہدہ میں ذکر کو بھی بھول جاؤ۔

(انتخاب: عارف انیس، کراچی)

اے وطن کے سجیلے جوانو

شہدا اور غازیوں کی قربانیوں کو منفرد خراج تحسین

غزالہ توحید

۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے واسطے پاکستانی قوم اور پاک افواج کے جوش و جذبے، عزم اور قومی اتحاد کی علامت کے طور پر یاد کی جاتی ہے۔ آزمائش کے ایسے کڑے وقت میں جب دشمن نے اس قوم کو بے خبر اور سوتا جان کر رات کی تاریکی میں اس پر حملہ کیا، تو یہ پاکستان سے محبت اور اس کی حفاظت کا قومی جذبہ ہی تھا جس نے پوری قوم کو اتحاد کی ایک ایسی لڑی میں پرو دیا کہ یہ آنے والی نسلوں کے لیے رہتی دنیا تک ایک ضرب المثل بن گیا جسے بدر و حنین کے معرکوں سے بھی نسبت دی گئی۔

۱۹۶۵ء کی سترہ دنوں پر محیط یہ جنگ پوری قوم کے حوصلے اور ہمت کا امتحان تھی۔ اس نے دشمن کی جارحیت کا جس بہادری سے مقابلہ کیا، اس نے ثابت کر دیا کہ ہم مشکل وقت کے مقابلے کے لیے نہ صرف تیار بلکہ متحد بھی ہیں اور کوئی فروعی اختلاف اس اتحاد و یگانگت میں دراڑ نہیں ڈال سکتا۔ افواج پاکستان کی جانب سے بے مثال جرأت و بہادری اور شجاعت و جاں نثاری کا مظاہرہ کیا گیا اور اپنے سے کئی گنا بڑے دشمن کو ایسی زک پہنچائی کہ وہ بوکھلا کر رہ گیا۔

اپنی یقینی فتح کے خواب دیکھنے والا دشمن یہ جان گیا کہ اس قوم کی افواج پاک سرحدوں کی حفاظت کے لیے ہمہ وقت خبردار اور

چوکس ہیں اور انھیں میدانِ جنگ میں شکست دینا ممکن ہی نہیں۔
یہ افواجِ پاکستان پر پوری قوم کا اعتماد ہی ہے کہ آزمائش کی ہر گھڑی میں قوم کی نظریں اسی کی جانب اٹھتی ہیں اور وہ اپنی ہر پریشانی اور تکلیف کے لیے اسے ہی اپنا مسیحا سمجھتے ہیں۔ ہر زلزلے اور آسمانی آفت کے زمانے میں فوج کا کردار لائقِ تحسین رہا ہے۔ یہ افواجِ پاکستان کی ساکھ اور بلند کرداری ہے کہ اس کی بیرونِ ملک خدمات بھی قابلِ تقلید اور دوسروں کے لیے مثال ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے امن مشن کے دوران افواجِ پاکستان نے اپنے کردار کی بدولت ہی دنیا بھر سے عزت و احترام کی دولت سمیٹی۔

آج پاکستان کو جن بڑے بحرانوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان میں دہشت گردی سرِ فہرست ہے جس کے باعث ملک کو سلامتی کے ساتھ ساتھ شدید معاشی مسائل بھی برداشت کرنے پڑ رہے ہیں۔ پچاس ہزار سے زائد انسانوں کی قیمتی جانیں دہشتگردی کی نذر ہو چکی ہیں جن میں پانچ ہزار سے زائد فوجی جوان اور افسران بھی شامل ہیں۔

افسوس کا مقام یہ ہے کہ بیرونی دشمنوں نے ہماری اپنی صفوں میں موجود کالی بھیڑوں کو استعمال کرتے ہوئے پورے ملک ہی کو میدانِ جنگ بنا رکھا ہے جہاں نہ کوئی مذہبی عبادت گاہ محفوظ ہے نہ مذہبی اجتماع، نہ بازار ہی محفوظ ہیں اور نہ اسپتال۔ صوبہ خیبر پختونخوا و بلوچستان اور قبائلی علاقے سب سے زیادہ دہشتگردی کی لپیٹ میں ہیں۔ ان اندرونی دشمنوں سے ملکی دفاع کو یقینی بنانے کے لیے افواجِ پاکستان کو مجبوراً ان قبائلی علاقوں میں آپریشن کرنا پڑا جہاں ان دہشتگردوں نے اپنے ٹھکانے بنا رکھے تھے۔

مادرِ وطن کے دفاع کے لیے یہاں بھی افواجِ پاکستان کی قربانیوں اور شہادتوں کی روایت برقرار ہے۔ دہشتگردوں کے ختم ہونے سے اب بے یقینی اور عدم تحفظ کی فضا ختم ہو رہی اور رفتہ رفتہ عوام کا اعتماد بحال ہو رہا ہے اور شورش زدہ علاقے امن کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ ان علاقوں میں پناہ گزینوں اور بے گھر ہونے والے افراد کی آبادکاری کا سہرا بھی افواجِ پاکستان ہی کے سر ہے۔

سوات کے آپریشن راہِ حق، آپریشن راہِ راست اور آپریشن راہِ نجات کی کامیابی کے بعد جون ۲۰۱۴ء میں شمالی وزیرستان میں شروع ہونے والے آپریشن ضربِ عضب تک پانچ ہزار سے زائد فوجی جوان اور افسران اپنی جانوں کا نذرانہ دے چکے۔ وہ دشمنوں پر ایسی کاری ضرب لگانے میں کامیاب رہے کہ اب وہ بہت بوکھلا گئے ہیں۔ اسی بوکھلاہٹ میں اب وہ ان معصوم بچوں کو بھی نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے جن پر حملہ کرنا یا نقصان پہنچانا انسانی، مذہبی اور اخلاقی ہر اعتبار سے قابلِ مذمت ہے۔

۱۶ دسمبر ۲۰۱۴ء کو پشاور میں آرمی پبلک اسکول میں ہونے والا حملہ انسانیت پر حملے کے مترادف ہے جہاں کمسن معصوم بچوں اور ان کے اساتذہ کو نہایت بے دردی سے شہید کر دیا گیا۔ پاکستان کے اندر اور باہر شاید ہی کوئی صاحبِ دل انسان ہوگا جس کی آنکھیں اس انسانیت سوز سانحے پر اشکبار اور دل مغموم نہ ہوا ہو۔ اس المناک واقعے سے دہشتگردوں نے قیمتی جانوں کو نقصان تو پہنچایا ہی، دہشتگردی کے خلاف جنگ میں بالعموم پاکستانیوں اور بالخصوص افواجِ پاکستان کے حوصلوں کو آزمانے کی بھی کوشش کی۔

آفرین ہے اس قوم پر، اس کی افواج پر اور ان ماؤں اور بچوں کے حوصلوں اور ہمت پر کہ وہ اپنے دشمن کے خلاف ڈٹ کر کھڑے ہیں اور ان کے پائے استقلال میں ذرہ برابر لغزش نہیں آئی اور وہ ایک نئے عزم کے ساتھ آخری دہشتگرد کو صفحہ ہستی سے مٹانے تک لڑنے اور اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ان شہیدوں کا خون ہی ہے جس سے ہماری آزادی کی شمع روشن اور ہماری امیدیں قائم ہیں اور جب تک یہ مجاہد اپنے وطن پر جان قربان کرتے رہیں گے اس قوم کے حوصلوں کو شکست نہیں دی جا سکتی۔

چھے ستمبر یومِ دفاعِ پاکستان کے طور پر منایا جاتا ہے۔ یہ ان شہیدوں اور غازیوں کی قربانیوں کو یاد کرنے اور انھیں نذرانہ عقیدت پیش کرنے کا دن ہے جنھوں نے اس مادرِ وطن کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ جب تک قربانیوں کا یہ سلسلہ جاری ہے اس مملکتِ خداداد کی جانب کوئی میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔

◆◆◆

ستمبر ۱۹۶۵ء میں میڈم نور جہاں کی آواز میں

جنگ ستمبر

جنگ جب ریڈیو پاکستان کے ذریعے فضاؤں میں یہ پنجابی نغمہ "ایہہ پتر ہٹاں تے نہیں وکدے" گونجا تو ہر طرف "اللہ اکبر" کے فلک شگاف نعروں کی صدا سنائی دینے لگی۔ یہ صرف "بول" نہیں تھے "خراج تحسین" تھا اُن فوجی جوانوں اور افسروں کے لیے جو ملک کی سرحدوں کی حفاظت کا فریضہ انجام دیتے اپنے سے پانچ گنا دشمن کے سامنے سینہ سپر تھے۔ پھر "میریا ڈھول سپاہیا تینوں رب دیاں رکھاں" بھی انہی کے لیے تھا جو میڈم نور جہاں ہی نے ۶۵ء کی "جنگ" ہی میں گایا۔

یہ جنگی نغمہ نہیں "دعا" تھی جو میڈم نور جہاں اپنے فوجی افسروں اور جوانوں کو دے رہی تھیں جس میں شاعر کا احساس بھی شامل تھا اور دعاؤں کے ساتھ قوم کا عزم بھی۔ پھر انہی بہادر بیٹے فوجی جوانوں اور افسروں کے لیے ہی گایا گیا "رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو" جنگی محاذوں پر دشمن سے برسرِ پیکار فوجی جوانوں اور افسروں کا لہو گرماتا رہا۔ جب گلوکار مسعود رانا کی آواز میں "جاگ اٹھا ہے سارا وطن" گونجا، تو اس میں دشمنوں کے لیے پیغام تھا کہ فوج ہی نہیں سارا ملک جاگ رہا ہے۔ "خبردار رہنا۔"

جاگ اٹھا ہے سارا وطن

پاک فوج نے ان تھک محنت اور قربانیاں دینے کے بعد ملک کو محفوظ و مامون بنا دیا

سعد اختر

سرفروشانِ وطن کے کس کس کردار کا ذکر کروں، اُن کا تو ہر رُخ اور کردار ہی "انمول" ہے۔ میں نے آج کا یہ کالم اُن سرفروش مجاہدوں کے نام وقف کیا ہے، جنھوں نے وطن کی ناموس کے لیے جانوں کا نذرانہ پیش کرکے اس کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا اور اب بھی ادا کر رہے ہیں۔ میرے تمام الفاظ اُن سے منسوب ہیں، جو جوش وجذبے اور بہادری وہمت کی ایسی داستان ہیں جن کی مثال دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔

اگر ہم آج ملک میں آرام اور سکون کی زندگی گزار رہے ہیں یا اس کا تصور کرتے ہیں، تو اس کا تمام کریڈٹ پاک فوج کو جاتا ہے۔ سرحدی دشمن ہو یا اندرونی، فوج ہر محاذ پر ان سے نبرد آزما ہے، جس سے ہمارے اندر احساسِ تحفظ پیدا ہوا ہے۔ ورنہ ہم اس سے محروم ہوتے جا رہے تھے۔ لائن آف کنٹرول پر جب بھی دشمن کسی قسم کی جارحیت کا ارتکاب کرتا ہے، تو پاک فوج ہی ہے جو اسے جواب دینے کے لیے ہمہ وقت تیار نظر آتی ہے۔

اندرونی حالات بھی کافی عرصے سے انتہائی خراب چلے آ رہے تھے۔ دہشت گردوں یا انتہا پسندوں کی یورش نے خیبر پختونخواہ اور ملک کے دیگر کئی حصوں کو متاثر کیا ہوا تھا جن میں کراچی خصوصی طور پر دہشت گردوں کا ہدف تھا۔ حالات انتہائی دگرگوں تھے۔ لگتا تھا شاید ان میں کبھی بہتری نہ آئے۔ لیکن جب حکومت نے پاک فوج کو یہ ٹاسک سونپا کہ وہ امن کے ان دشمنوں کی سرکوبی کرے، تو فوج نے جنرل راحیل شریف کی قیادت میں ایک بڑے عسکری آپریشن کا آغاز کیا اور شبانہ روز محنت، انتھک کوشش، جدوجہد اور قربانیوں کے بعد بالآخر اس "ہدف" کے قریب پہنچ گئے جس کے لیے انھوں نے اپنے مشن کا آغاز کیا تھا۔

شکر ہے، آج فوج ہی کی وجہ سے فاٹا، خیبر پختونخواہ اور کراچی میں امن قائم ہے۔ ان علاقوں میں زبردست عسکری ایکشن کے بعد انتہا پسندوں یا دہشت گردوں کی کارروائیاں قریباً ختم ہو گئی ہیں اور امن تیزی سے اپنی اصل صورت میں واپس آ رہا ہے۔ روشنیوں کا شہر کراچی جس میں امن لانے کی خواہش ایک خواب بن کر رہ گئی تھی، اب دوبارہ روشنیوں کی طرف واپس آ رہا ہے اور اس کا امن بحال ہو چکا۔

اور یہ سب کچھ صرف پاک فوج ہی کی بدولت ممکن ہوا ہے۔ ہم اس کے لیے گیت بھی لکھیں گے، گائیں گے بھی اور اپنی تحریروں اور کالموں کے ذریعے بھی خراجِ عقیدت پیش کریں گے۔

پچھلے دنوں ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین نے پاک فوج اور رینجرز کے بارے میں جو غلیظ اور نازیبا زبان استعمال کی اُسے سب نے ناپسند کیا۔ اس پر ہم مذمت ہی نہیں کرتے بلکہ یہ مطالبہ بھی کرتے ہیں کہ ہماری عدالتیں اور حکومت الطاف حسین کے اس بیان کا سختی سے نوٹس لے۔ اگرچہ اس بیان پر الطاف حسین کے خلاف ملک بھر میں ۱۲۵ سے زائد مقدمات درج ہو چکے مگر یہ ناکافی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت الطاف حسین کے خلاف کارروائی کا آغاز حکومتی سطح پر کرے اور الطاف حسین کی فوج کے خلاف دشنام طرازی پر کارروائی کو یقینی بنائے تاکہ آئندہ کسی کو اس قسم کی جرأت نہ ہو۔

پاک مسلح افواج کی عزت وتکریم نہ صرف ہماری ذمے داری ہے، بلکہ ہماری اولین ترجیح بھی ہونی چاہیے۔ کیونکہ ملکی سرحدی تحفظ کے علاوہ کوئی بھی قدرتی آفت ہو، سیلاب کی صورتِ حال ہو یا زلزلے کی تباہ کاریاں، فوج ہی ہے جو ان حالات میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ مشکل ترین پہاڑی سلسلوں میں پاک فوج کا انجینئرنگ ونگ راہداری کے لیے نہ صرف طویل تر سڑکوں کی بنیاد رکھتا ہے بلکہ انھیں پایۂ تکمیل تک بھی پہنچاتا ہے۔

زلزلے کی تباہ کاریوں میں فوج کا بنیادی کردار دیکھا گیا ہے۔ زلزلے سے اجڑے شہروں کی دوبارہ آبادکاری جیسا مشکل ترین کام بھی فوج ہی انجام دیتی ہے۔ ہم اپنی فوج کو سلام پیش اور اس سے انتہائی عقیدت ومحبت کا اظہار کرتے ہیں۔ ♦♦♦

۱۹۱۷ء (۱۳۳۵ھ) میں پیدا ہونے والے پروفیسر منظور الحق صدیقی نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے، بی ٹی کیا۔ پینتیس سالہ سرکاری ملازمت میں ان کی پڑھائی ہوئی چالیس جماعتوں نے بورڈ کے اردو اور ریاضیات کے امتحان دیے۔ ان کا ایک بھی شاگرد فیل نہیں ہوا۔ اس سے ان کی اعلیٰ تدریسی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

انھوں نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ قیام پاکستان کے بعد سیاست کو یہ کہہ کر خیرباد کہہ دیا "میں ایک سرکاری ملازم ہوں، اب میں اپنے شعبے میں رہ کر تعمیر پاکستان میں حصہ لوں گا۔" رسائل و اخبارات میں ان کے لاتعداد مضامین شائع ہو چکے۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب لاہور میں تین مقالے شائع ہوئے۔ راولپنڈی سے تحریک پاکستان پر پہلی انگریزی کتاب "Live and let live" (جیو اور جینے دو) انھوں نے ۱۹۴۲ء میں ترتیب دے کر شائع کروائی۔

اس کے علاوہ ریاضیات پر تین نصابی کتابوں اور حسابی معموں پر ان کی کتاب "محفل معما گوئی" معرض وجود میں آئی۔ تاریخ و سوانح پر ان کی تصانیف میں سالار مسعود غازی، ہادی بریانہ، مآثر الاجداد، شاہ لطیف بری، نمونے کا ایک نوجوان، تاریخ حسن ابدال اور قائداعظم اور راولپنڈی شامل ہیں۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے اپنی کتاب "اسلامی مؤرخین" میں چودہ صدیوں کے پانچ سو بڑے مؤرخین میں پروفیسر منظور الحق صدیقی کو شمار کیا ہے۔ علم و فضل صدیقی گھرانے کا امتیاز ہے اور میراث بھی!

پروفیسر منظور الحق صدیقی

تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن اور ممتاز استاد کا دل افروز خاکہ

علامہ عبدالستار عاصم

جزیرہ نمائے عرب میں جب ہدایت کا نور چمکا، تو عرب کے شرفا میں جو چند پڑھے لکھے افراد شامل تھے، ان میں اس گھرانے کے جدِ امجد کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ نیک بخت اولاد اپنے اجداد کی میراث ضائع نہیں کرتی بلکہ اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتی ہے۔ منظور الحق صدیقی یقیناً ایسی ہی نیک بخت اولاد تھے جنھوں نے اپنے آبا کی میراث میں قابلِ قدر اضافہ کیا اور علم کو ہی اپنا وتیرہ بنایا۔ منظور الحق صدیقی کی تحقیقی ثقاہت کے قائل بابائے اردو اور مولانا غلام رسول مہر جیسے عبقری حضرات بھی تھے اور اسے سند مانتے۔

پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا پہلا بڑا کارنامہ قائداعظم کی صدارت میں یکم اور دو مارچ ۱۹۴۱ء کو لاہور میں پاکستان کانفرنس کا انعقاد تھا۔ قائداعظم کے مطبوعہ خطبہ صدارت کے اندرونی سرورق پہ کانفرنس کی مجلس عاملہ کے چالیس ارکان کی فہرست میں منظور الحق صدیقی کا نام چوتھے نمبر پر ہے۔ اس کانفرنس میں ایک قرارداد کی رو سے "پاکستان رورل پروپیگنڈا کمیٹی" قائم کی گئی جس کے آٹھ ارکان میں منظور الحق صدیقی بھی تھے۔ ان ارکان نے کسی بھی طالب علم کا ایک بھی تعلیمی منٹ ضائع کیے بغیر شدید مخالفت کے باوجود پنجاب کے سیاسی جمود کو ختم کرنے اور نظریہ پاکستان کو ایک تحریک کے طور پہ چلانے کا آغاز کیا۔

جون ۱۹۴۱ء میں منظور الحق صدیقی کے دورہ روجھان سے پاکستان رورل پروپیگنڈا کمیٹی نے اپنے کام کا آغاز کیا۔ انھوں نے روجھان میں شہری مسلم لیگ بنائی اور عہدیداروں کا انتخاب کر کے تحریک پاکستان کو پرجوش کارکن فراہم کیے۔ روجھان کے بعد انھوں نے راولپنڈی ضلع کی تنظیم نو کا کام انجام دیا۔ ۲۴ جولائی ۱۹۴۱ء کو اخبارات میں قائداعظم کا بیان شائع ہوا کہ اگر وزیراعظم پنجاب سر سکندر حیات خان اور دیگر مسلم لیگی وائسرائے کی نیشنل ڈیفنس کونسل سے مستعفی نہ ہوئے، تو ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی۔ پروفیسر منظور الحق صدیقی نے دیہی

بزدلی کا اعتراف

بھارتی فوج نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کو پچاس برس مکمل ہونے پر ملکی اخبارات میں اشتہارات شائع کیے ہیں جس میں حیران کن طور پر پہلی بار اپنی بزدلی تسلیم کر لی ہے۔ صفحہ اول کے ہندی اخبارات میں چھپنے والے ان اشتہارات میں اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ ۶۵ء کی جنگ میں بھارتی فوج نے بزدلی دکھائی۔ اشتہار کے مطابق اچھوگل کینال کے قریب ایک حملے میں بھارتی فوج نے پاکستان کا ڈر کر مقابلہ کیا۔

دوروں کا پروگرام موخر کر سر سکندر کے خلاف مہم کا آغاز کر دیا۔

۲۵ جولائی کو مختلف جلسوں میں تقریریں کیں اور برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو وقت کی ضرورت کے مطابق بیدار ہونے کی دعوت دی۔ منظور الحق صدیقی اور ان کے دو ساتھی، ظفر اللہ خان ملک اور چودھری نصر اللہ خان ۸ ستمبر ۱۹۴۱ء کو بمبئی میں قائداعظم کے دولت کدہ پر حاضر ہوئے۔ اس روز ڈھائی گھنٹے تک بات ہوتی رہی۔ اٹھتے وقت قائداعظم نے فرمایا "پرسوں میرے ساتھ چائے پیو۔" ۱۰ ستمبر کی شام پھر ڈھائی گھنٹے کی طویل نشست رہی۔ محترمہ فاطمہ جناح نے چائے بنائی۔

المختصر پروفیسر منظور الحق صدیقی اپنے آبا و اجداد کی اعلیٰ علمی، روحانی، مذہبی، سماجی روایات زندہ و تابندہ کرتے ہوئے تحریک قیام پاکستان، نوجوان نسل کی اعلیٰ خطوط پر تعلیم و تدریس اور عوام الناس کو تاریخ، حساب، سیاسیات وغیرہ میں اعلیٰ اور حق برحق معلومات، تصورات اور خیالات دینے کے لیے شہرۂ آفاق تصنیفات و تعلیمات فراہم کر کے ۲۷ جولائی ۲۰۰۳ء کو عالم فانی سے دار بقا کی جانب کوچ کر گئے۔ آپ کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ ورثا ان کی تعلیمات اور اپنے آبا و اجداد کی اعلیٰ روایات پر گامزن ہیں۔

◆◆◆

ایک کمانڈر کی محبوبہ

چھمب دی رانی

جان ہتھیلی پر رکھ کر اہل وطن کی خاطر عظیم کٹھنائیاں سہنے والے دلیر جوانوں کا روح پرور ماجرا

عبدالرحمٰن صدیقی

ہم سب آفیسرز میس میں، جسے زمین کھود کر ایک مورچے کی طرز پر بنایا گیا تھا، آرام سے بیٹھے گپ لڑا رہے تھے۔ دن بھر پہاڑیوں اور وادیوں میں جیپ کے تھکا دینے والے سفر کے بعد میس کی فضا میں خاص قسم کی سکون بخش حرارت تھی۔ میں پہلی بار اس بٹالین میں تب آیا تھا جب وہ چھمب کے علاقے میں برق رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس وقت سے میری مراد تین ستمبر کی شام ہے۔

توپ خانے کے کمانڈر نے جو ایک جوان میجر تھا، بڑے لاڈ سے مونچھوں کو تاؤ دیا اور مجھ سے پوچھا "کہیے، آپ کی چھمب دی رانی سے بھی ملاقات ہوئی کہ نہیں؟"

اس ناگہانی سوال کی کوئی تک میری سمجھ میں نہ آئی مگر میں نے دل رکھنے کی خاطر جواب دیا: "نہیں، صاحب، بدقسمتی سے ابھی تک تو نہیں ہوئی اور اگر کوئی مضائقہ نہ ہو، تو ابھی چل کر ملاقات کر لی جائے؟"

جواب ملا: "ذرا صبح تک صبر کیجیے۔ میں خود آپ کو اس کے پاس لے چلوں گا۔ آپ ضرور ملیے اس سے۔ اتنی پیاری اور لاڈلی ہے وہ، اور اس کے باوجود غضب کی نشانہ باز اور قتالہ! وہ جانتی ہے کہ اب وہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو قدر شناس ہیں۔"

اسرار کچھ اور گہرا ہو گیا۔ تاہم میں نے اپنی ظاہری بے پروائی میں فرق نہ آنے دیا۔ توپ خانے کا کمانڈر حسب معمول چونچال اور خوش نظر آ رہا تھا اور مزاج کا جو خاص قسم کا مزاج سپاہیوں میں ہوتا ہے، وہ اس میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس کی تر وتازگی میں مطلق فرق نہ آیا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے جنگ کے شدائد کا اس پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔ اس کا دمکتا ہوا چہرہ پہلے سے زیادہ بھرا بھرا معلوم ہو رہا تھا۔

میں نے کہا "نظر آتا ہے کہ جنگ تمھیں بڑی راس آئی۔ میں تو سمجھا تھا کہ اب تک تمھارا رنگ روپ پھیکا پڑ چکا اور آنکھوں کے ارد گرد جھریوں کا جال بچھا ہو گا۔ لیکن تمھیں دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی چھٹی سے واپس آئے ہو۔"

اس نے جواب دیا: "آپ کی بات زیادہ غلط نہیں۔ ایسے مزے کے دن زندگی میں پہلے نہ آئے تھے۔ ہر جگہ ہم نے دشمن کے پاؤں اکھاڑ دیے۔ ہماری توپوں نے دشمن کا جینا دوبھر کر دیا۔ ایسے تاک تاک کر گولے برسائے کہ حریف کے چھکے چھوٹ گئے۔ اللہ کا فضل جو شامل حال تھا۔"

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ خیالی

دیواروں والے اس زمین دوز میس میں کھانے کی سفری میز پر سفید دسترخوان بچھا تھا۔ ایک طرف ایک اور میز اور تپائی پر ہاتھ دھونے کے لیے گرم پانی سے بھرا جگ اور طشت رکھا تھا۔ رات کے کھانے کا وقت ہو چکا اور ہم سب بٹالین کمانڈر کے آنے کا انتظار کر رہے تھے جو معائنہ کرنے گئے ہوئے تھے اور آیا ہی چاہتے تھے۔ ہمارے علاوہ کوئی چھے افسر چاق چوبند نظر آ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ چستی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ نوجوان ایڈجوٹنٹ انتہائی تپاک سے میری خاطر مدارات اور مجھے ہر طرح کا آرام بہم پہنچانے کی سعی کر رہا تھا۔

اتنے میں کمانڈنگ افسر میس میں داخل ہوئے اور ہم سب ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

"آہاہ، یہ آپ ہیں۔" انھوں نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کو دوبارہ یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ آپ ذرا دیر سے آئے۔ خیر، دیر آید درست آید! پچھلی بار آپ کے جانے کے بعد یہاں خاصی گرما گرمی رہی۔ امید ہے، ادھر آپ کے آرام کا معقول بندوبست کر دیا گیا ہوگا؟"

"جی، بالکل! ایڈجوٹنٹ نے تو میرا اتنا خیال رکھا جیسے میں سچ مچ کوئی بہت اہم شخصیت ہوں۔"

"ارے میاں، جہاں تک اس بٹالین کا تعلق ہے تم اپنے آپ کو اہم شخصیت ہی سمجھو۔ بھئی، انھوں نے اپنی معشوقہ، چھمب دی رانی کا بھی تم سے ذکر کیا؟" کمانڈنگ افسر نے توپ خانے کے کمانڈر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں جناب! انھوں نے یہ وعدہ بھی کر لیا ہے کہ کل صبح اٹھتے ہی مجھے اس کے پاس لے چلیں گے۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا کہ انھوں نے وعدہ کر لیا۔ انھیں تو ہر وقت اسی کی دھن رہتی ہے۔ ہم سب کو کمانڈر ان چیف کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے چھمب دی رانی ہمارے حوالے کر دی۔ ایک پیالی چائے ہو جائے؟"

صاحب تحریر

جب ۱۹۶۵ء کی جنگ ہوئی، تو عبدالرحمٰن صدیقی پاک فوج کے میڈیا ونگ، انٹر سروسز پبلک ریلیشنز سے بحیثیت صحافی وابستہ تھے۔ آپ پھر مارچ ۱۹۶۷ء تا نومبر ۱۹۷۳ء ادارے کے سربراہ بھی رہے۔ بریگیڈیئر کے عہدے پر فائز تھے تو سبکدوش ہوئے۔ آپ نے زیرِ نظر ناقابل فراموش داستان جنگ ۱۹۶۵ء کے دوران لکھی تھی۔ عسکریات اور سیاست پر کتب بھی تحریر کر چکے۔

ایڈجوٹنٹ پہلے بھی مجھے چائے کی دو پیالیاں پلا چکا تھا لیکن انکار کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

چائے نوشی کے دوران سی او (کمانڈنگ افسر) نے مجھ سے بیرونی دنیا کی خیر خبر دریافت کی۔ میں نے جواب دیا "فی الحال تو خبروں کا مرکز یہ جگہ ہے جہاں میں بیٹھا ہوں۔ خبروں کے لیے ساری قوم کی نظریں آپ لوگوں پر جمی ہوئی ہیں۔ جہاں تک خبروں کا تعلق ہے، ہم لوگوں کے پاس، جو محاذ سے دور امن چین سے اپنے اپنے گھر بیٹھے ہیں، بھلا کیا رکھا ہے۔"

سی او منکسر انداز میں مسکرائے۔ وہ چالیس برس کے ہونے والے تھے لیکن اپنی عمر سے کہیں زیادہ پختہ کار نظر آتے۔ کہنے لگے: "ہم تو اپنا فرض پورا کر رہے ہیں۔ اصل میں تو خبریں آپ ہی لوگ تیار کرتے ہیں۔"

"میں تو آپ سب لوگوں سے خفا ہوں۔" توپ خانے کے کمانڈر نے گفتگو میں دخل دیتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگوں نے عوام سے بالکل ہی رابطہ قائم نہیں رکھا۔"

"خیریت تو ہے؟ آخر ہوا کیا؟ میرے پیشے کے نمائندوں سے آپ کیوں روٹھے ہوئے ہیں؟"

"ارے آپ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے!" اس نے کہا۔ اور میں حیران پریشان رہ گیا۔ یہ ایک اور معمہ تھا! میں فوری طور پر اس کا کوئی حل تلاش نہ کر سکا اور یونہی مسکرا کر رہ گیا۔

"میں آپ کو بتاتا ہوں کہ انھیں کیا رنجش ہے۔" سی او نے میری الجھن بھانپ کر کہا: "بھئی، آپ نے نور جہاں کا وہ گانا سنا ہی ہو گا۔ کیا بھلے سے بول ہیں اس کے؟ ... ہاں، وہی جس کے آخر میں آتا ہے "کرنیل نی، جرنیل نی۔" انھیں اس کا بڑا رنج ہے کہ اس گیت میں میجر کا سرے سے ذکر ہی نہیں۔ بات بس جرنیل اور کرنیل ہی پر ختم ہو کر رہ گئی۔ میں نے ان سے لاکھ کہا کہ بھئی، میجر کیا، زیادتی تو بریگیڈیئر کے ساتھ بھی ہوئی ہے۔ لیکن بھلا اتنی سی بات سے ان کو کہاں اطمینان ہوتا ہے۔"

سی او کی باتیں سن کر سب ہنسنے لگے۔

"جناب، کیا یہ حقیقت نہیں؟" توپ خانے کے کمانڈر نے پوچھا۔ "کیا آپ اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ یہ نہایت سنگین فروگزاشت ہے؟"

"انتہائی سنگین بلکہ ضرورت سے زیادہ سنگین ہے۔" زبردست قہقہوں کے ایک اور طوفان میں سی او نے زیرلب ہنستے ہوئے کہا۔

میز پر کھانا چنا جا چکا تھا۔ کھانا بہت لذیذ اور صحت بخش تھا۔ میٹھی ڈش کی جگہ ہمیں ربڑی پیش کی گئی۔ ربڑی بہت مزے کی تھی اور میں داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ سی او نے کہا: "یہ تو کچھ بھی نہیں۔ توپ خانے کے کمانڈر کو میٹھی ڈشیں بنانے بلکہ ایجاد کرنے میں کمال حاصل ہے۔ گولا باری کے دوران بھی انھیں کوئی نہ کوئی نسخہ سوجھ ہی جاتا ہے۔ ایک بار انھوں نے ہمیں جوہڑ کے پانی سے تیار کی ہوئی کھیر کھلائی۔ اس میں نہ دودھ کا پتا چل رہا تھا اور نہ چاولوں کا بلکہ وہ سرے سے کھیر تھی ہی نہیں، لیکن اس کے باوجود میٹھی تھی۔ تب ہمیں جس قسم کی صورت حال کا سامنا تھا، اس میں یہی غنیمت تھا۔ ایک اور مرتبہ ان حضرت نے ہمیں ایسے موقع پر، جب زور و شور سے گولا باری ہو رہی تھی، گاڑھی اور میٹھی چائے پلائی اور مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ اتنی اچھی چائے میں نے کبھی نہیں پی۔"

توپ خانے کا کمانڈر خوش ہو کر مسکرایا، تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ پھر اس نے پوری روداد سنائی کہ حملے کے دوران کس طرح ان سب نے یہ سیکھا کہ کھانے پینے کے لیے جہاں سے جو مل جائے اس پر گزارا کرنا چاہیے۔ وہ بلاتکلف جوہڑوں کا پانی پی جاتے۔ ان کی اس حرکت سے ڈاکٹر اکثر گھبرا جاتا اور کبھی کبھی جھنجھلاہٹ محسوس کرتا۔ نوجوان ڈاکٹر نے، جو میرے ساتھ بیٹھا تھا، توپ خانے کے کمانڈر کی بات سے اتفاق کیا۔

ڈاکٹر نے کہا: "جنگ کے دوران بٹالین کے جوان اور افسر جس طرح کھاتے پیتے رہے، وہ واقعی حیرت انگیز تھا۔ میں بیٹھا پریشان ہوتا رہتا کہ ان بے احتیاطیوں کا جانے کیا انجام ہو گا، لیکن کسی کو کچھ ہوا ہی نہیں۔ جو سپاہی لڑنے مرنے کا تہیہ کر کے میدان میں اترے، وہ ڈاکٹروں کے لیے ایک مکمل معمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ حفظان صحت کے موٹے موٹے اصولوں تک کی پروا نہیں کرتا، مگر اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔"

کمانڈنگ افسر نے فوجی کارروائی کی مجمل روداد ہمیں سنائی۔ کہنے لگے: "ہمیں جو کام سونپا گیا وہ ہم نے حکم ملنے کے چند گھنٹے کے اندر اندر پورا کر لیا۔ یکم ستمبر کی سہ پہر ہماری بٹالین توی ندی کے کنارے تک قبضہ جما چکی تھی اور کچھ ہی دیر بعد اس پار پہنچ گئی۔ دو ستمبر کو چھمب اور سکرانہ پر ہمارا پوری طرح قبضہ ہو گیا۔ جوانوں اور افسروں میں بے پناہ جوش اور عزم تھا اور ان کی واحد آرزو یہ تھی کہ ہر قیمت پر پیش قدمی جاری رکھی جائے۔ انھوں نے مشکلوں کا مقابلہ کرتے وقت کمال استقامت اور برداشت کا ثبوت دیا۔

"بعض اوقات ایسا ہوا کہ ہمارے پاس پینے کا پانی ختم ہو گیا۔ یوں سمجھیے کہ ہم سر سے پاؤں پسینے میں نہائے ہوتے مگر پینے کے لیے پانی کا ایک قطرہ بھی میسر نہ ہوتا کہ ہونٹ ہی تر کر لیتے۔ ندی کے ساتھ ساتھ اور پرلے کنارے پر دشمن نے قلعہ بند ناکے، کنکریٹ کے مورچے اور پھندے بنا رکھے تھے، لیکن کوئی چیز ہمارے جوانوں کو منزل مقصود تک پہنچنے سے نہ روک سکی۔ دشمن کی بھاری گولا باری کے باوجود ہم آگے بڑھتے رہے اور ان کے مورچوں میں جا دھمکے۔ دشمن جلد ہی سر پر پاؤں رکھ بھاگا اور پیچھے بہت سا ساز و سامان چھوڑ گیا جس میں میدانی توپوں اور ٹینکوں سے لے کر اشیائے خورونوش کے ذخیروں تک سبھی کچھ شامل تھا۔"

سی او نے مزید کہا: "بہت مضبوط دفاعی انتظامات کے باوجود دشمن نے انتہائی بودے پن کا مظاہرہ کیا۔ شاید ہی کبھی اسے اتنی جرأت ہوئی کہ پیش قدمی کرتی پاکستانی فوجوں سے مقابلے کے انتظار میں ڈٹا رہے۔ ہمیشہ یہی لگتا تھا کہ وہ بچ بچ کر لڑ رہے ہیں۔ ہم نے جو بھارتی قیدی بنائے ان میں سے بہت سے گرفتار ہونے کے لیے بے چین معلوم ہوتے تھے۔"

بھارتی جنگی قیدیوں کے بارے میں سی او نے کہا "ان کے ساتھ مقدور بھر اچھا سلوک کیا گیا۔ قیدیوں سے سلوک کے بارے میں جنیوا کے معاہدے کی ہر شرط ہم نے پوری کی بلکہ سچ پوچھیے تو اتنا عمدہ برتاؤ کیا کہ خود معاہدے کو مات کر دیا۔ مغلوب اور ہارے ہوئے دشمن سے رحم دلی اور فیاضی کے برتاؤ کی ہماری اسلامی روایات جنگی قیدیوں کے بارے میں بین الاقوامی معاہدے سے بہتر ہے۔" پھر انھوں نے مثال دے کر بتایا کہ ان کے جوانوں اور افسروں نے کس طرح اپنے حصے کا راشن قیدیوں کو دے دیا جو فی الواقع فاقہ زدہ نظر آ رہے تھے۔

سی او کہنے لگے: "جب انھیں گرفتار کیا گیا، تو ان میں سے بعض بہت سہمے سہمے نظر آئے۔ ان کے افسروں نے انھیں یہ کہہ کر ڈرا دیا تھا کہ پاکستانی تمھیں جان سے مار دیں گے۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ ان کے افسروں نے انھیں خواہ مخواہ ڈرانے کی کوشش کی تھی اور پاکستانی ہر طرح سے ان کی مدد کر اور سہولتیں بہم پہنچا رہے ہیں، تو ان کے خدشات دور ہوتے دیر نہ لگی۔ یہاں تک ہوا کہ پاکستانیوں نے اپنے حصے کے تازہ پھل، مثلاً سردے، تک انھیں دے دیے۔ زخمیوں کو فوراً طبی امداد دی گئی۔ ان کی آنکھوں کی پٹیاں تک کھول دی گئیں۔ دم بھر میں وہ بالکل مطمئن ہو گئے اور ہنسنے اور دل بہلانے لگے۔"

کھانا ختم ہونے کے کچھ ہی دیر بعد سی او اٹھ کر چلے گئے۔ انھیں اپنے بنکر میں کچھ کام کرنا تھا۔ ہم لوگ آرام سے بیٹھے گپ لڑاتے اور کافی اور سبز چائے پیتے رہے۔

پھر ہم نے کہا کہ اب سونا چاہیے۔ مجھے اپنے بنکر تک پہنچا دیا گیا۔ میرا بستر لگ چکا تھا۔ باہر کے درجۂ حرارت کے مقابلے میں، جو حرارت کے بجائے لفظ "انجماد" سے قریب تھا، کمرا خوب گرم اور بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ تھکن اور خوش خوراکی کی وجہ سے مجھ پر خوشگوار سی آلکسی طاری تھی۔ تار سے لٹکی ہوئی ایک لالٹین کی پیلی روشنی ارد گرد پھیلی ہوئی تھی۔ ایک ایسے آدمی کے لیے، جو محاذِ جنگ کے معمولات کا پوری طرح عادی نہ ہوا ہو، یہ ماحول رومان پرور تھا اور پراسرار بھی۔ میں نے گرمی پیدا کرنے کے لیے ہاتھوں کو زور سے ملا، جلدی جلدی کپڑے بدلے اور گرم لحاف میں گھس گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ کچھ دیر پڑھوں گا، مگر مجھے جلد ہی نیند آ گئی۔

پھر یکایک میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ لالٹین ابھی تک جل رہی تھی۔ مجھے اندازہ نہ ہوا کہ کیا وقت ہے۔ میں نے گھڑی دیکھی، صبح کے پانچ بجے تھے۔ بٹالین کے ہیڈ کوارٹرز کے چاروں طرف سے اذان سنائی دے رہی تھی۔ شروع میں آوازیں دھیمی دھیمی تھیں لیکن جلد ہی "اللہ اکبر" کی زبردست گونج میں تبدیل ہو گئیں۔ یہ فوج کے جوان تھے جو خندقوں

سے فجر کی اذان دے رہے تھے۔

وہ محاذ پر فرائض انجام دیتے دیتے تھک کر چور ہو جاتے۔ دشمن ان کے قریب تھا، لیکن یہ دونوں باتیں انھیں نماز ادا کرنے سے کبھی باز نہ رکھ سکی تھیں۔ آس پاس کی پہاڑیاں اذان سے گونج رہی تھیں۔ میرا دل عجیب طرح کے دبدبے اور احترام سے معمور ہو گیا۔ "یہ غازی، یہ تیرے پراسرار بندے، جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی۔" بستر پر لیٹے لیٹے اقبال کا یہ مصرع یکایک مجھے یاد آیا۔ ادھر لالٹین کی لو بھڑکی اور گل ہو گئی۔ بنکر میں اندھیرا چھا گیا۔ میں بستر میں لیٹا اقبال کا مصرعہ دہراتا رہا۔

آدھے گھنٹے بعد اردلی میرے لیے گرم چائے کا مگ لایا۔ چائے پی کر میں نے جلدی سے شیو کی، نہایا اور کپڑے بدل کر ناشتا کرنے میس پہنچا۔ توپ خانے کا کمانڈر پہلے ہی سے وہاں میرا منتظر تھا۔ ہم نے جلدی سے پوریوں، انڈوں اور توسوں پر مشتمل ناشتا کیا اور چھمب دی رانی سے ملنے روانہ ہو گئے۔ راستے میں توپ خانے کے کمانڈر نے مجھے چھمبریاں دی ڈھوک کی مسجد بھی دکھائی جسے بھارتی گولا باری سے بری طرح تباہ ہو جانے کے بعد، پاکستانی توپچیوں نے مرمت کر کے ازسرنو تعمیر کر دیا تھا۔ صبح کی دھوپ میں سفید مسجد جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔

"بھارتی گولا باری سے یہ مسمار ہو گئی تھی، لیکن ہمارے جوانوں نے اسے پھر پہلے جیسا بنا دیا۔" اس نے کہا۔ "اب ہم پانچوں وقت کی نماز یہیں پڑھتے ہیں۔" اس میں شک نہیں کہ جوانوں نے نہایت عمدہ کام کر کے دکھایا تھا اور وہ بھی اس حالت میں کہ رات دن بیشتر وقت وہ اپنے معمولات کی انجام دہی میں لگے رہتے تھے۔

صبح کی تازہ ہوا میں لمبی لمبی گھاس اور گیہوں کی بالیوں کے گویا مخمور ہو کر لہرانے سے علاقہ چھمب کی خوبصورتی دوبالا ہو گئی تھی۔ وہاں ہر طرف پہاڑیاں ہی پہاڑیاں تھیں۔ کبھی اترائی آ جاتی، کبھی چڑھائی۔ بیچ میں توپ ندی ریشم کے نیلے فیتے کے مانند بل کھاتی جا رہی تھی۔ موسم نے ونڈ شیلڈ گرا رکھی تھی اور سرد ہوا کے جھونکے میرے چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔ توپ خانے کا کمانڈر تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے جوانوں کے مثالی حوصلے اور عزم کا ذکر کرتا رہا۔ جو کام ان کے سپرد کیا گیا تھا، اسے پورا کرنے کے سوا انھیں کسی چیز کی پروا نہ تھی۔

وہ کہنے لگا: "اس کے برعکس دشمن کا حوصلہ بے حد پست تھا۔ اس بات کی تصدیق خود جمعدار لال سنگھ نامی بھارتی جنگی قیدی نے کی۔ وہ پلاٹون کمانڈر رہا تھا۔ کہتا تھا کہ کوئی جھاڑی ایسی نہ تھی جس کے پیچھے بھارتیوں کو اپنے خیال میں کوئی پاکستانی چھپا نظر نہ آتا ہو۔"

پون گھنٹے بعد ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں لاڈلی چھمب دی رانی کیموفلاج کا جال اوڑھے ہماری منتظر تھی۔ "وہ رہی!" توپ خانے کے کمانڈر نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے نعرہ لگایا۔ چھمب دی رانی ایک پچیس پاؤنڈر بھارتی میدانی توپ تھی جو سکرانہ کے قریب توی کے محاذ پر متعدد دیگر توپوں کے ساتھ ہمارے ہاتھ لگی تھی۔

"دیکھا، کتنی پرسکون، بردبار اور باوقار معلوم ہو رہی ہے؟ اسے بھی پتا ہے کہ اب وہ صحیح لوگوں کے ہاتھ میں ہے اور اسے کوئی پہلے کی طرح چھوڑ کر نہیں بھاگے گا۔"

تو گویا یہ تھی "چھمب دی رانی"۔ کہنے کو وہ محض ایک توپ تھی لیکن ان لوگوں کی نظر میں، جنھوں نے اسے دشمن سے چھینا تھا، جتنی قدر و قیمت رکھتی تھی اس کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ ہمارے دلیر جوانوں نے دشمن کو جو شکست فاش دی تھی اور اسے سب کچھ چھوڑ چھاڑ جان بچانے کے لیے بھاگ کھڑے ہونے پر مجبور کر دیا تھا، یہ توپ اس کی علامت تھی۔

توپ خانے کا کمانڈر دیر تک ٹکٹکی باندھے "چھمب دی رانی" کو دیکھتا رہا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ سچ مچ اسے دل دے بیٹھا ہو۔

◆◆◆

میں کام کر رہا تھا کہ میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔
دفتر دیکھا تو ایک دوست نے وٹس ایپ پر ایک ویڈیو بھیجی ہوئی تھی جو بہت مزے کی تھی۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے آگے علی اور اس کے دوستوں کو بھی بھیج دی۔ ساتھ ایک مضمون بھی شیئرز کیا۔ شام کو جب ہم اکٹھے ہوئے، تو سب سے پہلے اسی ویڈیو کی تعریفیں شروع ہوگئیں۔ باتوں باتوں میں یہ بات نکل آئی کہ وہ پاکستانی جس نے یوٹیوب پر ون پاؤنڈ فش والی ویڈیو دی تھی، وہ اپنے گانے کی وجہ سے بہت امیر ہو چکا۔ بعد میں اس کی مقبولیت کی وجہ سے پی ٹی سی ایل والوں نے اسے اپنے اشتہار میں بھی لیا۔

تیمور نے مجھ سے پوچھا کہ طیب بھائی، یوٹیوب اور ڈیلی موشن کی ویڈیوز سے کیسے کمایا جاتا ہے؟ میں نے سنا ہے کہ بہت سے لوگ یوٹیوب پہ ویڈیو ڈال کر لکھ پتی اور یورپ اور امریکا وغیرہ میں تو کروڑ پتی بن چکے۔ کچھ پاکستانی بھی مزے مزے کی دلچسپ ویڈیوز یوٹیوب اور ڈیلی موشن پر ڈال کر مزے سے ڈھیروں ڈالر کما رہے ہیں۔ دوسرے مجھے یہ بتایئے کہ گوگل ایڈسینس کیا چیز ہے۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ

ویب سائٹ بنا کر معقول رقم کمائیے

گوگل کمپنی کے اشتہارات کی مدد سے آپ ماہانہ ہزار ہا روپے کما سکتے ہیں

طیب طارق

Google Adsense

گوگل ایڈسینس کے اشتہار لوگ اپنی ویب سائٹوں اور بلاگز پر لگا کر لاکھوں روپے کما رہے ہیں۔

میں نے فلسفیانہ انداز میں گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے انھیں بتایا کہ سب سے پہلے تو یہ بات سمجھو کہ دنیا میں جو بھی شخص معاشی یا کسی بھی قسم کی کوئی سرگرمی کرے، تو وہ اپنے مفاد میں کرتا ہے، لیکن یوں دوسرے کا بھی بھلا ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے کے مفاد جڑنے سے پورے معاشرے کا بھلا ہوتا ہے۔ یہ نظریہ جدید معاشی فلسفے کے بانی ایڈم سمتھ نے پیش کیا تھا کہ ہر شخص کوئی بھی معاشی سرگرمی اپنے ذاتی مفاد میں اپناتا ہے اور اس میں کوئی برائی نہیں۔ ہر معاشرے میں لوگوں کے ذاتی مفادات آپس میں اس طرح جڑے ہیں کہ ایک شخص کا ذاتی مفاد دوسرے کے لیے فائدہ مند ہے۔ یوں پوری معیشت کا پہیہ حرکت میں آتا ہے اور وہ اپنے اصل مقصد یعنی سب لوگوں کی معاشی بہتری اور بہتری کی طرف آگے بڑھتی ہے۔

مثلاً ایک بیکری والا کیک اپنے ذاتی مفاد کے لیے بناتا ہے تاکہ کمائی کر سکے۔ بدلے میں جس شخص نے کیک خریدا ہوتا ہے، اس کا فائدہ ہو جاتا ہے۔ گویا کیک بیچنے اور خریدنے والے کا مفاد آپس میں مل جاتا ہے، یوں دونوں کا بھلا ہوتا ہے اور ان کی ضرورتیں بھی پوری ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح ایک استاد جو تمام طلبہ کو پڑھاتا ہے، وہ اپنی ذاتی کمائی کے لیے بھی تعلیم دیتا ہے۔ ساتھ میں طلبہ تک علم بھی منتقل ہو جاتا ہے۔ یوں طالب علم اور استاد دونوں کا بھلا ہوتا ہے۔ یہی اصول معاشرے کی تمام معاشی سرگرمیوں پر لاگو ہوتا ہے۔

یاد رکھو، کوئی بھی چیز جو تم انٹرنیٹ پر پڑھتے یا کوئی ویڈیو دیکھتے ہو، تو اس کے شائع کرنے والے کے پیچھے اپنا مفاد ہوتا ہے یعنی پیسے کمانا۔ لیکن ساتھ ہی ہم پڑھنے یا ویڈیو دیکھنے والوں کا بھی بھلا ہوتا ہے۔ اگر تم کاروباری ذہن رکھتے ہو، تو انٹرنیٹ پر کوئی بھی چیز پڑھنے یا ویڈیو دیکھنے کے بعد تمھارے ذہن میں پہلا خیال یہ آنا چاہیے کہ یہ شخص یا کمپنی کما کیسے رہی ہے؟ اس کی کمائی کا ماڈل کیا ہے؟ اشتہارات ہیں یا کوئی اور طریقہ؟

اب آتے ہیں یوٹیوب اور ویب سائٹ کے پیے ایڈسینس کی طرف! سب سے پہلے میں تمھیں اس کا نظریہ سمجھاتا ہوں اور دونوں پر یہی لاگو ہوگا۔ دراصل جب انٹرنیٹ شروع ہوا، تو پبلشنگ ہاؤسز اور عام پبلشر کو بھی اپنا مواد چھاپنے کا آسان طریقہ مل گیا۔ اب مسئلہ تھا اس سے پیسے کمانے کا کہ آمدن کیونکر ہو؟ کیونکہ ہر کوئی تو بڑی بڑی کمپنیوں سے اشتہار نہیں لے سکتا تھا۔ اس کے لیے دنیا میں ایڈورٹائزنگ ایجنسیز موجود تھیں جو بڑے بڑے اخبارات اور رسائل کو اشتہار لے کے دیتیں۔ لیکن آن لائن دنیا میں ابھی تک اس طرح کی کوئی بڑی کمپنی نہیں تھی۔

سو گوگل نے اس کا حل یہ نکالا کہ آن لائن دنیا میں ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا کردار اپنے ذمے لے لیا۔ اب گوگل کرتا یہ ہے کہ ہر طرح کی چھوٹی بڑی کمپنی سے اس کی مصنوعات کے اشتہار اپنے پروگرام، ایڈورڈز (Adwords) کے ذریعے لیتا ہے۔ پھر ہر طرح کے پبلشرز، چھوٹے اور بڑے جن کی ویب سائٹ پر کونٹینٹ یعنی کسی بھی قسم کے مضامین ہوتے ہیں، ان کے اپلائی کرنے پر انھیں ان کی ویب سائٹس پر اپنے دوسرے پروگرام، گوگل ایڈسینس (google adsense) کے ذریعے اشتہار لگانے کی اجازت دیتا ہے۔

جب کوئی ان اشتہاروں پر کلک کرتا ہے، تو ویب سائٹ کے مالک کو اس کے پیسے ملتے ہیں۔ گوگل کا آپ کی ویب سائٹ پر اشتہار دینے کا طریقہ کار کنٹیکسچول (contextual) ایڈورٹائزنگ پر مشتمل ہوتا ہے۔ یعنی جب کوئی آپ کی ویب سائٹ کو وزٹ کرے، تو گوگل یہ دیکھتا ہے کہ اس سے پہلے آپ نے انٹرنیٹ پر اپنے کمپیوٹر سے کن چیزوں کو سرچ کیا ہے۔ اس کے لیے وہ آپ کے انٹرنیٹ براؤزر کی کوکیز سے جو ڈیٹا محفوظ رکھنے کا ایک طریقہ ہے مدد لیتا ہے۔ پھر جو چیزیں آپ نے اپنے انٹرنیٹ براؤزر پر سرچ کی ہوتی ہیں، گوگل اس سے متعلقہ اشتہار آپ کو دکھاتا ہے۔

مثلاً اگر آپ نے اس ویب سائٹ پہ جس پر گوگل کے

اشتہار لگتے ہیں، پہلے کوئی کھانا بنانے کی ترکیب سرچ کی تھی، تو گوگل وہاں آپ کو کھانا پکانے والی ترکیب کے قریب ترین اشتہار مثلاً کسی کھانا پکانے والے بلاگ یا ویب سائٹ کا اشتہار دکھائے گا تاکہ وزیٹر کے اس ویب سائٹ کے اشتہار پر کلک کرنے کا امکان بڑھ جائے۔ یوں ویب سائٹ کے مالک جس نے گوگل کے اشتہار لگائے ہیں، اس کا بھلا ہو جاتا ہے اور ایڈورٹائزر کا بھی جس نے گوگل کو اشتہار دیا۔ یوں اس کا اشتہار متعلقہ یوزر تک پہنچ جاتا ہے۔

پاکستان کی تقریباً تمام ویب سائٹس بشمول جنگ اخبار، دنیا اخبار، اردو پوائنٹ وغیرہ کمائی کے لیے ایڈسینس ہی کا استعمال کرتے ہیں۔ olx.com.pk جس کے تم اشتہارات ٹی وی پر دیکھتے ہو، وہ بھی اپنی کمائی کے لیے گوگل ایڈسینس کا استعمال کرتی ہے۔

حرا نے پوچھا "طیب بھائی یہ بتائیں کہ گوگل ایڈسینس کا اکاؤنٹ کیسے لیا جاتا ہے؟ اور کیا گوگل ایڈسینس کا اکاؤنٹ لینے کے لیے کوئی شرائط بھی ہیں؟ اور گوگل کس کلیے یا فارمولے کے تحت آپ کو پیسے دیتا ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ گوگل ایڈسینس کے اکاؤنٹ کے لیے آپ کو google.com/adsense پر اپلائی کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے کچھ شرائط بھی ہیں، وہ یہ کہ درخواست دیتے وقت آپ اپنی ویب سائٹ کا پتا بھی دیتے ہیں جس کے لیے آپ اشتہار لے رہے ہیں۔ اس ویب سائٹ پر کم از کم ۱۰۰۰ پیج ویوز کی ڈیلی ٹریفک یعنی وزیٹرز ہونے چاہئیں اور کم از کم ۳۰ مضامین موجود ہوں۔ اس کے بعد پھر آپ اپلائی کریں گے، تو ہی آپ کو ایڈسینس کا اکاؤنٹ ملے گا۔

پیج ویو کا مطلب کسی ویب سائٹ کا ایک صفحہ ہے۔ یعنی اگر آپ جنگ اخبار کی ویب سائٹ پر گئے اور پہلے آپ نے ایک کالم نگار کا آرٹیکل پڑھا، تو وہ ایک پیج ویو گنا گیا۔ جب دوسرے کالم نگار کا آرٹیکل پڑھا، تو اس کا وہ دوسرا پیج ویو گنا گیا یعنی ایک ہی وزیٹر ایک ہی ویب سائٹ پر بہت سارے پیجز ویو کر سکتا ہے۔ عموی طور پر ایک وزیٹر ایک سے تین پیجز تک ویو کرتا ہے۔ یعنی اگر آپ کی ویب سائٹ پر آج کے دن میں ۵۰۰ وزیٹرز آئے اور ہر وزیٹر نے ۲ پیجز ویو کیے، تو کل پیج ویوز ۱۰۰۰ ہوئے۔ اس کا مطلب ہوا کہ ایڈسینس اکاؤنٹ کے لیے اپلائی کرنے کے لیے آپ کے پاس روزانہ کم از کم ۶۰۰ سے ۷۰۰ وزیٹرز ہونے چاہئیں اور کم از کم ۳ سے ۶ ماہ تک روزانہ ٹریفک کی یہ شرح برقرار رہنی چاہیے، پھر جا کر آپ کو ایڈسینس اکاؤنٹ ملے گا۔

اب آتے ہیں اس فارمولے یا کلیے کی جانب جس کے ذریعے گوگل آپ کو پیسے ادا کرتا ہے۔ گوگل کسی بھی پبلشر کو ڈیمانڈ اور سپلائی والے کلیے کے تحت پیسے ادا کرتا ہے۔ گوگل جب ایڈورٹائزر سے اشتہار لے، تو وہ اس سے کی ورڈ پوچھتا ہے کہ آپ کی ٹارگٹ مارکیٹ کون سی ہے اور آپ کن لوگوں تک اپنا اشتہار پہنچانا چاہتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک ایڈورٹائزر اپنی کھانا پکانے کی ترکیبوں والی ویب سائٹ کا اشتہار دینا چاہ رہا ہے، تو وہ کوکنگ، ریسیپیز، بیکنگ وغیرہ کے کی ورڈز دے گا۔ ہر کی ورڈ کی اپنی قیمت (cost per click) ہوتی ہے جس کا تعین یوں ہوتا ہے کہ اس کی ورڈ پہ کتنے لوگ اشتہار دینا چاہ رہے ہیں۔

اب اگر زیادہ لوگ اس کی ورڈ پہ اشتہار دینا چاہتے ہیں، تو اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اب گوگل ان کی ورڈز سے متعلقہ ویب سائٹس پر آپ کا اشتہار لگاتا ہے یعنی جن ویب سائٹس میں وہی ورڈز لگے ہوتے ہیں، گوگل ایڈورٹائزر سے اشتہار لیتا، پبلشر کی ویب سائٹ پر لگاتا اور بیچ میں اپنا کمیشن رکھتا ہے۔ یعنی اگر ایک ایڈورٹائزر ایک کی ورڈ کے لیے ۲ ڈالر ادا کرتا ہے، تو گوگل اس میں سے ۳۲ فیصد خود رکھتا اور بقیہ آپ کو یعنی پبلشر کو ادا کرتا ہے۔ پیسوں کی ادائیگی کا فارمولا یہ ہے کہ ایک دن میں کل کتنے پیجز ویو ہوئے، کتنے فیصد لوگوں نے اشتہار پر کلک کیا اور فی کلک کتنے سینٹ آپ کو ملے، ان تینوں کو ضرب دینے کے بعد آپ کی ایک دن کی کمائی نکل آتی

ہے۔ مثلاً اگر آج آپ کی ویب سائٹ کے ۳۰۰۰ پیجز ویو ہوئے، ۳۰ فیصد لوگوں نے ایڈ پر کلک کیا اور آپ کے کی ورڈز کی بنیاد پر آپ کو ۲۰ سینٹ فی کلک ملے، تو آپ کی آج کل آمدنی تقریباً یعنی ۱۸ ڈالر ہوئی۔ مہینے کی آمدنی ۵۴۰ ڈالر بنتی ہے یعنی آج کے ڈالر ریٹ کے حساب سے تقریباً چھپن ہزار روپے۔

تیمور نے فلسفیانہ انداز میں خلا میں گھورتے ہوئے تبصرہ کیا "اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری آمدنی تین چیزوں پر منحصر ہوئی: ۱۔ کی ورڈز کے فی کلک پیسے یعنی (cost per click)، ۲۔ جتنے لوگوں نے کلک کیا یعنی کلک تھرو ریٹ اور ۳۔ ٹوٹل پیج ویوز کی تعداد۔ اگر ان میں سے ایک بھی چیز کو بڑھا لیا جائے تو ہماری آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا۔"

ثمنا نے بھی تبصرے کے انداز میں کہا، "تمھیں پتا ہے کہ تم اپنے کلک تھرو ریٹ اور فی کلک آمدنی کو کیسے بڑھا سکتے ہو؟" وہ کہنے لگا نہیں۔ میں نے جواب دیا، کلک تھرو ریٹ بڑھانے کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ اشتہار اس جگہ پر لگایا جائے جہاں یوزر کے کلک کرنے کا امکان سب سے زیادہ ہو مثلاً آرٹیکل یا مضمون کے درمیان میں، اس کے علاوہ اشتہار کو مختلف جگہوں پر لگا کر یہ پتا چلایا جا سکتا ہے کہ سب سے زیادہ کلک تھرو ریٹ کہاں ملے گا۔

دوسرے ایڈسینس کے اشتہاروں کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں، کچھ پکچر ایڈ ہوتے ہیں اور کچھ ٹیکسٹ۔ ان کو سائٹ پر مختلف جگہوں پر لگا کر تجربہ کیا جائے۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ٹیکسٹ ایڈ یا متن والے اشتہار کے وہی رنگ رکھے جائیں جو آپ کی ویب سائٹ کے ہیں تاکہ وہ بھی اسی کا حصہ لگے۔ اسی طرح فی کلک آمدنی کو بڑھانے کا طریقہ کار یہ ہے کہ کم آمدنی والے کی ورڈز جن کی فی کلک آمدنی یعنی cost per click کم ہے، انھیں بلاک کر دیا جائے۔ اس طرح کے کچھ اور بھی طریقے ہوتے ہیں جو میں تمھیں تب بتاؤں گا جب تم کام شروع کرو گے۔

وزیٹرز کی تعداد کو تم مارکیٹنگ اور سرچ انجن آپٹیمائزیشن یعنی ایس ای او کے ذریعے بڑھا سکتے ہو۔ ایس ای او کو تم مختصراً یہ سمجھ لو کہ اپنی ویب سائٹ کو گوگل کے سرچ رزلٹس میں پہلے صفحے اور پہلے نمبر پر لانے کے طریقہ کار کا نام ایس ای او ہے۔ اس میں مختلف چیزیں آتی ہیں جیسے کہ ان پیج ایس ای او اور آف پیج ایس ای او۔ ان کی تفصیل پھر کبھی سہی۔ تم خود سے بھی انٹرنیٹ پر سرچ کر لینا کہ یہ کیا چیز ہے۔ گوگل نے اس کے لیے گائیڈ لائنز بھی دی ہوئی ہیں، تم ان کا کتابچہ بھی ڈاؤن لوڈ کر کے پڑھ سکتے ہو۔

گوگل نے اشتہار لگانے کے حوالے سے بھی اپنی پالیسی دی ہوئی ہے جس کی پابندی کرنا بہت ضروری ہے ورنہ وہ آپ کے ایڈسینس اکاؤنٹ کو بلاک کر دیں گے اور آپ کو پیسے بھی نہیں ملیں گے۔ مثلاً اس پالیسی کا ایک نکتہ یہ ہے کہ ایک پیج پر آپ ۳ یا ۴ سے زیادہ اشتہار نہیں لگا سکتے۔ اسی طرح کی دیگر بہت سی شرائط ہیں جن کو آپ انٹرنیٹ پر سرچ کر کے پڑھ سکتے ہو۔

علی نے بیچ میں ٹہوکا دیا، "طیب بھائی یہ تو بہت آسان طریقہ ہے۔ اپنی ویب سائٹس پر خود ہی یا دوستوں سے کہہ کر کلکس کرواتے جائیں اور پیسے بنتے جائیں گے۔ اسی طرح دوسروں کے آرٹیکل چوری کر کے لگاتے جائیں، کسی کو کیا پتا لگنا ہے اتنی بڑی انٹرنیٹ کی دنیا میں۔"

میں نے اسے جواب دیا: بیٹا اگر ایسے ہوتا، تو لوگ اب تک گوگل کو بیچ کر ختم کر چکے ہوتے۔ ایسے نہیں ہوتا، جنھوں نے یہ سسٹم بنایا ہے وہ ہم سے زیادہ تیز ہیں۔ انھیں پتا ہے کہ لوگ کس قسم کے فراڈ کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ اگر اس طرح سے کلکس کرائے جائیں، تو گوگل فوراً انھیں پکڑ لیتا ہے۔ پھر وہ آپ کا اکاؤنٹ بلاک کر دیتا ہے یا پھر آپ کو پیسے نہیں ملتے۔ عموی طور پر کلک تھرو ریٹ یعنی ٹوٹل وزیٹرز میں سے ایڈ پر کلک کرنے والوں کی تعداد ۲ سے ۵ فیصد تک ہوتی ہے۔ پاکستان میں کلکس کے فراڈ والا کام بے شمار لوگوں نے کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لیے اب گوگل والوں نے پاکستانیوں کو ایڈسینس اکاؤنٹ دینا بہت کم کر دیا ہے۔ جن کے پاس پہلے سے موجود

ہیں یا تو وہ کام چلا رہے ہیں یا پھر اگر آپ کی پاس اور یجنل ٹریفک بہت اچھی ہو تو مل سکتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور طریقہ یہ ہے کہ آپ مڈل ایسٹ، یورپ، امریکا یا کینیڈا میں اپنے کسی رشتے دار کے ایڈریس پہ اپلائی کر دیں، تب گوگل یہ سمجھتا ہے کہ آپ کسی مغربی دنیا کے ملک سے اسے چلا رہے ہیں۔ آپ اپنی ایڈسینس کے اپلیکیشن فارم میں جمنٹ ایڈریس اور ٹیکس کی معلومات وغیرہ باہر والے ملک کو ہی دیں۔ جمنٹ اس کے اکاؤنٹ میں آیا کرے گی اور پھر اس کو آپ پے پال یا پیونیر (payoneer) کے ذریعے اپنے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا لیں۔ انٹرنیٹ پر اس طرح کے ٹولز بھی موجود ہیں جن کی ذریعے آپ اپنا چوری شدہ مواد چاہے وہ انٹرنیٹ پر کہیں بھی پڑا ہو، کا پتا لگا سکتے ہو۔ اگر اس کا تخلیق کار آپ کی شکایت کر دے، تو نہ صرف آپ کا گوگل ایڈسینس اکاؤنٹ بند ہو سکتا ہے بلکہ ہوسٹنگ کمپنی آپ کی ویب سائٹ بھی بند کر سکتی ہے کیوں کہ مغربی دنیا میں کاپی رائٹ کے قوانین بہت سخت ہیں اور ان پر سختی سے عمل درآمد ہوتا ہے۔

تیمور نے سوال کیا "طیب بھائی یہ بتایئے کہ آپ اس حوالے سے کیا ٹپس دیں گے کہ کس موضوع پر ویب سائٹ یا ایپ بنائی جائے اور ہم اپنی آمدنی کو اس ماڈل سے کیسے سب سے زیادہ بڑھا سکتے ہیں؟"

میں نے ان سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ ابھی آج مجھے اپنے ایک کلائنٹ کے پاس میٹنگ کے لیے جانا ہے۔ ہم اگلی نشست میں اس پر تفصیل سے بات کریں گے۔ اگلی نشست میں تمھیں آئی ٹی دنیا کی کچھ راز کی باتیں بھی بتاؤں گا جو لوگ کم کسی کو بتاتے ہیں۔ یہ کہہ کر میں نے ان سے اجازت لی اور میٹنگ میں شرکت کرنے روانہ ہو گیا۔

ہنر بہت بڑی دولت ہے

ایک عقل مند اپنے بیٹوں کو نصیحت کر رہا تھا کہ اے باپ کے پیارو! ہنر سیکھو۔ اس لیے کہ حکومت اور دنیا کی دولت بھروسے کے قابل نہیں۔ سونے اور چاندی کو تو چور کا خطرہ ہوتا ہے کہ وہ اسے ایک ہی دفعہ اٹھا کر لے جائے یا انھیں جمع کرنے والا ان کو ضائع کر دے گا، لیکن ہنر ایک ابلنے والا چشمہ اور مستقل دولت ہے۔ اگر ہنر مند کی دولت جاری رہے، تو کوئی فکر نہیں اس لیے کہ ہنر بذات خود ایک دولت ہے۔ جہاں بھی جائے گا، اس کی عزت ہوگی اور وہ ہنر مند بذات خود صدر جگہ پر عزت پائے گا۔ لیکن بے ہنر لقمہ لقمہ کر کے جوڑے اور تکالیف سے زندگی بسر کرے گا۔ عقل لوگوں کا کہنا ہے کہ جب کوئی عزت اور مرتبہ مل جائے، تو اس کے بعد دوسروں کے ماتحت رہنا دشوار ہوتا ہے۔ جو ناز و نعمت اٹھانے کا عادی ہو جائے، اسے لوگوں کی سختی برداشت کرنا مشکل لگتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ملک شام میں ایک دور میں فتنہ برپا ہو گیا۔ ہر کوئی فتنے سے بچنے کے لیے اپنے ٹھکانے سے نکل بھاگا۔ اسی دوران دیہاتیوں کے عقل مند بچے اپنے ٹھکانوں سے بادشاہ کے پاس جا نکلے اور اس کے مصاحب ہو گئے۔ وزیروں کے عیاش بچے جو بے وقوف بھی تھے، بھیک مانگنے کے لیے مجبوراً دیہات میں نکل گئے۔

درسِ حیات:

ا۔ اگر دولت ہاتھ آ جائے، تو اس کی ہیشگی پر بھروسا کر کے مت بیٹھو۔ ۲۔ ہنر اور فن ہر لحہ فائدہ دینے اور عزت کی جگہ بٹھانے والے ہیں، ان سے بے دھیان نہ ہو۔ ۳۔ بے ہنر کو روزی کمانے کے لیے بڑی مشکل برداشت کرنی پڑتی ہے اور ہنر مند کے مقابلے میں عزت بھی کم پاتا ہے۔ (حکایت سعدی، انتخاب: مطیع اللہ سہیل گورمانی، مظفر گڑھ)

ہمیں تم پر فخر ہے

پاکستان کا ٹائیگر

بم ناکارہ بنانے والے ایک بہادر اور فرض شناس سپاہی کی ایمان افروز داستان

آئی جی (ر) ذوالفقار احمد چیمہ

دہشت گردی کا عفریت خیبر پختونخوا پولیس کے کیسے کیسے شاندار ہیرے نگل گیا۔ کیسے کیسے بہادر اور نڈر پولیس افسر لقمۂ اجل بن گئے۔ آئی جی صفوت غیور، ڈی آئی جی ملک سعد، ایس ایس پی اقبال مروت، ایس پی کالام خان، ایس پی خورشید خان، ایس پی بلال خان وطن پر قربان ہو گئے۔ ان کے علاوہ سیکڑوں انسپکٹر، سب انسپکٹر، ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبل جنھوں نے دہشت گردی کے دیو کو جرأت سے للکارا اور آگے بڑھ کر موت کو گلے لگایا۔ مگر ہزاروں اور لاکھوں شہریوں کو بچالیا۔

پچھلے دس برس میں دنیا نے فرض شناسی اور جرأت کے ایسے منظر کئی بار دیکھے ہیں کہ ادھر شہیدوں کی میتیں اٹھائی گئیں، ادھر چند منٹوں میں ان کی جگہ لینے کے لیے نئے افسر اور تازہ دم جوان پہنچ گئے۔ کسی محاذ سے کوئی پیچھے نہیں ہٹا۔ کبھی کوئی مورچہ خالی نہیں چھوڑا گیا۔ پنجاب کے جانبازوں کی قربانیاں بھی بہت ہیں مگر خیبر پختونخوا پولیس کی جرأتیں بے مثال ہیں۔

ڈیرہ اسماعیل خان، ایبٹ آباد اور کوہاٹ ڈویژن میں اس بہادر فورس کو کمانڈ کرنا میرے کیریئر کا انتہائی قابلِ فخر حصہ ہے۔ جب میں کوہاٹ اور ڈی آئی خان میں ڈی آئی جی تھا اس وقت

جنرل مسعود اسلم صوبے کے گورنمنٹ اور میرے ہم مکتب تھے۔ برسوں پہلے وہ اور میں کیڈٹ کالج حسن ابدال کے ایک ہی ہوسٹل میں رہتے تھے۔ ۲۰۰۹ء میں راولپنڈی کی پریڈ لین میں نماز جمعہ کے دوران مسجد میں دھماکا ہوا جس میں جنرل صاحب کا جواں سال اکلوتا بیٹا شہید ہوگیا۔ دوسرے روز میں تعزیت کے لیے گیا، تو بہادر جرنیل پورے حوصلے میں تھا۔ اس صدمے کی حالت میں بھی انھوں نے مجھے تین چار مرتبہ کہا ''میں پشاور پولیس کی بہادری کو سیلوٹ کرتا ہوں..... جانتے اور دیکھتے ہوئے بھی آپ کا جوان موت کو جپھا ضرور ڈالتا ہے۔''

انھوں نے ٹھیک کہا تھا۔ پشاور میں کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ضلع کچہری کے اندر جانے والے خودکش بمبار کو ڈیوٹی پر تعینات پولیس ہیڈ کانسٹیبل یا اے ایس آئی نے للکارا..... خودکش بمبار کی صورت سامنے کھڑی موت نے پولیس ملازم کو وارننگ دیتے ہوئے کہا ''پیچھے ہٹ جاؤ اور اپنی جان بچاؤ۔''

قوم کے محافظ نے للکار کر جواب دیا ''میں نے یہ وردی پیچھے ہٹنے کے لیے نہیں پہنی۔'' محافظ نے آگے بڑھ کر خودکش کو جپھا ڈالا..... دھماکا ہوا، محافظ شہید ہوگیا مگر اس نے جان دے کر سیکڑوں شہریوں کی جانیں بچالیں۔ موت اور محافظ کا آمنا سامنا کئی بار ہوا اور کئی بار یہی مکالمہ دہرایا گیا۔

دنیا سمجھتی ہے کہ ہم محسنوں کو فراموش کردینے والی قوم ہیں اور اپنے بہادر سپوتوں کو ان کی زندگی میں یاد نہیں کرتے۔ ان کی شہادت کے بعد ان کے ترانے لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اب تو ٹیلی وژن کے بیسیوں چینل ہیں مگر سب کئی مہینوں تک ایک جرم کی مرتکب اسمگلر ماڈل کو گلیمرائز کرنے میں مصروف رہے۔ میڈیا سے وابستہ ایک دانشور کہہ رہا تھا کہ ہمارے چینلوں پر خاتون کے علاوہ دو ہی چیزیں نظر آتی ہیں: موبائل فون یا کرکٹ کا جنون۔ اگر کسی چینل کے پاس جان ہتھیلی پر رکھ کر شہریوں کا تحفظ کرنے والے نڈر جانبازوں کی خدمات اور کارنامے اجاگر کرنے کا وقت ہوتا، تو وہ ''ٹائیگر'' سے ملنے کے لیے ڈیرہ اسماعیل خان ضرور جاتا۔

اکیسویں صدی کے آغاز تک سارا خیبرپختونخوا امن کا گہوارہ تھا اور ڈیرہ اسماعیل خان تو بہت ہی پُرامن علاقہ سمجھا جاتا۔ ۲۰۰۵ء میں مجھے ڈی آئی جی، ڈیرہ اسماعیل خان تعینات کیا گیا، تو علاقے کا امن مثالی تھا۔ کسی میٹنگ میں پشاور جانا ہوتا، تو میں دن کے وقت اپنا کام ختم کرکے اکثر رات کو سفر کرتا۔ رات نو بجے ڈیرہ سے چل کر ایک بجے پشاور پہنچ جاتے۔ رات آٹھ بجے اسلام آباد سے روانہ ہوکر تلہ گنگ، میانوالی اور چشمہ بیراج سے ہوتے ہوئے ایک ڈیڑھ بجے ڈیرہ اسماعیل خان پہنچ جانا معمول تھا۔ اس وقت ڈیرے والے بموں اور دھماکوں سے نا آشنا تھے۔ پرسکون زندگی گزارنے کے خواہشمند پختون بنوں اور لکی مروت سے ڈیرہ اسماعیل خان آکر رہائش اختیار کرتے تھے۔ جنرل مشرف کے دور میں اداروں کے ساتھ ساتھ خیبرپختونخوا کا امن بھی برباد ہوگیا۔ جگہ جگہ بم دھماکوں سے انسانی جسموں کے پرخچے اڑنے لگے اور جنت نظیر خطہ لہو رنگ ہوگیا۔

مجھے یاد ہے ۲۰۰۶ء میں پہلی مرتبہ ڈیرہ اسماعیل خان کی رِنگ روڈ پر آئی ای ڈی کے ذریعے پولیس وین پر حملہ ہوا جس میں ہمارے تین جوان شہید ہوئے۔ جب ہر شخص موقع سے دور بھاگ رہا تھا، ایک دبلے پتلے جسم کا اسمارٹ سا نوجوان ہر خطرے سے بے نیاز ہوکر جائے وقوعہ کی طرف دوڑتا ہوا آیا اور کریٹر (crator) اور بکھرے ٹکڑوں کا معائنہ کرنے لگا۔ پھر دہشت گردی کی بلاؤں نے جیسے اس علاقے کی راہ دیکھ لی۔

کچھ عرصے بعد پھر دھماکا ہوا، تو اسی نوجوان کی مستعدی اور دلیری نے مجھے متوجہ کیا۔ دریافت کیا، تو بتایا گیا کہ وہ کانسٹیبل عنایت اللہ ہے۔ اس نے بموں کو ناکارہ بنانے کا کورس کر رکھا ہے۔ عام پولیس والے جن جگہوں پر جانے سے کنی کتراتے، عنایت وہاں سینہ تان کر پہنچتا۔ میں نے خود دیکھا کہ فرض کی ادائیگی میں موت کا خوف اس کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں بن سکا۔ وہ مہلک بموں سے شہریوں کو بچانا ملازمت نہیں ایمان کا

حصہ سمجھتا ہے اور اپنے پرخطر فرائض ڈیوٹی یا مجبوری سمجھ کر نہیں جوش اور ولولے کے ساتھ انجام دیتا رہا۔

پھر انہی فرائض کی ادائیگی میں عنایت ۲۰۰۸ء میں زخمی ہوگیا مگر اگلے ہی روز وہ زخموں کی پروا نہ کرتے ہوئے ڈیوٹی پر موجود تھا۔ انسانی جسموں کے اعضا فضاؤں میں اچھال دینے والے اور بلند و بالا عمارتوں کو مٹی کا ڈھیر بنا دینے والے خطرناک بم اور بارود عنایت کو کبھی خوفزدہ نہیں کر سکے۔ اس کی بہادری اور جرأت دیکھ کر شہریوں نے اسے "ٹائیگر" کا خطاب دیا۔

دہشت گردی پروان چڑھتی گئی اور علاقے کے حالات مزید خراب ہوتے گئے۔ آئی ای ڈی کے ساتھ ساتھ خودکش دھماکے بھی ہونے لگے مگر ایسی حالت میں بھی ٹائیگر موقع پر پہنچ جاتا، تو شہری پرسکون ہو جاتے۔ پولیس کے جوانوں نے کسی خودکش بمبار کو روکا، تو عنایت ٹائیگر شاہین کی طرح جھپٹ کر موقع پر پہنچا اور مہلک جیکٹ کو ناکارہ بنا دیا۔ تباہی سے بھرپور جیکٹوں کو ناکارہ بناتے ہوئے عنایت کئی بار زخمی ہوا۔ مگر نہ اس کی فرض شناسی میں کمی آئی اور نہ اس کے جذبے ماند پڑے۔

پھر کتنی ہی بار ایسا ہوا کہ پرامن شہریوں کی موت کا سامان بن کر بارود سے بھری گاڑی شہر کی جانب آئی مگر موت اور شہریوں کے درمیان ٹائیگر آ کھڑا ہوا۔ اس نے بارود سے بھری گاڑی ناکارہ بنا کر ہزاروں گھرانے اجڑنے سے بچا لیے۔ عوام کے تحفظ کی دھن میں بموں کو ناکارہ بناتے بناتے جسم کے کئی اعضا ناکارہ ہوگئے، مگر وہ جذبوں اور جرأتوں کے سفر پر اسی رفتار سے گامزن رہا۔ ۲۰۰۲ء میں گومل یونیورسٹی کے قریب شہر کو تباہ کرنے کے لیے نصب بم ناکارہ بناتے ہوئے عنایت ٹائیگر کا دایاں کندھا بری طرح زخمی ہوا مگر اس نے کبھی آرام کی خواہش کی نہ چھٹی کی درخواست دی۔ اس کا جوش و جنون اسی طرح آسمان کو چھوتا رہا۔

کچھ عرصہ قبل ڈیرہ کے دوستوں سے حالات دریافت کیے۔ وہ بتانے لگے کہ بڑی تباہی ہونے والی تھی کہ اللہ نے ٹائیگر کو بھیج دیا۔ اس نے بم تو ناکارہ بنا دیے مگر اس کا دایاں ہاتھ بری طرح زخمی ہوا اور دائیں ٹانگ بالکل ناکارہ ہوگئی۔

اب (اے ایس آئی) عنایت کا جسم زخموں سے چور مگر دل جذبوں اور ولولوں سے بھرپور ہے۔ یہ گوشت پوست کا انسان ہے مگر اس کے اندر فولاد کا جگر ہے۔ وہ کوہ گراں کے سامنے تیشہ لیے کھڑا ہے، اس یقین کے ساتھ کہ وہ اپنے تیشے سے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دے گا۔ ٹائیگر نے بارہا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی ہیں اور ہمیشہ اس کو شکست دی۔ وہ کہتا ہے "میرا جسم اور میری طاقت میرے وطن کے لیے ہے۔ جسم میں جب خون کا صرف ایک قطرہ رہ گیا، تو بھی شہریوں کی حفاظت کے لیے اسی طرح لڑتا رہوں گا۔"

ہمارے بہادر بیٹے..... ہمارے محافظ..... ہمارے ٹائیگر! ہمیں تم پر فخر ہے۔ تم لاکھوں پرامن شہریوں کے محافظ ہو۔ صرف ڈیرہ نہیں پوری قوم تم جیسے بہادر بیٹے پر ناز کرتی ہے۔ صدر مملکت نے تمہیں ایک تمغہ شجاعت عطا مگر ڈیرے اور خیبر کے لاکھوں شہری تم پر نچھاور کرنے کے لیے اپنی آنکھوں میں محبتوں کے تمغے سجائے ہوئے ہیں۔ کائناتوں کے خالق اور مالک سے دعا ہے کہ وہ تمہاری حفاظت کرے اور تمہیں اور تم جیسے قابل فخر محافظوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

امام شافعیؒ نے کہا

☆ زندگی ہمیں اس لیے نہیں عطا کی گئی کہ ہم اسے ان اشغال میں صرف کر دیں، جو ہمیں موت کے وقت اس دنیا ہی میں چھوڑنے پڑیں گے۔

☆ جب کام زیادہ ہوں، تو اس کام کو ہاتھ میں لو جو سب سے زیادہ اہم ہو۔

☆ اپنی ضرورتیں کم کرو تو راحت ملے گی۔

☆ سب سے زیادہ جاہل وہ ہے جو گناہ سے باخبر ہوتے ہوئے بھی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

(انتخاب: احسن کمال یوسفزئی، واہ کینٹ)

اردو ادب کے

میاں صاحب

ایک عظیم ناول نگار کا دلچسپ اور دل موہ لینے والا خاکہ

حبیب اشرف صبوحی

جب میں نے ہوش سنبھالا اور اپنے گرد و پیش دیکھا، تو والد صاحب (اشرف صبوحی) کے قریب ترین دوستوں میں میاں ایم اسلم کو بھی پایا۔ انھوں نے ناول نگاری کے میدان میں ایک جداگانہ طرز اپنائی تھی۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں مگر ان کی یادیں حافظے کی لوح سے محو نہیں ہو پاتیں۔ گھر میں ان کا ذکر خیر بہت سنا۔ والد صاحب ڈاک خانے میں ملازم تھے۔ جب پوسٹ آفس سے چھٹی ملتی، تو سیدھے میاں صاحب کے پاس پہنچ جاتے۔ اس پروگرام میں کبھی تبدیلی نہیں آئی تھی چاہے آندھی آئے یا مینہ برسے۔

میاں صاحب سارا دن اپنے ناول کا مسودہ لکھتے تھے۔ شام کو والد صاحب آتے، تو انھیں سناتے اور باہمی مشورے سے اس میں رد و بدل کرتے۔ والد صاحب کی طبیعت میں بڑی وضعداری اور انکسار تھا۔ میاں صاحب اور ان کے اہل خانہ والد صاحب کو "حاجی صاحب" کہتے تھے اور بہت عزت کرتے۔ بلکہ انھیں گھر کا فرد ہی سمجھا جاتا۔

میاں صاحب اکثر مجھ سے کہتے، جب حاجی صاحب ڈاک خانے سے سیدھے میرے گھر آتے، تو گرمی کی وجہ سے چہرے پر پسینے کے قطرے چمک رہے ہوتے اور لب بھی خشک ہوتے۔ سر پر ترکی ٹوپی ہوتی اور گلے تک شیروانی کے بٹن بند ہوتے۔ میں آتے ہی پوچھتا کہ حاجی صاحب پانی پینا پسند کریں گے؟ گرمی کے باوجود وہ انکار کر دیتے تھے کہ نہیں۔ میں سمجھتا "پانی پینے میں بھی تکلف ہے۔"

اس وضعداری کو پروفیسر اسلم فرخی صاحب نے "اشرف صبوحی کی پچاس سالہ نثری خدمات" کے سلسلے میں ایک تقریب میں مضمون پڑھتے ہوئے ان الفاظ میں بیان کیا "قیامت کے روز اللہ تعالیٰ بندوں سے حساب کتاب کر رہا ہوگا، تو جب بھی اشرف صبوحی کی باری آئی، اللہ تعالیٰ فرشتوں سے کہے گا کہ ان کو بغیر حساب کتاب کے جنت میں جانے دو کیونکہ انھوں نے چالیس سال تک میاں اسلم صاحب کے ناولوں کے مسودے بڑے صبر و شکر کے ساتھ اور بغیر کسی نااتفاقی کے سنے۔"

میاں صاحب بڑے مہمان نواز تھے۔ ان کا دسترخوان بڑا وسیع تھا۔ اتوار کو ان کے ہاں صبح ناشتے کی محفل ہوتی جس

میں انواع واقسام کی نعمتیں دیکھنے کو ملتیں۔ خوب ہنسی مذاق ہوتا۔ ہر اتوار آنے والوں میں ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی، مولانا اسماعیل پانی پتی، پروفیسر خالد بزمی، ڈاکٹر عبدالوحید قریشی، نواب مشتاق احمد خاں، مولوی اعجاز، انور صاحب، عبدالجبار ربانی صاحبان شیخ عبدالشکور اور میرے والد شامل تھے۔ دوپہر تک یہ مجلس اختتام پذیر ہو جاتی۔ اس کے بعد اکثر دوستوں کے ساتھ مقبرہ جہانگیر، شالامار باغ، شاہی قلعہ اور دیگر تفریحی مقامات پر پکنک منانے جاتے۔

اس محفل میں علمی، ادبی اور مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی اور اس دوران پُرتکلف ناشتے کی میز بچھ جاتی۔ ایک اتوار کو والد صاحب کسی وجہ سے ان دوستوں کی محفل میں نہ جا سکے۔ دوستوں نے والد صاحب کو نہ آنے کے جرم میں ایک ادبی عدالتی نوٹس بھیجا جس کی تحریر مندرجہ ذیل تھی:

نوٹس بنام مولانا حاجی سید ابوالکلام اشرف صبوحی
اسیر روح رواں ادارہ شام ہمدرد منجانب عدالت
العالیہ حضرت الحاج الاکبر میاں ایم اسلم مع کونسل
بمقام یاردوخانہ لاہور۔

ہرگاہ ہمارے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ شہر میں آتش بازی کی سرکاری ممانعت کے باوجود آپ کے پاس بہت بڑا ذخیرہ علمی اداروں، ادبی پھلجھڑیوں نکاہی لوگوں اور مزاحیہ پٹاخوں کا موجود ہے۔ اسے آپ نے دیدہ دانستہ جان بوجھ کر اپنے سینے کے صندوق میں بند کر اس پر خاموشی کی مہر اور سکوت کا تالا لگا رکھا ہے۔ آپ کی یہ حرکت چونکہ قابل دست اندازی پولیس ہے۔ اس لیے آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ جتنا اور جس قدر ذخیرہ آپ کے پاس اس ادبی آتش بازی کا ہے، وہ آپ ۴ ماہ شعبان ۱۳۹۱ ہجری بروز یک شنبہ بوقت ۹ بجے صبح نیاز مند عدالت عالیہ کے حضور پیش فرمائیں۔ عدالت عالیہ کے سارے مشیر اس وقت اجلاس میں تشریف فرما ہوں گے۔

عدالت عالیہ اپنے قانونی مشیر سے مشورے کے بعد آپ کو یہ خصوصی رعایت دینے کے لیے تیار ہے کہ آپ نے یہ تمام آتش بازی جو آپ نے چھپا رکھی ہے۔ مسلسل طور پر ہر یک شنبہ کو عدالت عالیہ کے حضور پیش فرما دیا کریں یہاں تک کہ صندوق دل خالی ہو جائے۔

عدالت عالیہ کے تمام آنریبل مشیروں کو اس امر کا یقینی اطمینان ہو جائے کہ اب کوئی ادبی پٹاخہ تک آپ کے ذخیرہ میں باقی نہیں رہا۔

۲۹ رجب ۱۳۹۱ ہجری بروز دوشنبہ

ایم اسلم بقلم محمد اسماعیل
(پانی پتی)
آج ہمارے دستخط خاص اور مہر
عدالت کے ساتھ جاری ہوا۔

٭٭

میاں صاحب نہایت مہمان نواز تھے۔ اکثر دوست دوسرے شہروں سے آ کر ہفتوں ان کے پاس ٹھہرا کرتے، لیکن میاں صاحب کبھی برا نہ مناتے۔ ان کی مہمان نوازی کا ایک واقعہ ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔ ۱۹۶۸ء میں ہماری ہمشیرہ کی شادی ہوئی۔ برات کراچی سے آنا تھی۔ ۳۰ کے قریب مہمان تھے۔ میاں صاحب نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ برات ان کی حویلی میں ٹھہرے گی۔ انھوں نے سبھی لوگوں کے طعام وغیرہ کی ذمے داری بھی لے لی۔ چناں چہ برات آئی۔ میاں صاحب نے ان کی خاطر مدارات میں کوئی کمی نہ چھوڑی جسے آج تک وہ لوگ نہیں بھلا سکے۔ اسی طرح میرے بڑے بھائی کی شادی اور ولیمہ بھی وہیں ہوا۔ میاں صاحب نے اس موقع پر اپنی وضعداری اور روایات مدنظر رکھتے ہوئے مہمانوں کی بڑی خاطر داری کی۔

میاں صاحب کو پرانے گانے سننے کا بہت شوق تھا۔ اس

کے لیے ایک گراموفون بھی رکھا ہوا تھا۔ ریکارڈ بھی سیکڑوں کی تعداد میں تھے۔ اکثر پرانے گانے کئی کئی دفعہ سنتے۔ کہتے تھے کہ ان گانوں سے مجھے ناولوں کے پلاٹ مل جاتے ہیں اور لکھنے میں آسانی رہتی ہے۔ میاں صاحب کو شکار کا بھی شوق تھا۔ نشانہ بہت پکا تھا۔ اڑتا پرندہ فائر کر کے گرا دیا کرتے تھے۔ مچھلی کے شکار کو بھی جاتے۔

ایک روز میاں صاحب کے دوستوں نے میاں صاحب سے پوچھا کہ آپ کا ولیمہ کب ہوا تھا اور اس میں کیا کیا پکا تھا؟ میاں صاحب نے جواب دیا کہ فلاں سن میں میرا ولیمہ ہوا تھا اور یہ یہ چیزیں پکی تھیں۔ دوستوں نے کہا کہ میاں صاحب ہم نے تو آپ کا ولیمہ کھایا ہی نہیں، اب ہمیں کھلائیں۔ چناں چہ ایک اتوار وہ تمام چیزیں پکوائیں جو ان کے ولیمے میں شامل تھیں اور دوستوں نے دعوت اڑائی۔

میاں صاحب نے کئی سو ناول لکھے جن میں رومانی، تاریخی، اصلاحی اور مزاحیہ شامل تھے۔ یہ ناول بڑے ضخیم ہیں۔ اس زمانے میں میڈیا نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ لوگوں کے پاس وقت بھی تھا، اس لیے لوگوں کی بڑی تعداد ناول افسانے وغیرہ پڑھتی تھی۔ مہنگائی بھی اتنی نہیں ہوتی تھی اور ناول لوگوں کی پہنچ میں ہوتے۔

میاں صاحب کو پودوں سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ ان کے صحن میں کئی اقسام کے پھولوں والے گملے موجود تھے۔ ان کی ایک انوکھی عادت یہ تھی کہ نیا سال شروع ہوتے ہی دوستوں سے کیلنڈر دینے کی فرمائش کرنے لگتے۔ انھیں قدرتی مناظر والے کیلنڈر بہت پسند تھے۔

میاں صاحب اپنے ایک ملازم سے بڑے تنگ تھے۔ ایک دن والد صاحب سے کہنے لگے "یہ ملازم مجھے بہت تنگ کرتا ہے اور میری کوئی بات نہیں سمجھتا۔ اسی لیے میں نے اس کا نام ابوجہلا (یعنی جاہلوں کا باپ) رکھ دیا ہے۔"

والد صاحب نے کہا "آپ نے اتنا لمبا نام رکھنے کی کیوں زحمت فرمائی۔ ابوجہل ہی کہہ دیا کریں، تاکہ اسے بھی معلوم ہو کہ اس نام کی کیا اہمیت ہے؟"

میاں صاحب کے ایک دوست پیر صاحب کہلواتے اور اوکاڑہ سے آتے تھے۔ اپنی روحانیت، پاک بازی اور ریاضت کا بہت زیادہ تذکرہ کرتے۔ ایک روز میں گیا، تو وہ اپنی ریاضت کی باتیں بتا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی میاں صاحب نے کہا "پیر صاحب! یہ دیکھیے یہ حاجی صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھنے کے علاوہ تہجد گزار ہیں۔" پھر میری بے انتہا تعریف کی۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر میں گھر آ گیا۔

چند روز بعد میں میاں صاحب کے پاس گیا اور ان سے پوچھا "آپ نے پیر صاحب کے سامنے مجھے تہجد گزار بنا دیا۔ میں پانچوں وقت کی نماز پڑھ لوں تو غنیمت ہے۔"

میاں صاحب کہنے لگے "میں نے صحیح کہا تھا کہ تم تہجد گزار ہو۔ یعنی تہجد گزار دیتے ہو۔ کیا میں نے جھوٹ بولا؟"

میاں صاحب کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اپنی ایک ملازمہ کی بچی کو لے کر پالا۔ وہ اب بھی بقید حیات ہے۔ میاں صاحب نے دو شادیاں کی تھیں۔

میاں صاحب نہایت وضع دار اور دوست نواز انسان تھے۔ جب ہم ہجرت کر کے ہندوستان سے لاہور آئے تو میاں صاحب کے گھر کئی ماہ مہمان رہے۔ ہمارے چچا، شاہد احمد دہلوی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ انھوں نے اپنے گھر کے نزدیک دو مکانات جو ہندو خالی کر گئے تھے ہمیں الاٹ کرا دیے۔ جب ہمارے چچا شاہد احمد دہلوی کراچی چلے گئے، تو ہم اس گھر میں منتقل ہو گئے۔ ان کی بے شمار نیکیاں تھیں، جو بھلائے نہیں بھولتیں۔

علامہ اقبال ان کے استاد تھے۔ کہتے تھے "پہلے میں شاعری کرتا تھا۔ لیکن علامہ صاحب کی ہدایت پر نثر لکھنے لگا۔" ان کے قلم میں بڑی روانی تھی۔

◆◆◆

وردی کی پرچھائیوں سے جھانکتا ہوا جرنیل

افغان جہاد کے ایک ناقابل فراموش کردار کی خیال افروز یادیں

فاروق عادل

ایک زمانہ تھا، ہر پراسرار شخص کی طرح ان کے نام میں بھی ابہام تھا۔ اخبارات و جرائد ان کا نام لکھتے ہوئے اکثر گڑبڑا جاتے اور لکھتے: "بریگیڈیئر گل حمید۔" پھر جب واضح ہوگیا کہ ان کا درست نام حمید گل ہے، تو مجھے ذاتی طور پر قدرے مایوسی ہوئی کیونکہ گل حمید میں تھوڑی سی شاعری، کچھ غیر یقینی کیفیت اور ایک طرح کی بے ترتیبی تھی جو جاتی رہی اور اسرار کا پردہ تھوڑا سا سمٹ گیا۔ بس یہ ایک ذاتی سا احساس ہے۔ ممکن ہے اس کی کوئی اہمیت نہ ہو، لیکن یہ ضرور ہے کہ اسرار کا پردہ ہٹا، تو وہ کھلتے ہی چلے گئے اور پتا چلا کہ وہ بھی ہم جیسے ایک پاکستانی ہیں اور بس! نام کی طرح ان کی تصویر بھی مشکل پیدا کرتی۔

کسی غیر ملکی اخبار میں ایک بار اُن کا پاسپورٹ سائز پورٹریٹ شائع ہوا۔ اس کے بعد یہی تصویر برسوں پاکستانی اخبارات کی زینت بنتی رہی۔ تصویریں اکثر جھوٹ بولتی ہیں، مگر آنکھیں جھوٹ نہیں بولتیں۔ اس تصویر میں اور کچھ نہیں تھا، صرف آنکھیں تھیں۔ اُن کی آنکھوں میں کیا تھا؟ یہ راز اُس دن کُھلا جب ریٹائرمنٹ سے ٹھیک دو برس بعد اُن پر پابندیاں ختم

ہوئیں اور انھوں نے مجھے انٹرویو دیا جو ریٹائرمنٹ کے بعد کسی صحافی کو اُن کا پہلا انٹرویو تھا۔

اپنی عادت کے مطابق میں نے اُن کی پرانی بھولی بسری یادوں کو کریدنے کی کوشش کی، تو بیچ میں سرگودھا آ گیا۔ کہنے لگے، میٹرک کا امتحان میں نے اس شہر کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے پاس کیا۔ میں نے سوال کیا، گورنمنٹ ہائی اسکول نمبر ایک یا ۲؟ یہ سن کر وہ گڑبڑائے اور خاموش ہو گئے جیسے کچھ یاد کر رہے ہوں، مگر یادداشت نے ساتھ نہ دیا اور انھوں نے دھیرے سے کہا کہ وہی گورنمنٹ اسکول جو اُردو بازار کے ساتھ تھا۔

"تھا نہیں سر، اب بھی ہے۔"

میری اطلاع پر وہ مسکرائے، اپنے پرانے اسکول کے اپنی جگہ برقرار ہونے کا سُن کر ان کے چہرے پر بکھرنے والی خوشی کو دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اُردو بازار کے ذکر سے مجھے حوصلہ ہوا اور میں نے پوچھا، کتابیں آپ نے کس قسم کی پڑھیں؟ یہ سوال مشکل نہ تھا، الفاظ ابھی منہ میں ہی تھے کہ وہ بول پڑے: "نسیم حجازی کی"

اور میں نے اس شخص کو پا لیا۔ حالانکہ اپنے مختصر جواب کے بعد انھوں نے وضاحت بھی کی کہ سب سے پہلے یعنی لڑکپن سے نسیم حجازی کے ناول پڑھے اس کے بعد وہ بہت کچھ بھی پڑھا، مگر میرے لیے پہلا جواب ہی کافی تھا کہ نسیم حجازی کے کردار، اُن کی حوصلہ مندی اور ایمان افروز تقریریں دل و دماغ میں جو جوت جگاتی ہیں، جنرل حمید گل اس کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ اقبالؔ کو جانے بغیر نسیم حجازی کے کرداروں کو سمجھنا مشکل ہے۔ انھوں نے فرمایا تھا۔

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اپنی اس پہلی ملاقات میں، میں نے اُن کی دونوں کیفیتوں کا مشاہدہ ہی نہیں کیا، مزہ بھی چکھا۔

جنرل صاحب ہمیشہ مخاطب کا نام لے کر اُس سے بات کرتے۔ ہم عمر اور خود سے بڑوں کے نام کے ساتھ صاحب کا اضافہ کرتے، چھوٹوں کو صرف نام سے بلاتے، مثلاً! فاروق! نام لیتے ہوئے اُن کے لہجے میں حلاوت، بزرگی اور شفقت سب کچھ ہوتا۔ بالکل یوں لگتا جیسے کوئی انتہائی شفیق بزرگ اپنے کسی برخوردار کو بے انتہا پیار سے مخاطب کر رہا ہو۔ وہ نام لے کر متوجہ کرتے، تو جی چاہتا کہ بار بار ایسا ہی کریں۔ یہ کیفیت شاید اُسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب انسان کے دل میں کوئی ملاوٹ ہو اور نہ وہ دکھاوے سے کام لیتا ہو۔ اُن کی محبت کا یہ سلسلہ پہلی ملاقات سے لے کر تادمِ آخر جاری رہا، لیکن بیچ بیچ میں بعض مشکل مقامات بھی آ جاتے، جیسا پہلی ملاقات ہی میں ہوا۔

جن دنوں یہ انٹرویو ہوا، افغان جہاد ابھی موضوعِ بحث تھا اور کہا جاتا تھا کہ جنگ کا پانسہ کبھی نہ پلٹتا اگر مجاہدین کو اسٹنگر میزائل فراہم نہ کیے جاتے۔ بریگیڈیئر یوسف نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب The Bear Trap میں انکشاف کیا تھا کہ امریکا نے برسوں پہلے یہ میزائل فراہم کرنے کی پیش کش کر رکھی تھی، لیکن اسے قبول کرنے میں سات آٹھ برس لگا دیے گئے۔ میں نے یہی سوال اُن سے پوچھا، تو ان کا ردعمل مجھے حیران کر گیا۔ سوال سُن کر وہ ذرا سی دیر کے لیے خاموش ہوئے پھر کہا:

"اس طرح تو انٹرویو نہیں چلے گا، مجھے صلاح الدین صاحب سے بات کرنی پڑے گی۔"

"ریٹائرڈ جرنیل میں ابھی جرنیلی کر و فر موجود ہے۔" میں نے سوچا۔

انٹرویو کا وقت ختم ہو گیا، لیکن سوالات ابھی باقی تھے لہٰذا طے ہوا کہ باقی ماندہ باتیں خالد اسحٰق صاحب کی طرف جاتے ہوئے راستے میں کر لی جائیں۔ وہ آئی جے آئی کا زمانہ تھا جس کے قیام کی ذمے داری اُن پر ڈالی جاتی تھی۔ میرا سوال سُن کر وہ پھر خفا ہو گئے، کہا:

"آئی جے آئی، آئی جے آئی، قومی مفاد کو نہیں دیکھتے؟"

خفگی میں انھوں نے کافی لمبی بات کر ڈالی تھی۔ وہ بات کرتے جاتے تھے اور میں پس منظر سے ابھرنے والی موسیقی

سے لطف اندوز ہو رہا تھا جو کبھی ان کے جرنیلی تمغوں کے کھڑکھڑانے سے جنم لیتی۔

جنرل صاحب ریٹائرمنٹ کے بعد پہلی بار کراچی تشریف لائے، تو صلاح الدین صاحب نے اُن کی پذیرائی کے لیے وسیع پیمانے پر انتظامات اور بہت سے پروگرام مرتب کیے۔ ان میں ایک خالد اسحٰق سے ملاقات بھی تھی۔ خالد صاحب ایک ماہر قانون دان اور صحیح معنوں میں دانش ور تھے۔ وہ کبھی سرسری انداز میں رائے دیتے اور نہ رواداری میں کوئی بات کرتے۔ اُن کی ہر بات نپی تلی اور برسوں کے غور و فکر کا نتیجہ ہوتی۔ جنرل خالد صاحب کے مقابلے میں نوجوان تھے اور دائیں بازو کے پُرجوش "انقلابیوں" کے لیے امید کا مرکز بن کر ابھر رہے تھے۔ اس لیے ہمارے جیسے سادہ لوح عوام اس ملاقات سے بہت امیدیں وابستہ کر رہے تھے۔ خیال تھا کہ ایک عالی دماغ مفکر اور نسبتاً نوجوان ریٹائرڈ جرنیل نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا، تو نظریات کے سوکھے دھان ہرے ہو کر لہلہانے لگیں گے، مگر یہ ملاقات دو ایسے جزوں کی ملاقات ثابت ہوئی جو اپنے اپنے خیالات میں پختہ تھے۔

خالد صاحب کی رائے تھی کہ ہم اپنے قومی مسائل کا ذکر بہت کم کرتے ہیں، مگر یہ مسائل مرتب شکل میں کہیں موجود نہیں۔ اگر انھیں مرتب کر کے دانش وروں کے درمیان سنجیدہ مکالمے کی بنا ڈال دی جائے، تو اس کے اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔ جنرل صاحب نے یہ تجویز سنی ضرور، مگر جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اس بات کو سمجھے نہ تھے یا انھیں اپنے زورِ خطابت پر ناز بہت تھا؟ میں یہ اندازہ نہ اُس وقت لگا سکا اور نہ آج کر سکتا ہوں، لیکن اس زمانے کے "تکبیر" کے شمارے بھی ایک کہانی بیان کرتے ہیں جو اس معمے کو کسی حد تک سلجھا سکتی ہے۔

صلاح الدین کہا کرتے تھے کہ "تکبیر" کا سرورق "جنگ" کے پہلے صفحے کی طرح ہونا چاہیے جس سے پورے شمارے کا تعارف ہو جائے۔ "تکبیر" اردو کا پہلا ہفت روزہ ہے جس نے عام صحافتی رجحان کے مطابق اپنے ٹائٹل پر ایک موضوع کے بجائے آٹھ، دس اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ موضوعات کو جگہ دینی شروع کی، لیکن اِن ہی دنوں روایت بدلی اور عمران خان کی بڑی بڑی تصاویر شائع ہوئیں۔ اس پردہ نگاری کے پیچھے نہ تنہا صلاح الدین تھے اور نہ اکیلے رفیق افغان۔ جنرل صاحب سنجیدگی سے سمجھتے تھے کہ سیاست کو راہِ راست پر ڈال کر اس ملک کے دکھوں کا علاج ممکن ہے۔ سیاست کی اصلاح کے لیے انھوں نے صرف عمران خان پر ہی انحصار نہیں کیا بلکہ کئی اور تجربے بھی کیے۔ ان میں ایک تجربہ پاکستان ووٹرز فورم کے قیام کا بھی تھا۔

ووٹرز فورم کے اصل بانی تو صلاح الدین تھے۔ ہم خیال کی حیثیت سے جناب الطاف حسن قریشی اور جناب مجیب الرحمٰن شامی بھی اُن کے ہم رکاب تھے، لیکن اس تنظیم کی اصل محرک کوئی شخصیت تھی، تو وہ جنرل حمید گل کی ذات تھی۔ بنیادی تصور یہ تھا کہ انتخابی امیدوار کے لیے آئین کی دفعہ ۶۲ اور ۶۳ کو لازم کر دیا جائے۔ اس کے لیے اس وقت کے صدر غلام اسحٰق خان کو قائل کر کے ایک حکم جاری کرانے میں کامیابی ہو گئی، لیکن یہ کامیابی کافی نہ تھی۔ یعنی ممکن تھا کہ شاطر سیاست اس رکاوٹ کو عبور کر کے انتخابی دوڑ میں شریک ہو جائیں۔ اس مقصد کے لیے عدالت میں ایک رٹ داخل کی گئی جس میں استدعا کی گئی کہ انتخابی امیدوار کی اہلیت کو چیلنج کرنے کا اختیار مخالف امیدوار کے ساتھ ساتھ ووٹر کو بھی ہونا چاہیے۔

اس محاذ پر بھی کامیابی ہوئی، لیکن ان بزرگوں کے خیال میں یہ بھی کافی نہ تھا۔ جنرل صاحب اور صلاح الدین کا خیال تھا کہ اس مرض کا علاج صرف یہ ہے کہ رائے عامہ کو اس قدر متحرک اور باشعور بنا دیا جائے کہ ناپسندیدہ عناصر اس کے باوجود انتخابی دوڑ میں شامل ہو جائیں، تو انتخابات کا بائیکاٹ کر کے ان کا انعقاد مشکوک بنا دیا جائے یا عوام اپنی کم شرکت سے انتخابی نتائج ہی کو مشکوک بنا دیں۔ اس مقصد کے لیے پاکستان ووٹرز فورم کی وسیع پیمانے پر رکنیت سازی شروع کر دی گئی۔

ممکن تھا کہ یہ مہم تحریک کی شکل اختیار کرتی، لیکن چند

حادثات نے حالات کا رخ بدل ڈالا۔ پہلے صلاح الدین شہید کیے گئے، پھر حکیم محمد سعید۔ ان دو سانحات کا نتیجہ تھا یا کوئی اور وجہ، جنرل صاحب اور عبدالستار ایدھی، دونوں بزرگوں کو پچھ دیر کے لیے منظر سے ہٹنا پڑا۔ اس کوشش کی ناکامی کے بعد بدعنوانی کے سدباب کے لیے ایک اور فورم بھی بنا جس میں جناب ضیا شاہد جنرل صاحب کے معاون و مددگار تھے۔ اس فورم کی سرگرمیاں کچھ دن دیکھنے میں آئیں مگر بات بن نہ سکی۔

ان تجربات کو دیکھتے ہوئے لگتا ہے کہ جنرل صاحب Trial and error کے قائل تھے، کسی منضبط کوشش کے نہیں۔ اس کے باوجود ملک بھر میں اُن کی بات توجہ سے سنی جاتی۔ ان کے ہم خیال اور حامی ہر نئی صورت حال میں راہنمائی کے لیے ان کی طرف دیکھتے اور مخالفین دائیں بازو اور جہاد پسندوں کی حکمت عملی کو سمجھنے کے لیے۔ وہ تنہا شخص تھے، مگر ایک لشکر کی طرح۔ انھوں نے اپنے ہم خیالوں کی فکری قیادت کی۔ تنہا ہوتے ہوئے بھی بھرپور تحریکیں چلائیں جن سے معاشرے میں ہمیشہ ارتعاش پیدا ہوا۔ وہ قدم اُٹھاتے، تو زمانہ ان کے پیچھے چل پڑتا۔ قدرت یہ خوبی ہر کسی کو عطا نہیں کرتی۔

جنرل صاحب کی سب سے بڑی شناخت اُن کے تابندہ خواب تھے۔ پاکستان کے بارے میں اور عالم اسلام کے بارے میں خواب۔ عالم اسلام کے نقشے کو وہ ہلال کی شکل سے تعبیر کرتے اور پوری مسلم امہ کو دفاعی، اقتصادی اور ثقافتی اعتبار سے مربوط شکل میں دیکھتے۔ وہ کہا کرتے، پاکستان کا محل وقوع، عالم اسلام کے وسائل، افرادی قوت اور وسط ایشیا میں توانائی کے ذخائر ایسے لوازمات ہیں جو مسلمانوں کو ایک بھرپور عالمی طاقت بنا سکتے ہیں۔ پاکستان کے موجودہ مسائل کے بارے میں صرف ایک بات کہا کرتے:

”ہم نے ایک عالمی طاقت کو شکست سے دوچار کیا، اب دنیا ہمیں فتح کی لذت سے محروم کرنا چاہتی ہے۔“

ایسا کہتے ہوئے اُن کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں ہوتیں۔

◆◆◆

فیس بک اور خود پسندی!

الاباما یونیورسٹی کی تحقیق کے مطابق سماجی رابطوں کی ویب سائٹس خاص طور پر فیس بک خود پسند افراد کے لیے جنت سے کم نہیں اور لوگ اسے اپنے لیے مثالی پلیٹ فارم تسلیم کرتے ہیں کیونکہ وہاں وہ لوگوں کو اپنی ذات کے بارے میں بات کرنے کے لیے مدعو کر سکتے ہیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ان کی روزمرہ کی چاہے جتنی بھی معمولی بات ہو، وہ اس کو سامنے لا کر لوگوں سے لائکس اور تعریفی کمنٹس کے ذریعے اپنی انا کو مزید توانا کر سکتے ہیں۔

تحقیق میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ خود پسندی کے عادی نہیں ہوتے وہ فیس بک پر اتنے سرگرم بھی نہیں ہوتے جبکہ اپنے آپ کو پسند کرنے والے افراد اپنی تشہیر میں زیادہ مگن رہتے ہیں۔ اس ویب سائٹ کو خود کو منظر عام پر لانے اور لوگوں کی ستائش حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ تحقیق کے دوران محققین نے فیس بک صارفین میں خود پسندی کی سطح کا جائزہ لے کر ان کی پروفائلز تک رسائی حاصل کی اور ان کے سوشل نیٹ ورکس پر لوگوں کے آنے والے ردعمل یعنی لائکس اور کمنٹس کی تعداد کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد سامنے آنے والے نتائج حیران کن تھے جن کے مطابق فیس بک پر پوسٹ کرنے والا جتنا زیادہ اپنی تشہیر کرنے لگتا ہے، اسے سائٹ پر لوگوں کی توجہ اتنی ہی کم ملنا شروع ہو جاتی ہے۔

دوسروں سے فائدہ اٹھانے اور ہر چیز پر اپنا استحقاق سمجھنے والے افراد کو خود پسندی کے بدترین اثرات کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ فیس بک صارفین ایسے لوگوں کی شناخت کر کے انھیں نظرانداز کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

(مرسلہ: نور)

حکم حاکم، مرگ مفاجات

جرم ضعیفی

آزادی کے جویا ایک معصوم پنچھی کی دلفگار کتھا، ظالموں نے اس کے پر قینچ دیے

جناگل

"ادھر آ اوئے چھوٹے!"

"پانی لا چھوٹے؟"

"اوئے چھوٹے فافٹ، چائے لا صاحب کے لیے۔"

چھوٹے کے کان ان آوازوں سے مانوس ہو چکے تھے بلکہ منتظر رہتے کہ کب بلاوا آئے اور وہ جوابا ہانک لگائے "آیا استاد!"

استاد کی ایک پکار پر چھوٹا چھلاوا بن جاتا اور بنا ہی رہتا۔ اتنا چھوٹا تو نہ تھا۔ اماں کے حساب کتاب کی رو سے گیارہ بارہ سال کا تھا۔ لیکن جانے کیوں استاد کی زبان پر یہ نام پکے رنگ کی طرح چڑھ گیا جو اترنے کا نام ہی نہ لیتا۔ حالانکہ دستور دنیا کے مطابق اور پچھلے کئی خوش قسمتی سے ایک نام "شرفا" بھی اسے دیا گیا تھا۔ کبھی کبھی وہ خود بھی ہنس دیتا اور کہتا "یہ کیسا نام ہے بھلا؟ سر نہ پیر!" جانے یہ کس نام کو بگاڑ کر رکھا گیا۔

خیر ایسے معاشرے میں جہاں ساری توجہ پیٹ کا جہنم بھرنے پر مرکوز ہو، نام کو کون پوچھتا ہے؟ اور پھر شرفے کو کیا پڑی تھی نام سنوارنے کی؟ اسکول میں داخلے کی کون سا لکھا پڑھی ہونا تھی جو وہ نام پر مغز کھپاتا! جب شعور کی آنکھ کھلی اس نے خود کو سائیکل ورکشاپ میں پایا تھا۔ ابا نے استاد کے ساتھ

آنکھوں ہی آنکھوں میں معاہدہ کر لیا۔ گویا کہہ رہا ہو "جتنا میں نے سکھانا تھا سکھا لیا، لے آج سے یہ تیرا پُتر۔" استاد نے اس کبھی دل و جان سے لات رکھی اور بدستور نبھا رہا تھا۔

وہ روزانہ کی بنیاد پر پچاس روپے مزدوری دینے کے ساتھ ساتھ گالیاں اور گھونسے بھی مفت میں کھلاتا۔ جانے وہ اس "خزانے" کا اتنا بے دریغ استعمال کیوں کرتا تھا؟ شرفا اکثر سوچتا رہ جاتا۔ شرفے کے لیے اپنے نگے بندھے معمول میں کوئی کشش نہ تھی۔ صبح سویرے اٹھ کر چائے کے ساتھ پاپے حلق سے نگلتا، تو فوراً ابے کا حکم حاضر ہوتا۔ "سیدھا ورکشاپ جانا۔" ابا یہ کہہ کر فیکٹری کی راہ لیتا اور اس کا نوالہ حلق میں اٹک جاتا۔

یہ دن کے آغاز کا پہلا سبق ہوتا۔ ابا کی نسبت اماں اس پہ واری صدقے جاتی۔ دوپہر کے لیے روٹی میں پالک، گوبھی یا کسی سبزی کا سالن باندھ دیتی۔ جب وہ اس کے لیے صاف اچھے کپڑے نکالتی، تو شرفا چیخ اٹھتا "مت دیا کر اماں اچھے کپڑے، شرم آتی ہے مجھے۔"

"ہیں۔" اماں حیرت کا بت بن جاتی "شرم آتی ہے اچھے کپڑے پہن کر؟ بھلا وہ کیوں؟" ماں پوچھتی۔

"ہاں نا، کون سا اسکول جا رہا ہوں جو اجلا ہو کر جاؤں۔ اسی سڑے ہوئے ورکشاپ جا رہا ہوں کپڑے کالے کرنے۔" یہ کہہ کر وہ دہلیز پار کر لیتا اور اماں کا دل خوشی اور دکھ کے ملے جلے جذبے سے بھر جاتا۔ خوشی اس بات کی کہ میرے لال کو بھی بڑے لوگوں کی طرح اسکول جانے کا شوق ہے۔ غم اس بات کا کہ افسوس وہ اس کی یہ خواہش پوری کرنے سے معذور ہے۔ درحقیقت اس کا غم خوشی سے زیادہ تھا۔

اور پھر ورکشاپ میں استاد کی زبان ہوتی اور چھوٹے کی شامت "اوئے چھوٹے، ٹائر بدل اس سائیکل کا"..... "ادھر چائے لے آ دو کپ....." "چھوٹے ذرا میرے پاؤں تو داب دے، مفت کی روٹیاں توڑتا ہے۔" یہ سن کر شرفا جل بھن جاتا۔

لیکن لب کچھ کہنے سے معذور تھے سوائے ایک لفظ کے "آیا استاد۔"

زبان پہ قفل لگا تھا، احسان کا بھاری قفل! جس سے زبان تالو کے ساتھ چپک گئی۔ ہاں بھئی یہ احسان ہی تو تھا کہ بقول ابا "کون آج کل کسی کو نوکری دیتا ہے؟ شرفا اچھا بھلا کما لیتا ہے۔"

شرفا دانت پیس لیتا۔ استاد کی جز وقتی بلکہ کل وقتی نوازشیں جاری رہتیں "اوئے خبیث، نکمے، میرے سر پہ پڑا ہے پاجی!" اس لمحے شرفے کا جی چاہتا کہ پاؤں نہیں استاد کا گلا دبا دے کہ روز روز کی جھک جھک سے نجات ملے۔ سیاہ کپڑے پہنے بکھرے بالوں میں گند بلا اٹکائے گویا گھونسلا ہو، کالے ہاتھ لیے اور چہرے پہ بھی حسبِ آرائش دھبے لگائے شرفا صبح سے دوپہر تک چکری بنا رہتا اور گول گول گھومتا۔

دوپہر کو کھانے کا وقفہ ہوتا، تو سکھ کا سانس لیتا۔ کھانے کے بعد استاد ذرا اونگھ لیتا۔ اونگھ کا یہ وقفہ کبھی کبھی نیند میں داخل ہو جاتا۔ اس لمحے وہ دعا کرتا کہ نیند کا یہ لمحہ طویل ہو جائے کیونکہ تب وہ اپنا پسندیدہ نظارہ دیکھتا جس کے لیے سارا دن منتظر رہتا تھا۔ سائیکل کی یہ ورکشاپ مین روڈ پر واقع تھی۔ اس کے بالمقابل ایک نالہ تھا اور اس کے پار پرائمری اسکول! شرفے کا واحد پسندیدہ مشغلہ اسکول کے اندر تکنا تھا۔ ذرا استاد ادھر ادھر ہوا وہ فوراً نالہ پار کر اسکول کے گیٹ سے لگ جاتا اور پڑھتے لڑکوں کو حسرت کی نگاہ سے دیکھتا۔

صبح اجلی وردی میں بستے تھامے چھوٹے بڑے لڑکوں کو اسکول جاتے دیکھتا، تو شدت سے اس کا جی چاہتا کہ ورکشاپ سے بغاوت کر کاپی کتاب لے، جماعت میں پڑھنے بیٹھ جائے اور استاد کے زنگ کانیاں دینے پر بھی نہ ہلے۔ لیکن آہ! ایسا صرف سوچا جا سکتا تھا کیوں کہ اگلے ہی پل استاد کی پاٹ دار آواز گونج اٹھتی "اوئے چھوٹے، کدھر مر گیا!"

چھوٹا سر کے بل بھاگ کر نعرہ لگاتا "آیا استاد۔"

اس وقت بھی جوں ہی استاد کی آنکھ لگی، وہ جھٹ ایک ہی

جست میں نالہ پار کر اسکول کے دروازے سے لگ گیا۔ اندر سے آتی آواز اسے کسی مدھر جھرنے کی گنگناہٹ لگ رہی تھی "ایک دونی دونی، دو دونی چار۔" استاد کی گالیوں سے یکسر جدا، گاڑیوں کے شور سے بالکل مختلف، پان والے کی پکار سے قطعاً الٹ "تین دونی چھے، چار دونی آٹھ۔" شرفے کے کانوں کو یہ آواز کسی دلکش موسیقی کی طرح لگتی اور وہ بھی آہستہ آہستہ ان کی پیروی میں دہرانے لگتا "ایک دونی دونی، دو دونی چار۔"

تب اسے ایسا انوکھا لطف ملتا جو چاچے رشید کے گندے گولے کھا کر بھی حاصل نہ ہوتا۔ "تین دونی چھے، چار دونی آٹھ۔" وہ پُرجوش سا ہو کے ایک قدم آگے بڑھ آیا اور گیٹ پار کر لیا۔ لڑکوں نے چونک کر اسے دیکھا اور مسکرا کر دوبارہ پہاڑے پڑھنے لگے۔ شرفے نے جواباً پھیکی مسکراہٹ چہرے پہ سجالی۔ اس کی بعض لڑکوں کے ساتھ جان پہچان تھی۔ کچھ محلے کے تھے، باقی ورکشاپ پہ سائیکل مرمت کرانے آتے۔ شرفے کے شوقِ تعلیم کا یہ عالم تھا کہ دو تین پہاڑے یونہی سن سن کے اسے یاد ہو چکے تھے۔

اسکول میں دروازے کے سامنے والی دیوار پر خوبصورت خطاطی میں کچھ الفاظ درج تھے۔ جب لڑکوں نے وہ الفاظ اسے پڑھ کر سنائے، تو شرفے کے دل و دماغ کے ساتھ ساتھ روح پہ بھی نقش ہو گئے: "علم حاصل کرو۔"..... "علم نور ہے جہالت تاریکی ہے۔"..... "پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنو۔" جانے ان الفاظ میں کیسا سحر تھا کہ جب وہ انھیں دیکھتا، تو دل و دماغ پر عجب کیفیت طاری ہو جاتی۔ اس کا دل جوش و جذبے سے بھرتا اور چہرہ سرخ ہو جاتا۔ لیکن جب وہ حقیقت کی دنیا میں واپس آتا، تو بے بسی کے احساس سے اس کی آنکھوں میں نمی آ جاتی۔ جب خوش کن خواب بے دردی سے کھرچ کر اپنے ذہن سے ہٹاتا، تو اس لمحے اسے خود پر بے پناہ ترس آتا۔

ایک دن جب استاد اتفاقاً کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا، چھٹی کے وقت اسکول کے ایک معمر ماسٹر جی اپنی سائیکل مرمت

شوہر کی انوکھی محبت

امریکا میں ایک شخص نے محض اس وجہ سے اپنی بیوی کو کھلا کھلا کر اس قدر موٹا کر دیا کہ وہ اسے چھوڑ کر نہ جائے۔ امریکی ریاست ٹیکساس کے شہر ہوسٹن کی رہائشی ۲۲۰ پاؤنڈ وزنی خاتون غسل خانے جانے کے لیے بھی شوہر کے سہارے کی محتاج ہے۔ اسے اس کے شوہر نے اس وجہ سے ۷ سال تک وزن گھٹانے سے باز رکھا تاکہ وہ ہمیشہ اس کے پاس رہے۔ شوہر کو ڈر تھا کہ اگر اس کی بیوی دبلی پتلی ہو گئی، تو پھر اسے اس کی ضرورت نہیں رہے گی اور ایسے میں وہ اسے چھوڑ بھی سکتی ہے۔

کرانے آئے۔ باقی لڑکوں کی دیکھا دیکھی شرفا بھی انھیں ماسٹر جی پکارتا اور دل سے ان کا ادب کرتا تھا۔ پنکچر لگانے کے بعد جب ماسٹر جی نے پوچھا "ہاں بھئی کتنی اجرت؟"

"کچھ نہیں، ماسٹر جی۔"

"نا بھئی لڑکے۔" وہ مصر ہوئے۔

"آپ میرے بھی استاد ہو ماسٹر جی۔" شرفا ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کچھ ایسی عقیدت اور بے چارگی سے کہا کہ ماسٹر جی لڑکے کی آنکھوں میں جھانکنے لگے۔

"پڑھنا چاہتے ہو؟" وہ اس کی علم دوستی سے واقف تھے۔

"کیا؟" شرفا بونگوں کی طرح ان کا منہ تکنے لگا۔ اسے علم نہ تھا کہ ایسے موقع پر کیا کہنا چاہیے۔

"میرا مطلب ہے اسکول میں پڑھنا لکھنا چاہتے ہو۔ پڑھنا اچھا لگتا ہے؟" انھوں نے شفقت اور نرمی سے پوچھا۔

"جی..... میں..... میں بڑا آدمی بننا چاہتا ہوں۔" شرفے کو یہی مناسب سوجھا۔ پھر جھٹ سے زبان دانتوں تلے داب لی اور کن انکھیوں سے ماسٹر جی کو دیکھا۔

"ہاں برخوردار! پڑھ لکھ کر ہی بڑا آدمی بنو گے نا۔" ماسٹر جی

نے ہنستے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ "آجایا کرنا اسکول جب موقع ملے۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں جس کے لیے تم دل چھوٹا کرو ٹھیک ہے نا۔" ماسٹر جی نے اسے تھپکی دی۔

"جی ماسٹر جی۔" اس لمحے اپنے استاد کے مقابلے میں اُسے ماسٹر جی فرشتہ ہی لگے۔ استاد ہوتا تو دولتیاں مارتا کجا کہ تھپکی دیتا۔

اب عین دوپہر کو جب استاد کے سونے کا وقفہ ہوتا، شرفا چپکے سے اسکول جا پہنچتا۔ ماسٹر جی نے اسے ایک عدد کاپی اور پنسل عنایت کر دی۔ وہ پہاڑے سیکھتا۔ جو کچھ ماسٹر جی تختہ سیاہ پہ لکھتے، کاپی پہ اتارتا اور ورکشاپ میں استاد کی نظر بچا کر ان کی مشق کرتا۔ دو تین دنوں ہی میں اسے اپنی دنیا بدلی بدلی محسوس ہونے لگی۔ ایک عجیب سا کیف اور لطف کا احساس ہوتا جیسے جو کوئی بڑی تمنا پوری ہونے پر ملتا ہے۔

پہلے وہ استاد کی وقت بے وقت گالیاں کھا کر بڑبڑاتا رہتا تھا، اب بڑے آرام سے سب کچھ سہہ جاتا اور مطلق پروا نہ کرتا۔ سارا دن خوشی خوشی کام کرتے ہوئے دوپہر کو استاد کی آنکھ لگنے کا انتظار کرتا۔ وقفہ ملتے ہی اس کا انگ انگ خوشی سے بھر جاتا۔ یوں لگتا جیسے ایک قید پنچھی کو آزاد فضاؤں میں اڑنے کے لیے رہائی مل گئی۔ لیکن شرفے کو احساس نہ تھا کہ اس نے بڑا مہنگا سودا مول لیا ہے، اتنا مہنگا کہ جسے خریدنے کی وہ استطاعت بھی نہیں رکھتا۔ لیکن اسے کیا خبر؟

شوق سے جی بھرنے کا ابھی ایک ہفتہ بھی نہ بیتا تھا کہ بے حس معاشرے کی آنکھوں میں وہ کانٹا بن کر کھٹکنے لگا۔ شاید معاشرے کے نزدیک اس کی یہ جسارت غداری کے زمرے میں آتی تھی۔

شرفا ایک دن معمول کے مطابق کام کر رہا تھا۔ استاد نے اسے ورکشاپ کا خیال رکھنے کو کہا اور خود ایک کام کے سلسلے میں باہر نکل گیا۔ استاد کے نکلتے ہی جھٹ سے اس نے کاپی پنسل نکالی اور سبق کی مشق کرنے لگا۔ استاد کو کچھ زیادہ ہی دیر لگ گئی۔

اس نے سوچا، کیوں نہ اسکول کا چکر لگا لیا جائے۔ ویسے بھی اس وقت ورکشاپ پہ کوئی نہ تھا۔ شرفا محتاط انداز میں باہر نکلا۔ ادھر ادھر تکا، استاد نہ تھا۔ سکھ کا سانس لیا اور جھٹ سے نالہ پار کر اسکول پہنچ گیا۔

بمشکل پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ استاد کی دھاڑ سنائی دی "اوئے.....شرفے....." اردگرد کے در و دیوار بھی ہلے ہوں، تو شرفے کے اندر اس دھاڑ سے بھونچال آگیا۔ اسے اس کے اصلی "نام" سے پکارا جانا استاد کے انتہائی غصے کی دلیل تھی۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ دھڑکتے دل کے ساتھ جھٹ پٹ نالہ پار کیا لیکن یہ کیا.....اس وقت تو ورکشاپ پہ کوئی نہ تھا لیکن اب وہ لوگوں سے بھری پڑی تھی۔ ایک دو "صاحب" بھی تھے۔ بڑی گاڑیوں والے اور مکینک غائب! شرفے کو اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی۔ استاد کی نگاہ پڑتے ہی وہ غرایا:

"کہاں گیا تھا تو؟ کہاں گیا تھا؟ ورکشاپ لوگوں سے بھری پڑی ہے اور تو رنگ رلیاں منا رہا ہے سالے..... باپ کی دکان سمجھ رکھی ہے پاجی" !وہ لال انگارہ ہو گیا۔

"استاد.....وہ.....وہ" وہ ہکلایا اور بے بسی سے اسکول کی جانب نگاہ کی۔

"کیا کرنے گیا تھا، تو وہاں..... ہاں.....اور یہ کیا ہے؟" استاد نے اس کے ہاتھ سے کاپی جھپٹ لی۔

"چھوکرا پڑھنے جاتا ہے استاد! اب کیا، تو نے کھانا کرواتا ہے؟ تیرے کام سے تو گیا۔" ایک غدار نے رپورٹ دی۔ بے حس معاشرہ تماش بین تھا۔

"اچھا تو چھپ کے یہ گل کھلاتا ہے اور میں نے تجھے مفت میں کھلانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے ہاں....." اس کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ پڑا اور پھر استاد اس پر پل پڑا۔ شرفا اپنے بچاؤ کی ناکام کوششیں کرتا رہا، لیکن استاد کا غصہ تھپڑوں، گھونسوں اور گالیوں سے نہیں تھما۔

"غلطی ہوگئی اُستاد..... پھر..... پھر نہیں جاؤں گا..... مگر..... یہ کاپی تو دے دیں..... پھر نہیں جاؤں گا اُستاد" شرفے نے گویا اعترافِ جرم کرلیا۔

"کمینے کتاب مانگتا ہے، لے تیرا دل ٹھنڈا ہوئے" الٹے ہاتھ کا تھپڑ پڑا اور وہ تیورا کے گر پڑا۔ اُستاد نے اس کی کاپی کے پرزے پرزے کردیے۔

شرفے نے اذیت سے آنکھیں موندلیں۔ اس کا سر پرانی سائیکلوں کے پرزوں سے ٹکرایا تھا، لیکن جسمانی مار سے زیادہ اسے کاپی کے حشر نے اذیت دی تھی۔

"زیادہ پڑھنے کا شوق ہے نا، تو گھر بیٹھ کر پڑھ نواب صاحب، تیرے باپ نے تجھے یہاں کام کے واسطے بٹھایا ہے ان "خرافات" کے لیے نہیں۔ خبردار! آئندہ میں نے تجھے وہاں دیکھا تو..... بڑا آیا بڑا آدمی بننے والا!" اُستاد نے اسے ٹھوکر ماری اور پھر لوگوں کی جانب متوجہ ہوگیا۔

شرفے نے آنکھیں کھولیں۔ سر میں بے تحاشا درد تھا۔ پیشانی پہ ہاتھ رکھا۔ ہٹا کے دیکھا، تو خون سے تر تھا۔ قمیص کے دامن سے ماتھا صاف کیا۔ اردگرد کاپی کے صفحات بکھرے پڑے تھے۔ ایک صفحہ اٹھایا اور آنکھوں کے سامنے کیا۔ "میرا قصور کیا ہے آخر؟" ایک چبھتا سوال اس کے ذہن میں گردش کرنے لگا۔ اردگرد کے درودیوار اسے خود پہ ہنستے اور یہ کہتے ہوئے محسوس ہوئے "اپنا قصور پوچھتا ہے؟"

"لیکن اتنے چھوٹے جرم کی اتنی بڑی سزا؟" شدتِ ضبط سے وہ گڑگڑایا۔

"تم نے بڑا بننے کی جسارت کی تھی، کیا یہ چھوٹا جرم ہے؟" اسے اس کی اوقات یاد دلادی گئی۔

"یہ کیسا معاشرہ ہے جو جینے کی اُمید دلاتا، لیکن غم سہنے کے لیے تنہا چھوڑ دیتا ہے۔" اس کے حساس دماغ میں یہ سوال کلبلایا۔ پھر ڈبڈبائی آنکھوں سے اسکول کی جانب نگاہ اٹھ گئی۔

بجھتا ہوا سا منظر تھا، اس کے نصیب پہ چھائی گرد کی طرح۔

"اور یہ کیسا معاشرہ ہے جو اکلوتی خوشی بھی چھین لیتا ہے۔" اس نے بھیگی نگاہیں ورکشاپ کی دوسری جانب اٹھائیں۔ سوٹڈ بوٹڈ "صاحب" کرسیوں پہ بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ قہقہے لگاتے، ہنستے مسکراتے، خوش باش چہرے۔ اُستاد ان کی لمبی کاروں سے گرد جھاڑ رہا تھا۔ شاید یہی گرد تھی جو اس کا نصیب بنا گئی۔

"جانے یہ گرد چھٹے گی بھی کہ نہیں؟" اس نے تکلیف کی شدت سے آنکھیں موندلیں۔ غلطی شاید اسی کی تھی۔ "چھوٹا" تھا تو چھوٹا ہی رہتا، "بڑا" بننے کے لیے کیوں پر تولنے لگا..... جسے معاشرہ "چھوٹا" تسلیم کرلے، اس کا "بڑا" بننا معاشرے کو ہضم نہیں ہوتا۔ ہاں کہ نہیں؟

◆◆◆

موبائل کی حساسیت

امریکا سے تعلق رکھنے والے کلینیکل سائیکالوجسٹ ڈیوڈ لارامی کا کہنا ہے کہ دنیا بھر میں تقریباً دو تہائی افراد کو تخیلاتی وائبریشن کا تجربہ ہوتا ہے اور ایسا اس وجہ سے کہ ہمارے دماغ میں حرکات کو ڈھونڈنے کی صلاحیت قدرتی طور پر پائی جاتی ہے اور جلد میں دو قسم کے عصبات وائبریشن کو محسوس کرتے ہیں۔ ایک قسم ہلکی فریکوئنسی جبکہ دوسری قسم تیز فریکوئنسی کو محسوس کرتی ہے۔ زیادہ تر موبائل فون ۱۳۰ سے ۱۸۰ ہرٹز کے درمیان وائبریٹ کرتے ہیں۔ اتفاق سے یہ فریکوئنسی دونوں اقسام کے عصبات کی فریکوئنسی کے تقریباً درمیان میں ہے۔ جب ہمارے کپڑے جسم کے ساتھ چھوتے یا ہم کوئی موہوم آواز سنتے ہیں، تو دماغ اسے اس آواز کے ساتھ منسلک کردیتا ہے جو اکثر دماغ کی توجہ کھینچی رہتی ہے۔

بارگاہ الٰہی میں قبول ہوئی

سچی قربانی

مال ومتاع پر خوشنودی رب کو ترجیح دینے والے ایک نیک جوڑے کی یادگار کہانی

جویریہ شریف

پہلا منظر

خوبصورتی اسدہ کے لیے آزمائش ثابت ہوئی۔ تاریخ انساں میں پہلے قتل کا باعث بننے والی اسدہ اپنے محبوب، ہابیل کی موت پر نوحہ کناں تھی۔ قابیل نے اسدہ کو پانے کے لیے تمام دنیاوی اسباب مہیا کیے، مگر وہ اس کی تھی اور نہ ہی اسے مل پائی۔ اگر قابیل اللہ کے حضور اپنی بہترین قربانی پیش کر دیتا، تو شاید اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرتے کہ رہتی دنیا تک تمام قتال کا گناہ اس کے سر نہ جاتا۔ مگر اسدہ کے لیے ہابیل تو اپنے ریوڑ کا بہترین دنبہ لایا، مگر قابیل تھوڑی سی گندم! کیونکہ قربانی قبول ہونے پر آگ اس قربانی کو لے جاتی۔ تو قابیل نے اچھے مال کو اللہ کی راہ میں ضائع کرنا مناسب نہ جانا اور قتل کرنے کو آسان سمجھا۔ یوں دنیا کا پہلا قاتل بن بیٹھا۔

دوسرا منظر

ثنا کی شادی پچھلے دسمبر ہوئی تھی۔ میکے میں مال کی فراوانی اور لاڈ پیار کے باعث من چاہے ملبوسات خریدنا اور ہر موقع پر نیا لباس زیب تن کرنا اس کی عادت ثانیہ بن گیا۔ شادی ہوتے ہی میاں کے ساتھ علیحدہ گھر میں جاتے وہ خوب آزادی محسوس کرنے لگی۔ میاں محبت کرنے اور ہر خواہش کو سر آنکھوں پر بٹھانے والے تھے۔ سو ثنا کی خوشیاں دوبالا ہو گئیں۔ سیر وتفریح ہونے لگی۔ کبھی باہر کھانا کھایا اور کبھی من چاہے لباس پہنے جاتے۔ غرض صرف خوشیاں ہی اس کے گرد رقصاں تھیں۔

مگر خوشیوں کے یہ دن جلد ہی معمول کی جانب گامزن ہو گئے۔ شوہر کی محدود تنخواہ میں اخراجات پورے کرنا زندگی کی وہ حقیقت تھی جو کبھی نہ کبھی سامنے آ جاتی۔ جہاں ہوٹل بازی میں

کی آئی، وہ بیا من چاہی چیزوں پر بھی ہاتھ روکنا مجبوری بن گیا۔

شادی کے بعد پہلی عید آئی۔ ثنا جٹھانیوں اور بھابیوں کے مقابلے میں بہترین لباس پہننے اور آرائش کرنے کی خواہاں تھی۔ مگر یہاں بھی محدود آمدنی آڑے آئی۔ مگر ثنا نے سہیلیوں سے کچھ رقم قرض لے کر آخر عید کی بہترین تیاری کر ہی لی۔ عید اس کے لیے بہترین ثابت ہوئی، وہ واقعی سب میں نمایاں نظر آ رہی تھی۔

مگر کیا کیجیے، ڈھائی ماہ بعد نمکین عید پھر آ رہی تھی اور قرض کی ادائیگی بھی اس سے قبل کرنی تھی۔ ثنا نے خوب ہاتھ روکا پھر بھی عید سے قبل من چاہی خریداری کے لیے پیسے نہ بچے۔ اور پھر قربانی..... وہ تو ممکن ہی دکھائی نہ دیتی۔ شادی کی اولین عیدوں میں ہی بار مان لینا مشکل کام تھا۔ یوں تو جہیز و بری کے بیشتر کپڑے ان سلے موجود تھے، مگر فیشن کے مطابق ڈیزائن کیا گیا سوٹ نہ پہن کر عید کیسے ہوتی؟

ثنا نے بہت غور کیا اور بالآخر فیصلہ کر ہی لیا کہ لباس تو بہرحال دکھائی دیتا ہے۔ سو اس نے ستمبر کے آغاز میں ایک بہترین سوٹ خرید لیا۔ قربانی کے متعلق وہ سوچ چکی تھی کہ کہہ دوں گی، مہاجرین کو بھجوا دی۔ اب کسی نے کون سا جا کر دیکھنا تھا؟! اس رات ثنا خاصی خوش اور مطمئن سوئی۔

رات کو کسی پہر اچانک شور اٹھا۔ ثنا اور اس کے میاں بھی بیدار ہو گئے۔ معلوم کیا تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی کیونکہ بند ٹوٹنے کے باعث شہر میں سیلاب آ چکا تھا۔ لوگوں میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ سامان جلد از جلد چھت پر منتقل کر دونوں خاصے تھک گئے۔ جہیز کا سامان خاصا وزنی تھا، مگر اسے پانی میں کیسے چھوڑ دیتے؟! اسے سنبھالتے ہوئے خاصی دیر لگ گئی۔

صبح ہونے تک پانی گھر میں داخل ہو چکا تھا۔ الماریاں اور پیٹیاں اٹھانا مشکل تھا، اس لیے انھیں نیچے ہی چھوڑ دیا گیا۔ ثنا کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ مگر جو ممکن تھا، وہ کر لیا گیا۔ چھت پر بیٹھے دوسرا دن تھا۔ کھانے کا جو کچھ سامان وہ سمیٹ لائے تھے، ختم ہونے والا تھا۔ آخر فوج کی امدادی کشتیاں آ پہنچیں۔ مگر سامان چھوڑنا ثنا کے لیے تکلیف دہ امر بن گیا۔ آخر میاں سامان کی حفاظت کے لیے رک گئے۔ ثنا امدادی ٹیم کے ساتھ محفوظ علاقے میں منتقل ہو گئی۔ اسے بہرحال رہ رہ کر اپنے شوہر کا خیال آتا۔

سیلاب کا پانی کم ہوتا دکھائی نہ دیتا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہاں خشکی تھی ہی نہیں یا شاید یہ دریا ہی کا حصہ ہو۔ ایک ہفتہ بہت مشکل سے کٹا۔ میاں اس کے پاس نہ پہنچ سکے۔ مگر وہ یہ سوچ کر مطمئن تھی کہ وہ کسی اور محفوظ مقام پر ہوں گے۔ جب پانی نیچے آیا، تو ثنا گھر کی جانب روانہ ہوئی۔ جب وہ اپنے محلے میں داخل ہوئی، تو وحشت نے اس کو گھیر لیا۔ جگہ جگہ مکانوں کی دیواریں گری پائیں۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

جب ثنا ڈرتے ڈرتے اپنے گھر پر ڈالی تو دل دہل گیا۔ کمرا گر چکا تھا اور سامان سمیت چھت نیچے آ پڑی تھی۔ وہ دیوانہ وار بھاگی۔ جہیز کے ملبے تلے پھنسی اسے اپنے میاں کی نعش نظر آئی، تو وہ غش کھا کر گر پڑی۔ وہ اپنے میاں کو محبوب سامان پر وار چکی تھی اور قدرت نے بھی اس کی قربانی وصول کر لی۔

تیسرا منظر

شاہنواز اپنے نام کے مانند شاہ و نواز ہی تھا اور چار بھائیوں میں سب سے چھوٹا۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی جوانی کے جوش اور شوق سب عود کر آئے۔ یوں بھی چھوٹے ہونے کے باعث گھر بھر کا لاڈلا تھا، سو اپنے شوق پورے کرنا وہ اپنا حق سمجھتا۔ کبھی دوستوں کے ساتھ مچھلیاں پکڑنے نکل جاتا، کبھی شہر سے باہر سفر کرتا، کبھی نئے ماڈل والا موبائل درکار ہے، تو کبھی نئے لباس کی ضرورت!

عملی زندگی میں قدم رکھ چکے بھائیوں نے اسے زندگی کے حقائق بتانے چاہے، مگر وہ من موجی تھا۔ بمشکل ملازمت کرنے پر رضامند ہوا۔ تنخواہ ملنا شروع ہوئی، تو آناً فاناً خرچ ہو جاتی۔ اس ماہ نئے ماڈل کا موبائل لے لیا اور اگلے ماہ نئے کپڑے اور جوتے

بنتے۔ غرض چند ماہ میں اس نے اپنے کئی خواب پورے کیے۔

عید قربان کی آمد آمد تھی۔ سب بھائی قربانیوں کے سلسلے میں مشورے کر رہے تھے۔ مگر شاہنواز اپنی ہی دنیا میں مست تھا۔ موصوف کے نزدیک ابھی قربانی اس پر فرض نہ تھی۔ بہرحال نیا لباس زیب تن کرنا، تو اس کا حق تھا، لہٰذا اس کی اسے خوب خبر تھی۔ اسی لیے وہ دوسرے شہر سے خریداری بھی کر آیا۔ خوش اور مطمئن تھا کہ اگلے ہی روز اس کا قیمتی موبائل چوری ہو گیا جو پچھلے ہی دنوں پچاس ہزار میں خریدا گیا تھا۔ شاہنواز کو افسوس ہوا مگر قدرت نے قربانی وصول کر لی۔

چوتھا منظر

لائبہ اچھے ادارے میں میاں کے ساتھ ملازمت کر رہی تھی۔ تنخواہ اچھی تھی۔ اچھے لباس اور خوراک کی شوقین لائبہ خوب مزے کر رہی تھی۔ گھر کی کوئی ذمے داری اس پر نہ تھی۔ پھر کوئی تنخواہ میں حصے دار بھی نہ تھا۔ ایک دو ماہ کی تنخواہ سے سونے کی چھوٹی موٹی چیز وہ اکثر بنا لیتی۔ دوستوں کے ساتھ ہلکی پھلکی محفلیں بھی سج جاتیں۔ عید پر بیش قیمت لباس پہننا اسے بہت پسند تھا اور وہ لے بھی سکتی تھی۔ پھر ملازمت کرنے والوں کو یوں بھی اچھے کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہی ہے۔

ابھی چھوٹی عید پر ہی اس نے پندرہ ہزار کا قیمتی لباس لیا تھا۔ سب نے اسے پسند بھی بہت کیا۔ اب بقر عید کے لیے بھی ایک بہترین سوٹ اس کی نظر میں تھا۔ وہ ملبوسات کی خریداری دوسرے شہر سے کرتی تھی تاکہ وہ منفرد نظر آئیں۔ عید پر قربانی کے بارے میں اس نے کبھی نہ سوچا کیونکہ یہ تو مردوں کی ذمے داری ہے۔ اس کے شوہر ہر سال بہترین قربانی کرتے تھے۔ اب کی بار بھی اس نے اپنی تنخواہ عید کی خریداری کے لیے علیحدہ رکھ چھوڑی۔ وہ خوش اور مطمئن تھی۔ اللہ اللہ کر کے ہفتہ کے روز خریداری کرنے جانے لگی، تو رقم لینا چاہی مگر وہ وہاں ہوتی تو ملتی! وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی مگر بے سود..... کیونکہ قدرت قربانی لے چکی تھی۔

حقیقی منظر

عبداللہ پچھلے کچھ عرصے سے پریشان تھا۔ کاروبار میں ہونے والے نقصان نے اسے فکر مند کر رکھا تھا۔ گھر بار کی ذمے داری انجام دینا اور بیوی بچوں کا خیال رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ ابھی چند ماہ قبل وہ اپنی اکلوتی کار بھی بیچ چکا تھا۔ رمضان میں پھل خریدنے خاصے مشکل ہو گئے۔ عیدالفطر کی تیاری کا تو موقع ہی نہیں تھا۔ بیوی بچے بھی اس صورت حال سے متاثر ہوئے۔ مگر اللہ نے مدد کی کہ بیوی خیال رکھنے والی اور مددگار تھی۔ سو پہلے سے رکھے گئے کپڑوں اور تحائف کے باعث عید پر کوئی ان کے حالات سے آگاہ نہ ہو سکا۔ انھیں خوشی تھی کہ اللہ نے عزت رکھ لی۔

مگر اب عید اور قربانی، دونوں انھیں بڑا مسئلہ محسوس ہوئے۔ عبداللہ بارگاہ الٰہی میں دعا گو تھا کہ وہ وہی سب کا پالن ہار ہے۔ رب نے بھی اپنے بندے کو مایوس نہ کیا۔ عبداللہ نے کسی کو کئی ماہ قبل کچھ رقم قرض دی تھی۔ وہ عید سے تین روز قبل مل گئی۔ اسے پا کر عبداللہ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ پھر میاں بیوی کے مابین طے پایا کہ کپڑے وغیرہ لینے کے بجائے قربانی کر لیتے ہیں۔

اللہ کا نام لے کر پیسے بھجوا دیے تاکہ قربانی کا جانور خریدا جا سکے۔ جب ایک روز قبل عید منانے اباجی کے پاس پہنچے، تو وہاں رشتے داروں کی جانب سے ان کے لیے تحائف موجود تھے۔ ان میں ملبوسات کے تحفے بھی تھے۔ یہ سوچ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ اللہ کیسے بندوں کی عزت رکھتا ہے؟ اللہ کو اپنے بندوں کی ادا پسند آ گئی تھی۔ وہ مشکلات کے جس بھنور میں پھنس گئے تھے، اللہ نے باسہولت اس سے انھیں نکال لیا کیونکہ قربانی دے دی گئی تھی اور وہ قبول بھی ہو گئی۔

دعا ہے کہ اللہ ہماری قربانیاں قبول کرے تاکہ قدرت ہم سے من چاہی قربانی لیتی رہے۔ (آمین)

◆◆●

کرپٹ اوڑھے پھرتے ہیں

نقاب

ان ''صاحبوں'' کی داستان جو ایمان داری و فرض شناسی کا ملمع چڑھائے پھرتے ہیں

طیبہ امل

دفتر میں داخل ہوتے ہی شکیل احمد کا سامنا چیئرمین صاحب سے ہوگیا۔ انھیں دیکھتے ہی شکیل احمد نے گھڑی پر نظر دوڑائی تو شکر بجالایا کہ آج وہ خلاف معمول بروقت دفتر پہنچ گیا۔ چیئرمین سے سلام دعا کے بعد اپنے کمرے کی راہ لی اور سیکرٹری ناصر علی کو طلب کیا۔ ناصر علی نے دن بھر کے تمام کاموں کی تفصیل گوش گزار کی۔ تفصیلات سننے کے بعد وہ کام میں جت گیا۔

شکیل احمد پچھلے پانچ برس سے نیب کے ادارے میں اعلیٰ عہدے پر اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس دوران ترقی کی منازل تیزی سے طے کرتے ہوئے کثیر جائداد اور بینک بیلنس کا مالک بن گیا۔ اس نے صحیح و غلط کی تمیز کیے بغیر سب کچھ حاصل کیا تھا۔ کچھ دیر بعد سیکرٹری ناصر علی نے آکر بتایا کہ عادل باجوہ کافی دیر سے ملاقات کا منتظر ہے۔ شکیل احمد نے اُسے کمرے میں بھیجنے کا حکم دیا۔

کچھ دیر بعد عادل باجوہ کمرے میں داخل ہوا اور سلام دعا کے بعد نشست سنبھال لی۔ اس کی ایک فائل کافی عرصے سے زیرِغور تھی۔ آج وہ اسی سلسلے میں ملاقات کرنے آیا تھا۔ عادل باجوہ ضلعی ادارے میں اہم عہدے پر فائز تھا۔ کچھ عرصہ قبل ٹاؤن ہال کی سرکاری امداد میں ہیرپھیر کر بیٹھا۔ مگر یہ کیس ابھی منظرِعام پر نہیں آیا تھا۔ عادل باجوہ کے بہترین دوست شکیل احمد کے چچازاد بھائی نکلے، تو اُسے اپنی کیس فائل ٹھکانے لگانے کی راہ سجھائی دی۔ اس سلسلے میں دونوں حضرات کی پہلے بھی ملاقات ہو چکی تھی مگر معاملہ کچھ جم نہیں پایا۔ شاید عادل باجوہ شکیل احمد کے

مطالبے پر پورا نہیں اتر رہا تھا۔

عادل باجوہ نے ہی بات کا آغاز کیا "آپ جانتے ہیں کہ مہنگائی کتنی بڑھ چکی۔ ایسے میں تھوڑا بہت ہیر پھیر تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ آخر کو بیگم اور بچوں کی خواہشات بھی پوری کرنا ہیں۔ آپ ذرا خیال کیجیے اور اس معاملے کو یہیں دبا دیجیے۔ بس آپ کا تعاون درکار ہے۔"

شکیل احمد بولا "آپ کی بات درست ہے۔ مگر آپ ہاتھ پکڑ کر نہیں دے رہے۔ ہمارے درمیان پانچ کی بات ہوئی تھی اور آپ اب تین پر بھی نہیں مان رہے، آخر آپ کو لاکھوں روپے کا منافع ہوا ہے سڑک اور ٹاؤن ہال کی تعمیر میں! اگر میں مدد سے انکار کردوں، تو آپ کے ہاتھ کچھ نہیں رہے گا" اس کا لہجہ دھمکی آمیز ہوگیا۔ وہ اس بحث سے تنگ آچکا تھا۔

عادل باجوہ کچھ دیر سوچ بچار میں ڈوبا رہا اور معاملے کی نزاکت سمجھ گیا۔ زیادہ تو تکرار میں اس کا اپنا ہی نقصان تھا۔ آخرکار دونوں کے درمیان چار لاکھ روپے پر معاملہ طے پا گیا۔ اب وہ اپنے کیس کے حوالے سے بے فکر ہوگیا اور اجازت لے کر رخصت ہوا۔ شکیل احمد نے خوشی خوشی بیگم کو فون تھمایا اور بولا "یورپ جانے کی تیاری کرلو۔"

کچھ دیر بعد سیکرٹری ناصر علی پھر کمرے میں حاضر ہوا اور شکیل احمد کو تین دن بعد ہونے والی تقریب کے متعلق بتانے لگا۔ یہ وسیع پیمانے پر گورنر ہاؤس میں منعقد ہونی تھی۔ تقریب کے مہمان خصوصی گورنر ہی تھے۔ سیکرٹری نے بتایا کہ تقریب میں شکیل احمد کو بھی تقریر کرنی ہے جو وہ تیار کروا چکا۔ اب شکیل احمد کو کچھ دیر تقریر کی مشق کرنا تھی۔ شکیل احمد نے متن پر نظر دوڑائی اور زیرلب اسے دہرانے لگا۔

مقررہ دن تقریب کا آغاز ہوا۔ تلاوت کلام پاک کے بعد میزبان نے سب سے پہلے شکیل احمد کو اسٹیج پر دعوت دی۔ وہ فخر سے سینہ تانے اسٹیج پر پہنچا اور حاضرین پر طائرانہ نظر دوڑائی۔ حاضرین میں نامی گرامی صحافی، شعرا، چیئرمین نیب، سرکاری افسر، سیاسی راہنما اور مختلف کالجوں کے طلبہ شامل تھے۔ گورنر سب سے پہلی قطار میں بیٹھے تھے۔ مختلف ٹی وی چینلوں کے نمائندے تقریب کی کارروائی فلم بندی میں مصروف دکھائی دیے۔ شکیل احمد نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے تقریر کا آغاز کیا:

"ہم سب یہاں ایک عظیم مقصد کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں اور وہ ہے کہ ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کرنا! مجھے یہ اعلان کرتے ہوئے بے حد خوشی ہے کہ یہ تقریب "اینٹی کرپشن ڈے" یعنی یوم انسداد بدعنوانی کے حوالے سے منعقد کی گئی۔ اس سال کی عالمی رپورٹ کے مطابق پاکستان ۱۷۵ ممالک میں بیسویں درجے ترقی پا کر ۱۲۶ویں نمبر پر آ گیا ہے۔ ہمیں مزید آگے بڑھنا ہے مگر کسی حد تک ہم اپنے معاشرے میں کرپشن جیسی لعنت پر قابو پانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔" تقریر کا اختتام کرکے وہ اسٹیج سے اتر گیا۔

تقریب مزید ایک گھنٹا جاری رہی۔ مختلف سرکاری و سیاسی نمائندوں نے اس سال ہونے والی رپورٹ کے متعلق اپنی آرا پیش کیں۔ اس کے بعد کھانے پینے کا دور چلا۔ اسی دوران شکیل احمد کی ملاقات عادل باجوہ سے ہوئی۔ وہ بھی اس تقریب میں شریک تھا۔ دونوں صاحبان حالات حاضرہ پر تبصرہ کرنے لگے۔ عادل باجوہ نے اس کی تقریر کو سراہا۔ دونوں پھر اس بات پر ہنسنے لگے کہ پاکستان کرپشن کے لحاظ سے ۱۲۶ویں نمبر پر آچکا۔ شکیل احمد بولا "اگر آپ اور ہم جیسے حضرات یوں ہی تعاون کرتے رہیں، تو شاید اگلے سال ملک پھر بیسویں درجے پیچھے چلا جائے۔"

باجوہ کہنے لگا "ارے صاحب، یہ تو نئی حکومت کے آنے سے ذرا سختی بڑھی، تو ہم کچھ درجے بڑھ گئے۔ دراصل نئی حکومت کو آغاز میں اپنی کارکردگی بہتر دکھانی تھی، ورنہ سب جانتے ہیں، پچھلے پانچ برس سے ملک میں لوٹ مار کا کتنا بازار گرم تھا۔ ہر کوئی اپنے "کرتوتوں" سے آگاہ ہے، بس چہرے پر فرض شناسی اور ایمانداری کا نقاب اوڑھے پھرتا ہے۔"

شکیل احمد نے جواب دیا "یہ ندرت صرف ہمارے ملک ہی میں ملے گی کہ زمانے بھر کے کرپٹ ترین افراد مل کر "اینٹی کرپشن ڈے" منارہے ہیں۔"

دونوں کا قہقہہ فضا میں گونج اٹھا۔

◆◆◆

تجربات زندگی

جب انجانے میں ہوئی

چھوٹی سی خطا

راہ حق سے بھٹک جانے والی دوشیزہ کا دردناک ماجرا، اُسے اپنی غلطی کا بھاری خمیازہ بھگتنا پڑا

سجادہ در

میرا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ خیالوں میں کبھی امی کی گود میں سر رکھے مسکراتا، کبھی ابو کی بانہوں میں جھولتا اور کبھی بہن بھائیوں کے ساتھ آنکھ مچولی میں مصروف ہوتا۔ میں تقریباً چھے ماہ بعد عید کی چھٹیوں پر گھر جا رہا تھا اور تحفوں سے خوب لدا پھندا تھا۔ بہن نے فرمائش کرکے اپنے لیے پرس منگوایا تھا، ابو کے لیے تہبند، بڑے بھائی کے لیے گھڑی چھوٹے کے لیے اسکول بیگ اور امی کی جوتی۔ غرض گھر کے ہر فرد کے لیے کوئی نہ کوئی چیز ضرور خریدی۔ ملازمت ملنے کے بعد یہ میری پہلی عید تھی، اس لیے اپنی تنخواہ سے سب کے لیے تحفے خریدے۔ تحائف پا کر میں گھر والوں کے چہروں پر بکھری خوشیوں کے جلوؤں سے تصور میں محظوظ ہو رہا تھا۔

صبح چار بجے گاڑی نے مجھے میرے شہر اتار دیا جہاں میرا چھوٹا بھائی مجھے لینے پہلے سے موجود تھا۔ گھر میں داخل ہوا، تو حسب معمول سب جاگ رہے تھے، مگر جس پرتپاک استقبال کی میں توقع کر رہا تھا، ویسا کچھ نہ ہوا۔ مجھے عجیب سا محسوس ہوا پھر خیال آیا کہ صبح صبح نیند سے اٹھے ہیں، شاید اس لیے تر و تازہ نہیں لگ رہے۔

پہلے جب میں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور مہینوں بعد گھر آتا، تو کنبے کے سارے افراد دروازے کے باہر جمع ہوتے۔ بہن چھوٹتے ہی میرے بیگ کی تلاشی میں جت جاتی کہ اس کا کیا تحفہ آیا ہے۔ چھوٹا بھائی اس سفری شاپر پر جھپٹتا جس میں کھانے پینے کی چیزیں یا جوس ہوتے۔ امی میرے لیے کھانے کی کوئی چیز فوراً حاضر کرتی کہ لو بیٹا کھا لو! ابو فوراً سفر کے بارے میں پوچھنے لگتے کہ راستے میں کسی قسم کا کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا۔ مگر آج سب کچھ معمول سے ہٹ کر اور بدلا بدلا سا محسوس ہو رہا تھا۔

ہوا میں گھٹن اور ماحول میں پُراسراریت سی تھی۔ میں نے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ چارپائی کے بستر پر رکھے تکیے پر سر رکھا اور سونے میں عافیت جانی۔ سویرے نو بجے میری آنکھ کھلی، تو ہر کوئی معمول کے کاموں میں جتا ہوا تھا۔ مگر اب بھی ان سب کے چہروں پر بشاشت نظر نہیں آئی۔ امی نے مجھے

پیدا ہو دیکھا، تو فوراً میرے پاس چلی آئیں۔ حال چال پوچھا اور کہنے لگیں، منہ ہاتھ دھو لو میں ناشتا لگا دیتی ہوں۔

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی میں نے امی سے پوچھ کہ خیریت تو ہے، آج گھر میں پہلے جیسی رونق نہیں! سب چپ چپ ہیں اور دیگر رشتے دار بھی ملنے نہیں آئے، اس کی کیا وجہ ہے؟ پہلے تو امی ٹال مٹول کرنے لگی مگر مجھے بضد دیکھ کر بتایا کہ سرور کی بڑی بیٹی کچھ دن پہلے کسی آوارہ لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اسے بہ مشکل واپس لائے۔ اسی لیے سب پریشان ہیں۔ پورے علاقے میں بدنامی ہوئی ہے کہ ملکوں کی لڑکی نے یہ کیا گل کھلایا۔

میں ایک دم سکتے میں آ گیا، مجھے مہوش سے ایسی توقع نہ تھی۔ وہ کالج کی طالبہ اور کافی سمجھدار لڑکی تھی۔ مگر یہ سب کیسے ہوا، کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ بات واقعی پریشان کن تھی۔ امی نے بات جاری رکھی، کالج سے وہ لڑکا اسے شہر لے گیا تاکہ عدالت میں نکاح پڑھوا سکے۔ مگر جس وکیل کے پاس لڑکے والے گئے، وہ تمھارے ابو کا دوست تھا۔ اس نے لڑکے اور اس کے والدین کو ڈرا دھمکا کر بھگا دیا۔ لڑکی تمھارے باپ کو بلا کر واپس کر دی اور کہا کہ مہربانی کر کے پولیس کیس نہ کرائیے گا، آپ کی لڑکی اپنی مرضی سے آئی تھی۔ یوں مہوش کی کم عقلی نے پورے خاندان کی عزت مٹی میں ملا دی۔ یہ خبر پورے گاؤں میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ اب ہمارے خاندان کے لوگ منہ چھپائے پھرتے ہیں۔

مہوش میری پھوپھی کی بیٹی تھی۔ کافی خوب صورت اور شوخ طبیعت ہونے کی وجہ سے سب کی آنکھ کا تارا تھی۔ ماموں بڑھ چڑھ کر اسے پیار کرتے اور اپنے بیٹے کے لیے اس کے رشتے کے متمنی تھے۔ مگر اس واقعے کے بعد انھوں نے کورا جواب دے دیا۔ اب خاندان کا کوئی لڑکا مہوش سے شادی کرنا، تو دور اس سے بات کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھا۔ گھر والے اس سے انتہا کی نفرت کرنے لگے اور روز کسی نہ کسی بہانے پٹائی بھی کرتے۔

مہوش کا بڑا بھائی اصغر اس کی جان کے درپے تھا۔ وہ اپنے چچازاد بھائیوں کے ساتھ طے کر چکا تھا کہ اسے گولی مار دینی چاہیے، تب ہی ہماری کھوئی عزت واپس آ سکتی ہے۔ علاقے والوں کو پتا چلے گا کہ ملک کتنے غیرت مند ہیں، ان کی لڑکی نے غلط قدم اٹھایا، تو اسے جان سے مار ڈالا۔ یوں خاندان کی باقی لڑکیاں بھی ہوش کے ناخن لیں گی اور اس قسم کا قدم اٹھانے سے پہلے ہزار بار سوچیں گی۔ مگر دادا ابو نے جو خاندان کے سربراہ ہیں، انھیں قتل سے روک دیا کہ یہ شرعاً جائز ہے اور نہ اخلاقاً۔ تاہم مہوش کے رشتے کا مسئلہ ایسا تھا جیسے کے ٹو پہاڑ کی چوٹی سر کرنا مشکل ہو۔

خاندان والے مہوش کو ایک پل کے لیے بھی گھر میں برداشت نہ کر پا رہے تھے۔ ان کے بس میں نہیں تھا کہ وہ اسے اٹھا کر گھر سے باہر پھینک آتے جیسے وہ کوئی کوڑے کا ڈھیر ہو۔

عید کی آمد آمد تھی مگر کسی کو نئے کپڑے پہننے اور خوشی منانے کا خیال تک نہ تھا۔ گھر کے سارے افراد ایسے چل پھر رہے تھے جیسے لاشیں پھر رہی ہوں۔ جیسے تیسے عید گزر گئی مگر خاندان پر چھائے افسردگی کے بادل نہ چھٹ سکے۔ میں اس ماحول سے کافی اکتا چکا تھا۔ صورت حال واقعی تشویش ناک تھی۔ میری نظر میں مہوش کو اس قدر سخت سزا نہیں ملنی چاہیے تھی۔ جس قسم کا رویہ مہوش کے ساتھ گھر والوں نے اپنا رکھا تھا، اس سے دو نتائج نکل سکتے تھے: وہ خودکشی کر لیتی اور یا پھر دوبارہ پہلے جیسا قدم اٹھاتی۔

میں نے گھر والوں کو سمجھانے کی پوری کوشش کی کہ انجانے میں اس سے غلطی ہو گئی، وہ شرمندہ ہے، آپ لوگ اسے معاف کر دیں۔ اس کی شادی ہوئی، تو اپنے گھر آباد رہے گی مگر ان باتوں کا خاندان والوں پر الٹا اثر ہوتا۔ وہ مجھے بھی لعن طعن کرنے لگتے اور کہتے ”جو زیادہ پڑھ لکھ جائے وہ پاگل ہونے کے ساتھ ساتھ بے غیرت بھی ہو جاتا ہے۔“ ایسی ایسی باتیں سناتے کہ میں خاموش ہونے ہی میں عافیت سمجھتا۔

عید کے چوتھے روز میں مہوش کے گھر گیا، تو وہاں شور برپا تھا۔ پتا چلا کہ اس کا بڑا بھائی اصغر آپے سے باہر ہو چکا اور وہ

مہوش کو جان سے مار دینا چاہتا ہے۔ میں کافی دیر تک ان سب کے درمیان صلح کراتا رہا مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ میں اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتا، تو وہ پہلے سے زیادہ آگ بگولا ہوتا اور مہوش کو مارنے دوڑتا۔ مجھے اس لڑائی کا کوئی انجام نظر نہیں آ رہا تھا۔ گھر کے سارے افراد جمع تھے۔ دادا جان بھی موقع پر آ گئے۔ وہ اصغر کو مارنے سے سختی سے روکتے رہے، مگر یہ حقیقت بھی جانتے تھے کہ اب مہوش اس خاندان کا حصہ بن کر زندگی نہیں گزار سکے گی۔

گھر میں اس قدر شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ میں باری باری ہر مرد و عورت کی طرف دیکھتا مگر کسی طرف سے مجھے کوئی امید کی صورت نظر نہیں آئی۔ مہوش مظلوم صورت لیے زمین پر ڈھیر پڑی تھی، جیسے اس انتظار میں ہو کہ اب کس کی باری ہے میری پٹائی کرنے کی!

میں نے بڑی مشکل سے سب کو خاموش کرایا۔ سارے میرا منہ دیکھنے لگے۔ میں نے جیب سے فون نکالا اور امام مسجد کو کال ملا دی۔ وہ ہماری بستی کے نکاح خواں بھی ہیں۔ میں نے انھیں فوراً سرور بھائی کے گھر آنے کو کہا اور کال کاٹ دی۔ سب حیران ہو گئے کہ نکاح خواں کو کیوں بلایا۔ دادا نے استفسار کیا، تو میں نے کہا ’’مہوش کا نکاح پڑھوانے کے واسطے بلایا ہے۔‘‘

دادا نے پوچھا ’’کس سے؟‘‘

میں نے کہا ’’مجھ سے اور کس سے؟‘‘

یہ سن کر سبھی پر سکتہ طاری ہو گیا، لگتا تھا کسی شخص میں بھی جان نہ رہی۔ پہلی مرتبہ مہوش نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا جیسے اسے میرے لفظوں پر یقین نہ آیا ہو۔

ابھی سب لوگ محو حیرت تھے کہ امام صاحب آ گئے۔ میں نے مہوش کو چارپائی پر بیٹھنے کو کہا۔ اس نے آنسو پونچھے اور کپڑے جھاڑتے ہوئے چارپائی پر بیٹھ گئی۔ امام صاحب کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، کچھ ماحول کی دہشت نے انھیں حواس باختہ کر دیا تھا۔ میں نے امام صاحب سے اپنا اور مہوش کا نکاح پڑھانے کو کہا، تو وہ دادا کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے غصے سے کہا ’’نکاح پڑھائیں دادا ابو کی طرف کیا دیکھتے ہیں؟‘‘

دادا جان گومگو کی حالت میں تھے کہ کیا کریں۔ خیر انھوں نے سر ہلا کر امام صاحب کو اجازت دے دی۔ نکاح شروع ہوا۔ وہاں کھڑے سب مرد و زن پر سکتہ سا طاری تھا۔ اس دوران کسی نے میرے گھر اطلاع کر دی۔ امی، ابو اور بہن بھائی پورا کنبہ ایسے بھاگتا آیا کہ کچھ کو جوتے پہننا بھی یاد نہیں رہے۔ مگر ان کے آنے سے پہلے نکاح ہو چکا تھا۔ دادا ابو نے بے جان ہاتھوں سے ایک لڑکے کو پیسے دیے کہ جا کر مٹھائی لے آئے۔ امی ابو سخت طیش میں تھے مگر دادا ابو کو دیکھتے ہی چپ ہو گئے۔ امی میرے پاس آئیں اور بازو سے پکڑ کر بولیں کہ یہ سب کیا ہے؟

میں نے کہا، نکاح کیا ہے، وہ بھی اپنے کزن کی بیٹی سے اور دادا ابو کے سامنے۔ اللہ معاف کرے گناہ تھوڑی کیا ہے؟‘‘

امی کہنے لگیں ’’نکاح ایسے ہوتا ہے، نہ کوئی خوشی نہ ڈھول باجے نہ کچھ اور پھر اس لڑکی سے نکاح کرنے کی اجازت کس نے دی تمھیں؟

میں نے سر جھکا لیا اور کہا ’’مہوش کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں گئی، اس لیے یہ قدم اٹھایا۔ اگر میں نکاح نہ کرتا، تو یہ لوگ اسے جان سے مار ڈالتے۔‘‘ اس سے پہلے کہ بحث طویل ہوتی، دادا ابو نے امی کو خاموش کرا دیا۔ پھر وہ مجھے اور مہوش کی امی کو گھر سے نئی چادر لانے کا کہا۔ دادا نے چادر لے کر مہوش کو سر پر اوڑھائی اور اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے دلھن کو پاؤں کی طرف اشارہ کیا جس میں جوتی نہ تھی۔ مہوش کی ماں نے ایک طرف پڑی اس کی جوتی لا دی۔ میں ہجوم کو اسی طرح مبہوت کھڑا چھوڑ دلھن لیے گھر آ گیا۔

☆☆☆

گھر والوں نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دی۔ وہ چاہتے تھے کہ میرے لیے کوئی اچھی تعلیم یافتہ میم شہر سے لائیں۔ دوسرے مہوش کو وہ کسی طور بہو تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے۔ ساری

رات امی اور ابو مجھے جلی کٹی سناتے رہے کہ تمھیں کیا مصیبت پڑی تھی اس کو گھر لانے کی؟ وہیں پڑی رہتی۔ تم نے ہماری ناک کٹوا دی۔ تمھاری شادی کرنے کے کتنے ارمان تھے جو خاک میں مل گئے۔ میں چپ چاپ ان کی باتیں سنتا رہا۔ دوسرے دن میں نے گاڑی پر نشستیں بک کرائیں، ضروری سامان ساتھ لیا اور مہوش کے ساتھ لاہور آ گیا۔ کرائے پر گھر لیا اور ہنسی خوشی زندگی کی گاڑی چلنے لگی۔

میں نے مہوش پر کوئی پابندیاں نہیں لگائیں بلکہ آتے ہی اُسے کہا کہ جو جی میں آئے کرو، جو جی چاہے کھاؤ، پیو مجھے تم پر پورا اعتماد ہے۔ الحمدللہ مہوش میری زندگی میں خوشیاں ہی لائی۔ صبح اٹھتا تو ناشتا تیار ہوتا، کپڑے استری، جوتا پالش اور میرا بیگ لیے مجھے دروازے تک چھوڑنے آتی۔ شام کو واپس گھر آتا، تو میرے انتظار میں ہوتی۔ مجھے مہوش نے کبھی کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ نہ گھر داری کے حوالے سے اور نہ ذات اور عزت کے حوالے سے۔ ہر وقت میری راہ دیکھتی اور میری خدمت کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی۔

وقتاً فوقتاً ہم گاؤں جاتے۔ مگر وہاں ہماری کسی قسم کی کوئی عزت نہ رہی تھی۔ اب مہوش کے ساتھ ساتھ میں بھی خاندان والوں کی نظر میں گر گیا۔ میرے امی ابو مجھے خاص توجہ نہ دیتے اور ناراضی کا ہی اظہار کرتے۔ ہمیشہ طعنہ دیتے کہ ہم تمھاری کسی اچھی جگہ شادی کرتے مگر تم نے ہماری عزت خاک میں ملا دی۔ مہوش کا بھائی اصغر آج بھی اس سے اتنی ہی نفرت کرتا تھا۔ وہ اکثر کہتا کہ جس دن مہوش میرے سامنے آئی میں اسے گولی مار دوں گا۔ اکثر میرے کانوں سے ایسی باتیں گزرتیں، مگر میں سنی ان سنی کر دیتا۔

وقت گزرتے پتا نہ چلا اور اللہ نے مجھے چاند جیسی بیٹی سے نوازا۔ مہوش کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ میں بھی مسرور تھا کہ اللہ نے اپنی رحمت سے نوازا۔ گھر فون کر کے بتایا، مگر وہاں سے کسی قسم کی گرم جوشی کا اظہار نہ کیا گیا۔ تاہم میں اپنی بیٹی کی خوشی میں ایسے

نہ ہوا۔ دو ماہ بعد بیٹی کو خاندان والوں سے ملوانے ہم گاؤں گئے۔ مگر گھر میں کسی نے بھی بچی کو اس طرح پیار نہ کیا جس طرح ایک نوزائیدہ بچے سے کیا جاتا ہے۔ مجھے اسی قسم کے ردعمل کی امید تھی لہٰذا میں بھی پریشان نہ ہوا۔ دو دن بعد مہوش اُسے لیے اپنے امی ابو کے گھر چلی گئی کیونکہ وہاں سے کوئی ہماری بیٹی کو دیکھنے ابھی تک نہیں آیا تھا۔

مہوش امی، ابو اور بہن بھائیوں سے ملی۔ سب ملے مگر کسی نے نہ زیادہ گرم جوشی دکھائی اور نہ سرد مہری کا اظہار کیا۔ اتنے میں کسی نے ڈیرے پر بیٹھے اصغر کو بتا دیا کہ مہوش اپنی بیٹی کو لیے گھر آئی ہوئی ہے۔ یہ سننا تھا کہ وہ آگ بگولا ہو گیا اور اپنا پستول ڈب میں چھپا گھر کو چلا۔ اندر داخل ہوا، تو بچوں اور دیگر اہل خانہ کا مہوش کے گرد ہجوم تھا۔ مہوش برآمدے میں بیٹھی بیٹی کو دودھ پلا رہی تھی۔ کوئی بھی اصغر کے چہرے سے اس کی شیطانیت نہ بھانپ سکا اور نہ ہی اس نے کسی کو سنبھلنے یا جاننے کا موقع دیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پستول نکال دس قدم کی دوری سے مہوش پہ تین فائر کیے۔ ایک گولی خطا گئی، دوسری مہوش کی گردن میں لگی اور تیسری دودھ پیتی بچی کا جبڑا چیرتی سینے میں پیوست ہوئی۔ دونوں ماں بیٹی نے موقع پر جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔

ہر طرف چیخ پکار شروع ہو گئی۔ لوگ بھی بھاگ کر سرور کے گھر آنے لگے۔ میں اپنے گھر سکون سے لیٹا تھا اور امی کام میں مصروف تھیں کہ مہوش کے چھوٹے بھائی نے دھڑام سے دروازہ کھولا اور چیخ کر بولا "وہ۔۔۔۔۔۔وہ۔۔۔گولی۔۔۔۔اصغر بھائی نے گولی۔۔۔۔!" اس کا سانس اتنا پھولا ہوا تھا کہ وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ میرے لاشعور میں ایک دم جھماکا ہوا کہ کہیں مہوش کو تو گولی نہیں مار دی۔ میں اٹھا اور سرور بھائی کے گھر کی طرف بھاگ اٹھا۔ میرے پیچھے امی اور دیگر بہن بھائی بھی ہو لیے۔ وہاں پہنچا، تو مہوش اور میری بیٹی کی لاشیں صحن میں چارپائی پر پڑی تھیں اور ارد گرد سارا خاندان جمع ہو چکا تھا۔ میری امی نے اپنی پوتی اور بہو

کی نعش دیکھی، تو وہ بھی پھٹ پڑیں اور زار و قطار رونے لگیں۔

گھر کے سارے افراد افسردہ اور ماتمی چہرے لیے وہاں موجود تھے۔ سبھی کو مہوش کی موت کا افسوس تھا۔ ہر چہرے پر آنسوؤں کی لڑیاں تھیں اور سب کے گلے رندھ چکے تھے۔ میری امی اور ساس بھی اپنی پوتی کی لاش دیکھتیں، تو کبھی مہوش کے سرہانے جا کھڑی ہوتیں اور پھر ایک دوسرے کو گلے لگا کر رونے لگتیں۔ میں چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو رواں تھے۔ جانے میں وہاں کتنی دیر کھڑا رہا اور کون کون میرے گلے لگ کے رویا، مجھے قطعاً یاد نہیں۔ پھر میں مسجد کی طرف چل دیا۔

مسجد میں اسپیکر پر اعلان کرایا گیا کہ سرور صاحب کی بیٹی وفات پا گئی ہے جس کا جنازہ شام کو اٹھایا جائے گا۔ میں واپس میت والے گھر پہنچا، تو وہاں پولیس آ چکی تھی۔ وہ لاش کا پوسٹ مارٹم کرنا چاہتی تھی۔ دادا ابو نے میری طرف دیکھا، تو میں نے گزارش کی کہ میں اپنی بیوی اور بیٹی کو مزید تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ دادا ابو نے اپنے اثر و رسوخ سے پولیس کیس نہ بننے دیا۔ لہٰذا لاش کا پوسٹ مارٹم بھی نہیں ہوا۔ پولیس سے کہا گیا کہ یہ ہمارے گھر کا مسئلہ ہے، خود نمٹا لیں گے۔ شام تک دونوں مٹی قبر میں اتاری جا چکی تھیں۔

دفنانے کے بعد میں گھر آیا، تو امی رو رہی تھیں۔ میں نے انھیں کہا "امی جی! جب وہ زندہ تھی، تو اس کے لیے آپ کے پاس بولنے کو چند میٹھے بول نہیں تھے۔ آج وہ مر گئی، تو گھر میں کھانا تک نہیں بنا۔"

امی خاموش رہیں مگر آنسو گال پر بہتے رہے۔ میں نے اپنا سامان بیگ میں ڈالا اور گھر سے نکل آیا۔ گھر والوں نے روکنے کی بہت کوشش کی کہ قل خوانی تک رک جاؤ مگر میں نے انکار کر دیا۔ انھیں بتایا قل تو اسی دن ہو گئے تھے جب میں اسے بیاہ کر یہاں سے لے گیا تھا۔

☆☆

پٹھوں کی کمزوری اور سردرد

پریشانی اور ذہنی دباؤ میں مبتلا اکثر لوگ سردرد کا شکار ہو جاتے ہیں جو بعض اوقات ہائی بلڈ پریشر اور برین ہیمرج کا باعث بن جاتا ہے۔ اس حوالے سے کی گئی ایک جدید تحقیق میں کہا گیا ہے کہ پریشانی میں اٹھنے والا سردرد دراصل کندھوں اور گردن کے پٹھوں میں کمزوری کے باعث جنم لیتا ہے۔ ڈنمارک میں کی جانے والی اس تحقیق میں کہا گیا کہ جو لوگ پریشانی کے باعث اکثر سردرد کا شکار ہوتے ہیں، ان میں سے ۲۶ فی صد افراد گردن اور پٹھوں کی کمزوری کی وجہ سے سردرد کی شکایت کرتے ہیں۔ اس تحقیق کے بانی کا کہنا ہے کہ ضرورت ہے، اس پر مزید تحقیق کی جائے کہ سردرد کا پٹھوں اور ہڈیوں کے اثرات سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ تاہم پٹھوں کو مضبوط کرنے والی تربیت لینے پر سردرد سے نجات پائی جا سکتی ہے۔

گاڑی لاہور کی جانب رواں دواں تھی اور میں خالی نظروں سے کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ اچانک ایک میدان میں مجھے مہوش بیٹی کے ساتھ کھیلتی مسکراتی نظر آئی۔ وہ مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو:

"میں یہاں بہت خوش ہوں۔ یہاں مجھے کوئی طعنے نہیں دیتا اور نہ ہی کسی کی نظریں مجھے نشتر بن کر چبھتی ہیں۔ یہاں غلطی ہونے پر درگزر کیا جاتا ہے۔ اللہ بڑی مہربان ہستی ہے، وہ بڑے بڑے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ بس یہ دنیا والوں ہی کے اصول ہیں کہ وہ لوگوں کی چھوٹی سی خطا زندگی بھر معاف نہیں کر پاتے۔ جبکہ اللہ توبہ کرنے والوں کو بے حد پسند کرتا ہے اور اسے معاف کرنا بھی پسند ہے۔ آپ بھی میرے پاس آ جائیں، یہاں دونوں اپنی بیٹی کے ساتھ ہنسی خوشی رہیں گے۔"

◆◆◆

ندامت

ایک مثالی جوڑے کی انا نے انھیں نفسیاتی کشمکش میں مبتلا کردیا.....نامور افسانہ نگار کی طرح دار تخلیق

رضیہ بٹ

امّاں یونیورسٹی میں داخلہ لینے پر راضی نہیں تھی۔ لیکن ثمن نے امتیازی نمبروں سے بی۔اے کیا تھا۔ پڑھنے کی شوقین تھی۔ ابا بھی شوق کی تکمیل پر راضی تھے۔ ایسی ہونہار بچی کو گھر بٹھا لینا اس کے ذہن کو زنگ آلود کرنے کے مترادف تھا۔ ابا نے بخوشی اجازت دے دی تو اماں بگڑنے لگیں۔

"کیا ضرورت ہے آگے پڑھانے کی؟ بی۔اے تک تعلیم کافی ہے۔"

"بھلی لوگ، اسے پڑھنے کا شوق ہے۔ پڑھنے دو۔"

"ایم اے کرکے کیا کرلے گی؟ نوکری کرواؤ گے؟"

"ایم اے کے بعد وہ مقابلے کے امتحان میں بیٹھنا چاہتی ہے۔"

"واہ وا، اتنے لمبے چوڑے پروگرام ہیں۔"

"ہرج کیا ہے۔ سی ایس پی یا پی سی ایس کرلیا تو جانتی ہو کتنی بڑی افسر بن سکتی ہے۔"

"اسے افسری کرنی ہے؟"

"میرے خیال میں بُری بات تو نہیں۔"

"اور شادی؟ کیا اسے لونڈا بنائے پھرو گے؟ مجھے تو سمجھ نہیں آتی تمھاری عقل پر پردے کیوں پڑے ہیں۔ شادی کی فکر کرنے کے بجائے اسے مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھنے کی شہ دیے

جا رہے ہو۔"

"شادی جب ہونا ہوگی ہو جائے گی۔"

"اس نے بی اے کر لیا، اتنا ہی کافی ہے۔ اب سال چھے ماہ گھر گرہستی سنبھالے، کھانا پکانا، سینا پرونا سیکھے تو ہاتھ پیلے کر دیں۔ شادی کے بعد یہی گن کام آتے ہیں۔ کوئی نہیں دیکھتا ڈگریاں وگریاں"

ابا اماں کی باتوں پر مسکرا دیے۔ بولے "اب تو اس نے فارم بھر دیے ہیں۔ داخلہ لے رہی ہے۔ چلو مقابلے کا امتحان نہ سہی ایم اے تو کر لینے دو۔"

"باپ بیٹی کی صلاح جب ایک ہو جائے، تو میری سنتے ہی کب ہو۔"

"بھئی رشتہ دشتہ تو ابھی تک کوئی کام کا آیا نہیں جو اس کی شادی کے لیے سنجیدہ ہو جائیں۔ پھر گھر بیٹھنے سے اچھا نہیں کہ پڑھتی رہے۔ اس کا شوق بھی پورا ہوگا اور دھیان بھی لگا رہے گا۔ باقی رہا گھر کا کام کاج، تو وہ بھی سیکھ لے گی۔ ویسے اتنی نا سمجھ بھی نہیں اپنی ثمن۔ چھٹی کے دن کام کرتی ہے گھر کا۔ ابھی پچھلے جمعہ ہی اس نے کھانا بنایا تھا۔ خود ہی تعریفیں کر رہی تھیں تم بھی۔"

اماں خاموش ہو گئیں۔

☆☆☆

ثمن نے ایم اے میں داخلہ لے لیا۔ پڑھائی کا اسے جنون کی حد تک شوق تھا۔ ابا بھی بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے حق میں تھے۔ صاحب حیثیت تھے۔ اس لیے فراخ دلی سے بچوں کی پڑھائی پر خرچ کرتے۔ ثمن سے بڑے تینوں بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی تھی۔ فرحان نے انجینئرنگ کر کے ایم ڈی امریکا جا کر کی تھی۔ سلطان ڈاکٹر بنا اور ان دنوں انگلستان میں ایف آر سی ایس کر رہا تھا۔ نعمان امریکا ایم بی اے کرنے گیا ہوا تھا۔ بیٹے وہاں ساتھ ساتھ کام بھی کرتے۔ پھر بھی ابا انھیں ہر ماہ معقول رقم بھجوا کر تاکید کیا کرتے تھے کہ پیسوں کی وجہ سے تعلیم کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہیں ہونی چاہیے۔

ثمن ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہی ان کے پاس رہتی۔ فرحان امریکا ہی میں ملازمت کر رہا تھا۔ اپنی خالہ زاد ثمرینہ سے فون پر نکاح کر کے اسے وہاں بلا چکا یوں اس کا گھر آباد ہو گیا تھا۔ لیکن فرمانبردار بیٹے کی طرح ماں باپ کی مالی امداد کرنا نہیں بھولا تھا۔

ثمن کے بیاہنے کی ابا کو قطعاً فکر نہ تھی۔ اتنا کچھ تھا کہ بیٹی کی شادی دھوم دھام سے کر سکتے تھے۔ پھر فرحان نے بھی شادی کے لیے خاصی معقول رقم بھیجنے کا ارادہ کیا ہوا تھا۔ دینے دلانے کی کوئی فکر نہ تھی۔ ہاں ثمن کے لیے اچھے رشتے کی تمنا اور توقع ضرور تھی۔

خاندان میں دو ایک رشتے تھے لیکن ابا کو پسند نہ آئے۔ ماں باپ کی جائداد پر عیش کرنے والے لڑکے چاہے تعلیم یافتہ ہوں، انھیں پسند نہ تھے۔ وراثت میں ملا ہوا پیسا اور جائداد بے شک آئندہ زندگی کی خوشحالی میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ لیکن ایسے پس منظر والے لڑکے ذاتی طور پر بھی کچھ کرنے کی اہلیت ضرور رکھتے ہوں۔ چناں چہ انھیں پسند اور معیار کے مطابق رشتہ نہیں ملا۔

مگر اماں فکر مند تھیں اور ثمن کے ایم اے میں داخلہ لینے کے خلاف تھیں۔ وہ جانتی تھیں، جتنا زیادہ لڑکی پڑھ لکھ جائے اس کی برابری کا رشتہ تلاش کرنا اتنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ لڑکی اپنے سے کم پڑھے لکھے لڑکے سے شادی کرنا پسند نہیں کرتی۔ لڑکے بھی یہی چاہتے ہیں کہ ان کی بیوی تعلیم یافتہ تو ضرور ہو، لیکن ان سے زیادہ پڑھی لکھی ہرگز نہ ہو۔ اماں کے تجربے اور مشاہدے میں یہ باتیں آ چکی تھیں۔

وہ تو لڑکے لڑکی کی برابر تعلیم کے حق میں بھی نہ تھیں۔ ظاہر ہے پڑھی لکھی لڑکی باشعور ہو کر اچھے برے کی تمیز کر سکتی ہے۔ اچھائی برائی میں فرق جان جاتی ہے۔ دن کو دن اور رات کو رات ہی کہتی ہے۔ اپنے علم کا اظہار بھی کرتی ہے۔ اصول و قواعد جانتی ہے اور ان باتوں کا کھلم کھلا مظاہرہ بھی کرتی ہے۔ یہ مظاہرے کئی بار شوہروں کو گراں گزرتے ہیں۔ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو

جاتے ہیں۔ اپنی برتری کا احساس دلانے کے لیے وہ اکثر ناجائز حد بندیوں اور دباؤ سے بیویوں کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں۔

ثمن نے ایم اے میں داخلہ تو لے لیا لیکن اماں کوشاں تھیں کہ کوئی اچھا سا رشتہ مل جائے، تو اس کے ہاتھ پیلے کر دیں۔ بھلے ایم اے کرے یا نہ کرے۔ انھوں نے کئی جگہ کہہ رکھا تھا۔ دو تین رشتے کرانے والی عورتیں بھی اسی کام پر لگا رکھی تھیں جو کبھی کبھی رشتے بھی لے آتیں۔ یہ رشتے کبھی اماں کے من کو نہ بھاتے اور کبھی آنے والوں کی نظر نہ ٹھہرتی۔

"اماں۔" ثمن نے اس دن بھی ان عورتوں کے جانے کے بعد کہا جو اسے دیکھنے آئی تھیں۔

"ہوں؟" اماں نے جواب دیا۔

"آپ کچھ عرصہ صبر نہیں کر سکتیں؟"

"کیا مطلب؟"

"ہر ہفتے کہیں نہ کہیں سے عورتیں منہ اٹھائے چلی آتی ہیں۔"

"ہمارے یہاں رشتے ایسے ہی طے ہوتے ہیں۔"

"لیکن طے کرنے کی ابھی جلدی کیا ہے؟ مجھے ایم اے سے تو فارغ ہو لینے دیں۔ میں نے ابھی شادی وادی نہیں کرنی۔ ایم اے کے بعد میں مقابلے کے امتحان کی تیاری کروں گی۔"

"چل ہٹ۔ میرا بس چلے، تو تجھے ایم اے بھی نہ کرنے دوں۔ مقابلے وقابلے کا خیال نکال دے ذہن سے۔ ایم اے میں داخلہ، تو ضد کر کے لے لیا ہے۔ آگے میں تمھاری ایک نہ چلنے دوں گی۔"

"اماں آپ تعلیم کے خلاف کیوں ہیں؟"

"لڑکیوں کے لیے اتنی ہی تعلیم کافی ہے۔ بہت زیادہ پڑھ لکھ جائے گی، تو رشتہ ملنے میں دشواری ہو گی۔ تجھ سے زیادہ پڑھا لکھا ور تلاش کرنا پڑے گا۔"

ثمن ہنس کر بولی "اماں اس کی فکر نہ کرو۔ مجھے مقابلے کا امتحان پاس کر لینے دو، پھر جہاں جی چاہے شادی کر دینا۔ بے شک ایف اے پاس لڑکے ہی سے سہی۔"

"تاکہ ساری عمر جو تم بیزار ہوتی رہے۔"

"وہ کیوں۔"

"ذہنی ہم آہنگی کے بغیر زندگی چین سے نہیں گزر سکتی۔"

اماں پھر اسے اونچ نیچ سمجھانے اور اپنے مشاہدے اور تجربے کی باتیں بتانے لگیں۔ ثمن مسکراتے ہوئے ان کی باتیں سنتی رہی۔ وہ چپ ہوئیں، تو بولی "اماں، اب میں ایم اے کر لوں گی، تو میرے لیے آپ کو کم از کم ڈبل ایم اے لڑکا تلاش کرنا پڑے گا۔"

"تو اور کیا۔"

وہ شوخی سے آنکھیں گھماتے ہوئے بولی "ایک ایم اے والا نہیں چلے گا۔"

"دماغ مت چاٹ میرا۔"

"او میری اماں ....." ثمن نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے ہنس کر کہا "زمانہ بدل گیا ہے۔ اب ایسی تفریق کوئی نہیں کرتا۔ بلکہ لڑکے تو زیادہ پڑھی لکھی لڑکیاں چاہتے ہیں۔ مہنگائی بہت ہو گئی ہے نا اس لیے ایسی بیوی پسند کرتے ہیں جو پڑھی لکھی ہو تاکہ ملازمت کر سکے ایک کی جگہ دو کمانے والے اچھے۔"

"تو، تو بھی اس لیے پڑھ رہی ہے کہ شادی کے بعد نوکری کرے گی؟"

"ضرورت پڑی، تو کر بھی لوں گی۔"

"اور گھر بار کون سنبھالے گا؟"

"نوکر رکھ لوں گی۔"

"بچے ہو جائیں گے تو؟"

"سب ٹھیک ٹھاک چلتا ہے اماں۔ آج کل پڑھی لکھی لڑکیاں گھر کہاں ٹھہرتی ہیں؟ ضرورت مند ہوں، تو ملازمت کرتی

ہیں۔ ضرورت نہ بھی ہو تب بھی وقت گزاری کے لیے کر لیتی ہیں۔ ہرج کیا ہے؟"

"اچھا بس کر اب، دیکھا جائے گا۔ میں تو بیویوں کی ملازمت کے حق میں نہیں۔ چار پیسے کما تو لیتی ہیں لیکن گھر گرہستی ویران ہو جاتی ہے۔ بچے الگ متاثر ہوتے ہیں۔ ماں باپ دونوں کام پر ہیں اور بچے نوکروں پر چھوڑے ہوئے ہیں۔ وہ ماں کی ممتا بھری آغوش کو ترستے ہوئے احساس محرومی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کہیں اشد ضرورت پڑ جائے، مجبوری ہو جائے، تو عورت کو گھر سے نکلنا چاہیے ورنہ نہیں۔ گھر اور اس کی ذمے داریاں بہت بڑی اور اہم ہوتی ہیں۔"

"اچھا اماں" ثمن نے بات بدلی "یہ باتیں، تو چلتی رہیں گی۔ فرمان بھائی نے جو کپڑے بھیجے ہیں، اس میں سے جکا زردہ جوڑا مجھے سلوانے دیں گی۔"

ماں نے مسکرا کر ثمن کے گال پر ہولے سے تھپکا دیا اور کہا "یہ قیمتی کپڑے ہیں۔ تیرے جہیز کے لیے رکھوں گی۔ اور کوئی سوا لے جوڑا۔ صندوق کھولوں گی، تو دیکھ لینا۔"

"نہیں اماں، میں تو وہی سلواؤں گی۔"

ثمن پیار سے ضد کرنے لگی۔ خوش ذوق لڑکی تھی۔ اچھے ملبوسات تو اس کی کمزوری تھے۔ اماں کو ہاں کرتے ہی بنی۔

ثمن نے ایم اے کر لیا، تو سی ایس ایس کی تیاری کے لیے سنجیدہ ہو گئی۔ ابا سب سابق اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ اس کے ساتھ کتابوں وغیرہ کی دوڑ دھوپ میں لگ گئے۔ اماں کو اب باپ بیٹی پر غصہ آنے لگا۔ اکثر تلخ کلامی بھی ہو جاتی۔

اماں ابا سے کہتی "آپ کی تو مت ماری گئی ہے۔ سی ایس ایس کر لے گی، تو اس کے مقابلے کا رشتہ کہاں سے ڈھونڈو گے؟"

ابا مسکرا کر کہتے "لائق اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکوں کی کمی ضرور ہے لیکن قحط نہیں پڑ گیا۔ مل ہی جائے گا کوئی نہ کوئی۔ ثمن کو ہم ان شاء اللہ ڈھیروں جہیز بھی دیں گے۔ اور یہ ڈگریاں جہیز کے ساتھ اضافی ہوں گی۔ تم بھی اپنی خطوط پر سوچا کرو اور جو رشتے لانے والی عورتیں ہم نے لگا رکھی ہیں نا انھیں بھی یہ باتیں بتایا کرو۔"

اماں جھلا کر رہ جاتیں۔ ثمن نے صرف بی اے کیا ہوتا، تو اب تک وہ اس کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہو جاتیں۔ کتنے ہی رشتے اس معیار کے آچکے تھے۔

اماں کی کوششیں جاری رہیں۔ آخر وہ رنگ لے آئیں۔ ایک معزز گھرانے کا پڑھا لکھا رشتہ ثمن کے لیے آ ہی گیا۔ صاحب حیثیت ہونے کے ساتھ ساتھ سلمان اچھے عہدے پر فائز بھی تھا۔ ڈبل ایم اے تھا۔ اماں کو اس کی یہی خصوصیت بھائی۔ خاندان اچھا اور لڑکا شکل و صورت، قد کاٹھ کا بھی موزوں تھا۔ ثمن اور اس کی جوڑی خوب جچتی۔ لڑکے والوں کو بھی لڑکی ہر لحاظ سے پسند آئی۔ یہ رشتہ ابا کے بھی دل کو لگا۔ سلمان کے ابو اصغر صاحب تو انہی جیسا ذوق رکھتے تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں دونوں اس طرح گھل مل گئے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔

دونوں طرف سے پسندیدگی کا اظہار ہو گیا۔ منگنی ہو گئی۔ پھر شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ان تیاریوں میں ثمن مقابلے کے امتحان کی تیاری کو بھول بھال گئی۔ مصروفیت جو اتنی بڑھ گئی تھی۔ بازاروں کے چکر ہی ختم نہ ہوتے۔ کوئی ایک کام تھوڑا ہی تھا۔ اماں کا ہاتھ بھی، تو اسے ہی بٹانا تھا۔ اور پھر کپڑا لتا زیور وغیرہ اس نے اپنی پسند ہی کا تو بنوانا تھا۔ یہ سارے کام وہ خوشی خوشی کر رہی تھی۔

ہر جوان لڑکی کی طرح اس کے من میں بھی رنگا رنگ سپنے بسے تھے۔ پھلجھڑیاں سی ہمہ وقت من میں پھوٹتی رہتیں۔ دل دماغ اور ذہن پر جیون ساتھی قبضہ جمائے بیٹھا تھا۔ دنیا ہی بدل گئی تھی۔ روکھی پھیکی پڑھائی کا خیال بھولے سے بھی ذہن میں نہ آتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتی، تو اپنے خیالوں پر اپنی سوچوں پر ہنسی بھی آتی۔ کہاں گئے تھے اس کے اونچے اونچے افکار؟ وہ تو عام سی جوان لڑکی رہ گئی تھی۔

شادی خاصی شان سے ہوئی۔ سارے بھائی شادی میں شرکت کے لیے آئے۔ اماں اور ابا نے پہلے ہی جہیز میں کمی نہ چھوڑی تھی۔ جوان بھائیوں نے قیمتی تحائف بھی دے ڈالے۔ نقد رقم بھی بہن کے نام جمع کروا کے چیک بک اس کے پرس میں ڈال دی۔

ثمن بھی ہر لڑکی کی طرح وداع ہوتے وقت ماں باپ اور بھائیوں سے مل کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ سب نے اسے نمناک آنکھوں اور دلی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

وہ پھر سسرال پہنچی۔ روتی بھیگتی آنکھوں نے اسے بابل کے گھر سے وداع کیا تھا۔ یہاں ہنستے مسکراتے چہروں اور شوخ و شنگ قہقہوں نے اس کا استقبال کیا۔ ساس سسر اور دونوں نندیں تو صدقے واری ہو گئیں۔ لمبے چوڑے جہیز کے ساتھ اعلیٰ تعلیم یافتہ اسمارٹ سی لڑکی کا شایانِ شان استقبال ہوا۔ وہ من ہی من میں پھول پھول گئی۔ حجلۂ عروسی میں رنگ و بو کے سیلاب سے امنڈے ہوئے تھے۔ وہ پھولوں بھری سیج پر سرخ دہکتی ہوئی گٹھڑی سی بنی ہوئی تھی۔ پورا وجود ہمہ سماعت تھا۔

جب سلمان نے آ کر ہولے سے اپنی مخمور اور مدھر آواز میں اسے پکارا، تو اسے لگا جیسے اس آواز کا اسے مدتوں سے انتظار تھا۔ یہ آواز وہ ہمیشہ سے کانوں میں رس گھولتی محسوس کرتی آئی تھی۔ یہ آواز اس کی تلاش تھی، جستجو اور منزل تھی۔ اسے لگا، آج اپنی منزل پر پہنچ گئی۔

ثمن کو دیکھ کر سلمان بھی مسرور و شاداں تھا۔ ماں بہنوں سے اس کی تعریفیں سن سن کر اشتیاق بے قرار و بے اختیار ہو رہا تھا۔ اس نے جیسا سنا تھا اس سے بڑھ کر اسے پایا۔ دونوں نے شاداں و فرحاں شاہراہِ زندگی پر چلنے کے لیے ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

ثمن سسرال والوں کی بھی لاڈلی بہو بنی۔ دونوں نندیں، تو حد سے زیادہ پیار کرنے والی تھیں۔ دو ہفتے ثمن اور سلمان گھومتے پھرتے رہے۔ وہ ایک دوسرے کی مسحور کن قربتوں سے سرشار تھے۔ دو ہفتے ہنسی خوشی گزار کر دونوں واپس آ گئے۔

سلمان کی چھٹی ختم ہوئی وہ ایک بینک میں معقول ملازمت پر فائز تھا۔ یہ ملازمت اسے ایم اے کی ڈگریوں سے نہیں ملی بلکہ کچھ اس کی قسمت کا دخل تھا اور کچھ چھوٹے ماموں کے ایم این اے سسر کی سفارش کا۔ بینک میں نوکری کا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ تو سی ایس پی افسر بننے کے خواب دیکھتا چلا آیا تھا۔ لیکن دوبار کوشش کر چکا تھا، کامیاب نہیں ہوا جب بینک کی یہ نوکری ملی، تو اسے لگا یہ بھی خوش قسمتی ہے۔ غیر ملکی ڈگریاں رکھنے والوں کو بھی بلند عہدہ نہیں ملتا تھا۔

سلمان دفتر جانے لگا۔ چند دن تو ثمن کو اس سے چند گھنٹے جدا ہونا بھی شاق گزرا۔ وقت گزرنے کا نام ہی نہ لیتا۔ اسما اور زہرا بھی کالج جانے لگی تھیں۔ ثمن گھر میں اکیلے پڑے رہنے سے کچھ پریشان سی رہنے لگی۔ کبھی ساس کے پاس آ بیٹھتی۔ کبھی باورچی خانے چلی جاتی۔ چیزیں ادھر سے اُدھر اٹھا کر رکھتی رہتی۔

”بیٹی۔“ ساس لاڈ سے کہتی۔

”جی امی؟“

”گھر میں دو دو نوکر ہیں۔ تم کام کیوں کرتی ہو۔ ابھی تو ہاتھوں کی مہندی بھی نہیں اتری۔ میں تمھیں کام وام نہیں کرنے دوں گی۔“

”میں کیا کروں امی، بیکار بیٹھے بیٹھے بور ہو جاتی ہوں۔“

”اخبار پڑھا کرو۔ ریڈیو سنا کرو۔ میگزین دیکھا کرو۔ جو رسالہ چاہو منگوا لو۔ باکر ڈال جایا کرے گا۔“

ثمن نے ساس کو تشکرانہ نگاہوں سے دیکھا اور کہا لیکن سارا دن نہ تو رسالے پڑھے جا سکتے تھے نہ ہی ریڈیو سن کر وقت گزر سکتا تھا۔ فلمیں بھی ہر روز نہیں دیکھی جاتیں۔

”تیری مرضی۔“

”اچھا ہے نا امی۔ کھانا بنانا سیکھ لوں گی۔ وقت بھی اچھا

گزرے گا۔"

"وقت گزارنے والی بات ٹھیک ہے ورنہ ملازم ہے کھانا پکانے کے لیے۔" ثمن نے اصرار کیا تو ساس کو رضامند کر ہی لیا۔

ثمن نے چند دن تو شوق سے کھانا بنایا۔ سلمان، سسر ساس اور نندیں تعریفوں کے پل باندھنے لگے اسے اپنی محنت کا صلہ مل گیا۔ لیکن وہ زیادہ دن یہ کام نہ کر سکی۔ یکسانیت سے پھر اکتا گئی۔

اس نے اب گھر کی صفائی ستھرائی کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ روز ہی جمعدارنی کے سر پر سوار ہو جاتی۔ ایک ایک جگہ اپنے سامنے صاف کرواتی۔ غسل خانے سر پر کھڑے ہو کر دھلواتی۔ صفائی ہو چکنے کے بعد صافی لے کر سارے گھر کی جھاڑ پونچھ کرتی۔

کپڑے دھل جاتے، تو استری کا مرحلہ آتا۔ وہ دو گھنٹے کپڑے استری کرتی رہتی۔ لیکن یہ سارے کام اس کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ کھانا بنانا، کپڑے دھونا، استری کرنا، گھر کی جھاڑ پونچھ کرنا شغلاً تو کیا جا سکتا تھا مستقلاً نہیں۔ یہ کام تو گھر کے نوکر کرتے تھے۔ وہ نہ بھی کرتے، تو یہ سارے کام ہو جاتے تھے۔

وہ پھر کیا کرے؟ وقت گزاری کا کیا طریق اپنائے؟ بوریت سے کیونکر چھٹکارا پائے؟ وہ سوچتی رہتی۔

ایک دن اسے اپنی پڑھائی کا خیال آیا۔ اگر یہی کام کرنے تھے، تو اتنی مغز ماری کس لیے کی تھی؟ ان کاموں کے لیے، تو سرے سے پڑھائی لکھائی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ پھر اس نے اتنا کیوں پڑھا؟ ایم اے کی ڈگری سجانے کی خاطر یا گھریلو کاموں میں اس طرح الجھ کر ضائع کرنے کے لیے؟

☆☆

اس دن ثمن نے سنگار میز کے سامنے کھڑے کھڑے اپنے سراپا پر نگاہ ڈالی اور بولی "سلمان دیکھو نا میں کتنی موٹی ہوتی جا رہی ہوں۔"

"ورزش کیا کرو۔"

سبز چائے کی افادیت

حال ہی میں کی جانے والی طبی تحقیق کے مطابق امریکی ماہرین صحت نے کہا ہے کہ موٹاپا بہت سی بیماریوں کی وجہ بنتا ہے۔ جبکہ سبز چائے کے استعمال سے موٹاپے پر قابو پانے میں نمایاں مدد مل سکتی ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ سبز چائے پینے سے زیادہ کیلوریز کو جلانے میں مدد ملتی ہے جبکہ یہ ذائقے میں بھی مزے دار اور صحت کے لیے مفید مشروب ہے۔ تحقیقی نتائج کے مطابق سبز چائے ڈائٹ کرنے والے افراد کے لیے بھی سودمند ہے۔ انھوں نے کہا کہ سبز چائے سے فوڈ پوائزننگ اور دانتوں میں بننے والے جراثیم سے بھی بچا جا سکتا ہے۔

(وحید نذیر، بورے والا)

"کچھ نہیں ہوتا اس سے۔"

"کچھ اور سوچو۔"

"سوچا ہے۔"

"کہہ بھی چکو بات کیا ہے۔"

"میں نے ایم اے کیا ہوا ہے۔"

"سلمان نے بُرا سا منہ بنایا اور بولا۔ "بہت جتلانا شروع کر دیا ہے۔"

"نہیں سلمان، بات تو سنو۔"

"ہوں۔"

"میں گھر بیٹھے بور ہوتی ہوں۔ ایم اے کر کے یوں بیکار پڑے رہنا اپنے آپ کو ضائع کر دینے کے مترادف ہے۔"

"کیا چاہتی ہو؟"

"اجازت دو تو ملازمت کر لوں۔"

سلمان نے گھور کر اسے دیکھا۔ وہ ڈر گئی۔ جلدی سے بولی "تمھاری اجازت ہو گی تو کروں گی نا ملازمت"

وہ چند لمحے جز بز ہوتا رہا پھر بولا۔ ”مجھے بیویوں کا ملازمت کرنا پسند نہیں۔“

وہ جھٹ سے بولی ”تم بھی تو کرتے ہو۔“

سلمان نے آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا ”کیا احمقوں والی بات کی ہے۔“

”سلمان میرا مطلب ہے کہ ایم اے کر کے تم ملازمت......“

وہ بات کاٹ کر بولا۔ ”میں نے ڈبل ایم اے کیا ہوا ہے۔“

”چلو ڈبل ایم اے سے اتنی اچھی ملازمت ملی۔ میں سنگل ایم اے ہوں۔ چھوٹی تنخواہ والی ملازمت کر لوں گی۔“ ثمن نے اس کا مزاج خوشگوار کرنے کو اس کے ڈبل ایم اے اور بھاری بھرکم تنخواہ والی ملازمت کی تعریفیں کرنا شروع کر دیں۔

اس کا موڈ خوشگوار ہو گیا لیکن تفاخر سے بولا ”مجھے تمہارا ملازمت کرنا پسند نہیں۔ ملازمت کرنے سے عورتیں مالی طور پر خودمختار ہو جاتی ہیں۔ وہ پھر شوہروں کی پروا نہیں کرتیں اور اپنا پیسہ خرچ کرنے کی عادی بنتی ہیں۔“

ثمن ہنس کر بولی ”میں بالکل خودمختار نہیں ہوں گی۔ تم سے ہی سارا خرچہ وصول کیا کروں گی۔ پلیز اجازت دے دو۔ میں تو وقت گزاری کے لیے ملازمت کرنا چاہتی ہوں، روپے پیسے کی خاطر تو نہیں۔ تمہاری آمدن ضرورت سے زیادہ ہی ہے۔“

ایک نہیں وہ کئی دن اس کی منت سماجت کرتی رہی۔ ساس سسر کو تو اس نے پہلے ہی راضی کر لیا تھا۔ وہ اس کے شوق کی راہ میں حارج نہیں تھے۔ سوال صرف سلمان کی رضامندی کا تھا۔ ثمن اس کی خوشامدیں کرتی رہی۔ شادی سے پہلے اپنی بات منوانے کا ایسا تلخ تجربہ اسے نہیں ہوا تھا۔ اصرار کرتی، ضد کرتی، روٹھ جاتی، بگڑ جاتی اور تب بات مان لی جاتی۔

بہرحال کسی نہ کسی طرح اس نے سلمان کو راضی کر ہی لیا۔ خوشامد اور منت وسماجت سے بھی کام لیا۔ حالانکہ اسے دل ہی دل میں کئی بار رونا بھی آیا کہ شادی کر کے وہ کتنی پابند ہو گئی ہے۔ اس کی اپنی مرضی رہی ہی نہیں۔ سلمان اس کی ہر خواہش پر مسلط ہو گیا ہے۔ اسے اب اماں کی باتیں شدت سے یاد آئیں، وہ واقعی ٹھیک کہتی تھیں۔

اپنی ایک سہیلی کے ابو کی وساطت سے اسے ایک نجی کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ تنخواہ کچھ زیادہ نہ تھی لیکن وقت کا بہترین مصرف نکل آیا۔ تین عورتیں پہلے بھی وہاں ملازم تھیں۔ ثمن کو اچھی سہیلیاں بھی مل گئیں۔ وہ خوشی خوشی کام پر جانے لگی۔

لیکن اس کی خوشیاں دیرپا ثابت نہ ہوئیں۔ اس نے سلمان کے رویے میں غیر محسوس سا تغیر محسوس کیا۔ وہ اب اس پر دانستہ حکم چلانے کی کوشش کرتا۔ بنا پوچھے کہیں آنے جانے نہ دیتا۔ حتیٰ کہ اماں کے ہاں بھی جانے کی پیشگی اجازت کی ضرورت بھی جانے لگی۔ اس کے علاوہ اب وہ اپنے ذاتی کام جو خود کر بھی کر دیتے تھے، ثمن سے کروانے لگا۔ کبھی کسی کام میں تاخیر ہوتی، تو گرجنے برسنے لگتا۔ وہ دفتر سے آ کر دم بھی لے نہ پاتی کہ وہ کوئی نہ کوئی کام کرنے کو کہہ دیتا۔

یہ تبدیلی مبہم اور غیر واضح نہیں تھی۔ ثمن جان گئی کہ سلمان اس پر اپنا رعب اور دباؤ رکھنا چاہتا تھا، اس لیے کہ وہ عورت اور بیوی تھی۔ لیکن سب کچھ خندہ پیشانی سے سہے گئی۔ اس کی دلی خواہش تو پوری ہو چکی تھی۔ گھر بیکار بیٹھے بور تو نہ ہوتی۔

ویسے یہ ملازمت اس کی من پسند بھی نہیں تھی۔ ایک دن اس نے اسما اور زہرا سے کہا ”کیوں نہ میں مقابلے کا امتحان دوں اور سی ایس پی کر لوں۔ میری بڑی خواہش تھی۔ شادی سے پہلے میں نے تیاری بھی شروع کر دی تھی۔“

دونوں نے تائید کی ”ہاں بھابی۔ ملازمت کرنا ہی ہے تو سی ایس پی افسر بن کر ہی کیوں نہ کریں۔ مزہ تو اس نوکری کا آئے گا۔“

”ویسے ایک بات ہے۔“ اسما رازداری سے بولی۔

"کیا؟"

"بھائی جان آپ کو مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔"

"کیوں؟"

دونوں بہنیں ایک دوسری کو دیکھ کر ہنستے ہوئے بولیں۔ "اس لیے کہ بھائی جان دوبار امتحان دے کر فیل ہو چکے۔"

ثمن نے مسکرا کر سر ہلایا اور بولی "پھر تو یہ امتحان پاس کرنے کا مزہ آجائے گا۔"

اس نے شوہر سے بات کی "سلمان! میں ملازمت چھوڑ رہی ہوں۔"

"کیوں؟" اس نے حیرانگی سے پوچھا "شوق اتر گیا۔"

"نہیں۔"

"تو پھر۔"

"سوچ رہی ہوں ملازمت ہی کرنا ہے، تو پھر ٹھاٹ کی ملازمت کیوں نہ کی جائے۔"

"ٹھاٹ کی؟"

"ہاں۔ میں مقابلے کے امتحان میں بیٹھنا چاہتی ہوں۔ تم مخالفت تو نہیں کرو گے نا۔"

"یہ امتحان کچھ ایسا آسان بھی نہیں۔"

"میں تیاری کروں گی۔ کر کے دیکھ لیتی ہوں۔"

"اول تو پاس ہی نہیں ہو گی۔ ہو بھی گئی، تو فہرست کے آخری نمبر پر آؤ گی۔ فائدہ؟ اعلیٰ ملازمتیں، تو ٹاپ پر آنے والوں کو ملتی ہیں۔"

"تم اجازت تو دو۔ یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔"

اس نے پھر کسی نہ کسی طرح سلمان کو راضی کر ہی لیا۔ چناں چہ ملازمت چھوڑی اور مقابلے کے امتحان کی تیاری میں جت گئی۔ اپنی قابلیت کی دھاک سلمان پر بٹھانے کا اس نے تہیہ کر لیا تھا۔

اس نے بہت محنت کی۔ دن رات ایک کر دیے۔ امتحان دیا اور جب نتیجہ آیا تو وہ فہرست میں تیسرے نمبر پر تھی۔

اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ نندیں اس سے لپٹ لپٹ گئیں۔ ساس سسر نے پیار سے داد دی۔ سلمان نے بھی بظاہر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "مان گئے تمھیں۔"

"شکریہ" وہ اٹھلائی۔ سب اس کی قابلیت کو سراہنے لگے۔ ابا تو اپنی لائق فائق بہو کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگے۔ اسما نے یوں ہی مذاق میں کہا "بھائی آپ نے تو بھیا کو بھی مات کر دیا۔ جناب دو بار فیل ہوئے اس امتحان میں۔ اور آپ پہلی دفعہ......"

"اسما" سلمان گرجا۔ اس مذاق سے اسے اپنی ہتک محسوس ہوئی۔ اس کی گرج سے دل دہل گئے۔ ماں نے اسما کو ڈانٹا۔ سلمان کرسی کو ٹھوکر سے ہٹاتا کمرے سے چلا گیا۔ ثمن ششدر رہ گئی۔ اسے یہی محسوس ہوا کہ اس کی کامیابی سلمان پر گراں گزری ہے۔ اسے اماں کی آج پھر بہت یاد آئی۔ وہ سچ ہی کہتی تھیں کہ شوہر بیوی کو اپنے سے آگے بڑھتے کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ محفل بدمزہ ہو گئی۔

لیکن ثمن کے پاس ہونے کی خوشی میں اس کی نندوں نے ایک تقریب کا بندوبست کیا۔ ساس سسر بھی خوش تھے۔ تقریب کی اجازت خوشی دے دی۔ گو ثمن خوشی کا یوں اظہار نہیں چاہتی تھی، سلمان اندر سے خوش جو نہیں تھا۔ تقریب میں آنے والوں نے ثمن کو خوب داد دی۔ اس کی قابلیت کے تذکرے ہوئے۔ شاندار کامیابی کو سراہا گیا۔

لوگ جتنی تعریفیں کر رہے تھے، سلمان خوش ہونے کے بجائے خفیف نظر آ رہا تھا۔ ثمن اس کی ایک ایک حرکت دیکھ رہی تھی۔ اسے بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ لوگ اس کی اتنی زیادہ تعریف کریں۔

رات اس نے یہی بات سلمان سے کہی تو وہ بگڑ کر بولا

"تقریب تم نے کی ہی اس لیے تھی۔ لوگوں کی نظروں میں اپنے آپ کو میرے مقابلے میں اونچا کرنا چاہتی تھی نا۔"

"لیکن سلمان تم جانتے ہو میں تقریب کے حق میں نہیں تھی۔"

"میں سب جانتا ہوں۔ بہت کچھ سمجھنے لگی ہو اپنے آپ کو" وہ غرایا۔

ثمن رونے لگی۔

سلمان کچھ چڑچڑا سا ہو گیا۔ بات بن بات بگڑ جاتا۔ سب کے سامنے ثمن کو جھڑک دیتا۔ دوسروں کے سامنے اس کی تضحیک اور ہتک کر کے خوش ہوتا۔ ڈانٹ ڈپٹ تو اس کی طبیعت کا خاصہ بنتی جا رہی تھی۔ ثمن سے جیسے خدا واسطے کا بیر ہو گیا۔ وہ بیچاری پریشان رہتی۔ رو پڑتی۔ اسے احساس دلانے کی ہر ممکن کوشش کرتی کہ کامیابی نے اس کا دماغ بقول سلمان ساتویں آسمان تک نہیں پہنچایا...... وہ وہی ہے جو تھی۔ لیکن وہ مانتا تو تب نا۔

دن بڑی بے رخی سے گزرنے لگے۔ ثمن کو رہ رہ کر اماں کی حقیقت پسندانہ باتیں یاد آتیں۔ اس کا جی بھر آتا۔ من چاہتا کہ اماں کی گود میں منہ چھپا کر زور زور سے رو دے۔ یہی کچھ ہونا تھا، تو پھر کیا یہ اچھا نہیں تھا کہ وہ بس واجبی سی تعلیم کے بعد گھر بسا کر گرہستی کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیتی۔ اور آنکھیں بند کیے کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی مرکز کے گرد گھومتی رہتی۔

ثمن کی مقابلے کے امتحان میں پوزیشن آئی تھی۔ اسے کسٹم کے محکمے میں لیا گیا۔ گھر والے بہت خوش تھے۔

اس دن سب آتش دان کے قریب بیٹھے تھے۔ تقرر نامہ درمیانی میز پر پڑا تھا جسے ہر کوئی بار بار اٹھا کر دیکھ رہا تھا، پڑھ رہا تھا۔

سلمان بھی وہیں بیٹھا تھا۔ ثمن کی تقرری سے وہ ناخوش تھا۔ اس نے خط اٹھا کر پڑھا اور پھر لفافے میں واپس ڈالتے ہوئے ثمن کی طرف بڑھا دیا "لو سنبھال لو اسے۔"

ثمن نے غور سے اسے دیکھا۔ خط پکڑتے ہوئے بولی

حمد

الٰہی! جب تیرے حضور سر کو جھکاتا ہوں
حقیر و عاجز اپنے آپ کو پاتا ہوں
اپنے اعمال کی رو سیاہی سے جب گھبراتا ہوں
تصورِ دوزخ سے جب میں لرزتا ہوں
لاتقنطو من الرحمۃ اللہ سے گھرا پاتا ہوں
طائرانِ چمن کو جب حمد سرا پاتا ہوں
اپنی غفلت پہ ہر دم شرماتا ہوں
تیری عنایتوں کو جب سامنے پاتا ہوں
اپنے ہی گریبان میں سما جاتا ہوں

(شکیل کونڈل)

"آپ کو میری ملازمت پر اعتراض تو نہیں؟"

وہ سرد مہری سے بولا "سارے مرحلے طے ہو چکے، تو اب اعتراض کی گنجائش؟"

وہ دل گیر آواز میں بولی "اسے واپس بھی لوٹایا جا سکتا ہے۔"

"کیسے؟" سلمان نے جلدی سے پوچھا۔

"ایسے" ثمن نے ہاتھ میں پکڑا تقرر نامہ پرزے پرزے کر ڈالا۔ ساس، سسر اور نندیں اس حرکت پر ششدر رہ گئیں۔ ان کے منہ سے حیرت زدہ سی آوازیں نکلیں۔ سلمان اسے تکتا رہ گیا۔

وہ ہولے سے بولی "تمہاری انا کی تسکین مجھے اس ملازمت سے زیادہ محترم ہے سلمان۔"

سلمان نے سر جھکا لیا۔ ندامت سے اس کا سر جھکتا ہی چلا گیا۔

◆◆◆

بیگم کی بیماری

ایک متوحش خاوند کی پُرتبسم پتا، بیوی کی مسلسل خاموشی نے اُسے پریشان کر ڈالا تھا

پروفیسر مظفر بخاری

"بیگم!"

"بیگم!" "بے ے ے ے گاااام!"

"کیا بیگم بیگم کی رٹ لگا رکھی ہے؟ میں کچھ سوچ رہی ہوں، مجھے سوچنے دو۔"

"نہ نہ بیگم! یہ کام تمھارے کرنے کا نہیں۔ ادھر آؤ میرے پاس، ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"کیا ہے وہ ضروری بات؟"

"تمھارے فائدے کی ہے۔"

(بیگم پاس آ بیٹھتی ہے)

"ہاں، کیا بات ہے میرے فائدے کی؟"

"مجھے تمھاری صحت کے بارے میں تشویش ہو رہی ہے۔ لگتا ہے تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں، کہو تو ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔"

"کیا ہوا ہے میری صحت کو؟ اچھی بھلی تو ہوں۔"

"نہیں! تم اچھی بھلی نہیں ہو۔ تمھیں یقیناً کوئی خطرناک بیماری لاحق ہو گئی ہے۔"

"کیسی بیماری؟ کیا اوٹ پٹانگ باتیں کر رہے ہو؟"

"اوٹ پٹانگ نہیں سچ کہہ رہا ہوں۔ بیماری تمھارے ذہن کو بری طرح متاثر کر چکی۔"

"لگتا ہے تمھارا ذہن متاثر ہوا ہے۔"

"نہیں بیگم! میرے ذہن کو بالکل کچھ نہیں ہوا۔ نہ ہی مجھ میں کوئی تشویش ناک تبدیلی واقع ہوئی ہے۔"

"تو کیا تشویش ناک تبدیلی نظر آگئی تمھیں؟"

"تم پورے پندرہ منٹ سے خاموش بیٹھی ہو۔"

"ہاں بیٹھی ہوں۔"

"تم کل شام آلو چھیل رہی تھیں۔"

"ہاں چھیل رہی تھی۔"

"آج صبح تم نے میری پتلون استری کی۔"

"ہاں، کی۔"

"آج شام بے بی کو پڑھا رہی تھیں۔"

"ہاں، پڑھا رہی تھی۔"

"اس کے علاوہ پورے تین دن ہوئے تم نے مجھ سے لڑائی نہیں کی۔"

"ہاں واقعی، میں تو بھول ہی گئی۔"

"خود ہی بتاؤ، کیا یہ

سب حرکات ظاہر نہیں کرتیں کہ تم تیزی سے مریضہ بنتی جارہی ہو؟ عام حالت میں تم نے کبھی ایسی حرکات نہیں کیں۔"

"ہائے اللہ! تم نے تو مجھے وہم میں ڈال دیا۔ کیا واقعی مجھے کچھ ہوگیا ہے؟"

"یقیناً تمھیں کچھ ہوگیا ہے، لگتا ہے کسی نے تعویذ ڈال دیے ہیں۔"

"کس نے؟"

"مجھے تمھاری ششکنی خالہ پر شک ہے۔ پچھلے ہفتے آئی تھی، ممکن ہے کوئی چکر چلا گئی ہو۔"

"وہ ایسی لگتی تو نہیں۔"

"مجھے اب یقین ہوگیا ہے کہ تمھارا دماغ صحیح کام نہیں کر رہا۔"

"کیسے؟"

"بات یہ ہے کہ اگر تمھارا دماغ صحیح کام کرتا، تو اپنی خالہ کی برائی سن کر تم آگ بگولا ہو جاتیں، میرا گریبان پکڑ لیتیں اور پھر میری خالہ، خالہ کی خالہ اور آگے اس کی خالہ کی مٹی پلید کر کے رکھ دیتیں۔"

"لیکن یہ میری شرافت ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔"

"شرافت کی بات نہیں، بیگم! شرافت تو تمھاری ہمیشہ سے مسئلہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی کی عادات یک لخت بدلنے لگیں، تو نفسیات دانوں کے نزدیک یہ بڑی خطرناک علامت ہے۔ اگر اس پر بروقت قابو نہ پایا جائے، تو بات پاگل پن تک پہنچ سکتی ہے۔"

"تم تو چاہتے ہو کہ میں پاگل ہو جاؤں۔"

"نہیں بیگم، مجھے کیا ضرورت ہے یہ چاہنے کی کہ تم پاگل ہو جاؤ! مجھے تو تمھاری صحت کی فکر ہے۔ اگر بیماری بڑھ گئی، تو جانتی ہو کیا ہوگا؟"

"کیا؟"

"تم اپنی زندگی اجیرن کر لو گی۔ دن بھر کام کرتی نظر آؤ گی۔ چولھے کے آگے مسلسل کھڑے ہو کر اپنا گلاب سا چہرہ جھلسا لو گی۔ میرے فضول دوستوں اور بے کار رشتے داروں کی آؤ بھگت کرتی نظر آؤ گی..... میری بری عادات چھڑوانے کے لیے مجھ سے جنگ کرنے کے بجائے ضرورت سے زیادہ تحمل کا مظاہرہ کرو گی۔ عین ممکن ہے، کسی حد تک میری فرمانبرداری شروع کر دو۔ تمھاری خریداری کا سلسلہ برائے نام رہ جائے۔ کپڑے اور زیورات بنانے کی رفتار بہت کم ہو جائے۔ قصہ مختصر تمھاری زندگی خشک اور قابل رحم ہو جائے گی۔"

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔"

"بشرطیکہ وقت پر اپنا علاج کروالو۔"

"تو کیا سچ مچ.....؟"

"تو اور کیا جھوٹ موٹ.....؟"

"تو پھر جلدی کرو۔ کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔ مجھے لگتا ہے تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے خود بھی محسوس ہو رہا ہے کہ میں بدل رہی ہوں۔"

"ایک ماہر امراض دماغی گلبرگ میں پریکٹس کرتے ہیں۔ لیکن پہلے فون پر ان سے وقت لینا پڑے گا۔"

"اس وقت تک میں چاہے پاگل ہو جاؤں۔"

"کل شام تک کسی نہ کسی طرح خود پر قابو رکھو۔"

"کیسے رکھوں قابو؟"

"خود کو مصروف کر لو۔"

"برتن دھونے بیٹھ جاؤں؟"

"برتن تو خادمہ دھوتی ہے۔"

"ایک دن میں دھولوں گی تو کیا قیامت آجائے گی؟"

"تم نے پھر بہکی بہکی باتیں شروع کر دیں۔"

"تو پھر کیسے رکھوں مصروف اپنے آپ کو؟"

"کوئی ایسا کام کرو جو معمول سے ہٹ کر نہ ہو....."

"مثلاً؟"

"مثلاً لڑائی شروع کرو جو کل شام تک جاری رہنی چاہیے۔"

"لیکن تم تو کل دفتر چلے جاؤ گے۔"

"میری غیر حاضری میں یہاں خادمہ ہے اور پھر ہماری ہمسائی مسز ملک بھی تو ہے۔"

"مسز ملک تو اسپتال میں ہے۔ مجھے اس کی عیادت کرنے جانا تھا۔"

"یہ کیا بات ہوئی! ہمسایوں کو زیادہ لفٹ کرانا، تو تمہارے فلسفے کے خلاف ہے۔ ہاں اگر اسپتال ہی میں لڑائی جھگڑے کی کوئی صورت نکل سکتی ہے، تو ضرور جاؤ۔"

"نہیں اسپتال میں لڑنا ٹھیک نہیں، وہ تندرست ہو کر آئے گی، تو ہمیں لڑ لیں گے۔"

"اب کی نہ تم نے ہوش مندی کی بات۔ لگتا ہے تم جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔ بس کل کا دن کسی طرح بکنے جھکنے میں گزار لو۔ اللہ فضل کرے گا۔"

"کیا تم کل چھٹی نہیں کر سکتے؟" خادمہ اور جمعدارنی سے لڑنے میں زیادہ مزہ نہیں آتا۔"

"تم کہتی ہو تو چھٹی کر لیتا ہوں۔ عرضی بھیج دوں گا کہ گھر پر ضروری کام ہے۔"

"ٹھیک ہے، تو پھر کل صبح شروع کریں گے۔"

"نہیں بیگم! مرض کو بڑھنے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ ویسے بھی نیک کام میں دیر اچھی نہیں۔ اس وقت اتفاق سے ہم دونوں فارغ ہیں۔ اللہ کا نام لے کر شروع ہو جاؤ۔"

"پہل تم کرو۔"

"میں نے بھلا آج تک پہل کی ہے جو اب کروں گا؟"

"لیکن میرے ذہن میں فی الحال ایسی بات نہیں آ رہی جسے بنیاد بنا کر لڑائی شروع کی جا سکے۔"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے بیگم! لڑائی کے لیے کسی وجہ کی ضرورت تو آج تک نہیں پڑی تمہیں۔"

"اس وقت دماغ کام نہیں کر رہا۔"

"میرا اندازہ ٹھیک ہوا نا! دماغ ہی پر اثر ہوا ہے۔"

"تم کوئی وجہ بتا دو۔"

"کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی۔ کل میں نے ایک دوست کو سو روپے ادھار دیے تھے۔ کیا اس بات کو بنیاد بنا کر لڑائی شروع کی جا سکتی ہے؟"

"کیا وہ روپے واپس کر دے گا؟"

"کر تو دے گا۔"

"پھر کوئی بات نہیں، دوست ہی دوست کے کام آتا ہے۔"

"یا اللہ! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ میری بیوی کو صحت دے خدایا!"

"کوئی اور وجہ بتاؤ۔"

"کوئی اور وجہ؟ ہاں خوب یاد آیا۔ تمہارے بھائی نے جو کام بتایا تھا، وہ میں نے ابھی تک نہیں کیا۔"

"کیوں؟"

"متعلقہ افسر دو ہفتے کی چھٹی پر گیا ہوا ہے۔ وہ آئے گا، تو کام ہو گا۔"

"ٹھیک ہے، اسے آ لینے دو۔"

"لیکن تم یہ کیوں نہیں کہتیں کہ میرے کسی بہن بھائی کا کام کرتے ہوئے تمہیں موت پڑتی ہے۔ تمہارے کسی رشتے دار کا کام ہوتا تو میں دیکھتی کیسے افسر چھٹی پر چلا جاتا۔"

"اوہو! بھئی ہو جائے گا میرے بھائی کا کام۔ پہلے تھوڑے کیے ہیں آپ نے ان لوگوں کے کام۔"

"ائیر کنڈیشنر کئی دنوں سے خراب پڑا ہے۔ مجھ سے یہ تک نہ ہو سکا کہ اسے ٹھیک ہی کروا لوں۔"

"فی الحال تو پنکھوں سے کام چل رہا ہے۔ اگلے سال دیکھیں گے۔"

"میں نے گھر میں سفیدی بھی نہیں کروائی۔"

"سفیدی ہمیشہ برسات کا موسم گزرنے پر کروائی جاتی ہے۔ یہ کام ستمبر میں ٹھیک رہے گا۔"

"لیکن ستمبر تک تم زندہ بھی رہو گی؟"

"کیا مطلب؟"

"تمھاری باتوں سے ظاہر ہے شاید زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکو۔"

"تم تو ویسے بھی مجھے زندہ نہیں دیکھنا چاہتے۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ شاباش! آگے چلو۔"

"آگے کیا خاک چلوں! کئی دنوں سے تمھاری حرکتیں نوٹ کر رہی ہوں۔ کسی نگوڑی کا فون آیا۔ میں نے "ہیلو" کہا تو "سوری رانگ نمبر" کہہ کر فون بند کر دی۔ میں پوچھتی ہوں کون ہے یہ حرافہ؟"

"میں تو حرافہ نامی کسی عورت کو نہیں جانتا۔"

"ہاں، تم کیوں جاننے لگے! کل کیا بن سنور کر نکلے تھے صبح سے، اور رات دس بجے آئے۔ حالانکہ میں نے کہا بھی تھا کہ شام کو مجھے انارکلی جانا ہے۔"

"میں نے تمھیں دفتر سے فون کر تو دیا تھا کہ ایک دوست کے والد فوت ہو گئے ہیں۔ گھر آنے میں ذرا دیر ہو جائے گی۔"

"جہنم میں گیا تمھارے دوست کا والد۔"

"تمھیں کیسے پتا چلا؟ وہ تو بہت نیک انسان تھا۔"

"دوست کے والد نے اسی دن فوت ہونا ہوتا ہے جب مجھے کہیں جانا ہو۔ بہانیاں گھڑ کر مت سنایا کرو مجھے۔ تنگ آ گئی ہوں تمھاری چکر بازیوں سے۔ اس مہینے تنخواہ بھی پانچ سو روپے کم دی ہے۔ خوب جانتی ہوں یہ رقم کہاں خرچ ہوتی ہے۔"

"کار کے پرزے خریدے تھے اور کہاں خرچ ہوتی بھلا؟"

"بھاڑ میں گئی تمھاری کار اور ساتھ گئے تم۔ میں کبھی کار میں بیٹھ جاؤں تو تمھیں مرگی کا دورہ پڑ جاتا ہے۔"

"تمھارے ضروری کام میں خوب سمجھتی ہوں۔ بجلی کا بل میں دوں، فون کا بل میں دوں، سوئی گیس کا بل میں دوں، تمھیں خاک ضروری کام ہوتے ہیں؟"

"گھر کے سامنے تو ہے بینک۔ بل دے دیے تو کیا بڑی بات ہوئی؟ مجھے تو صبح ساڑھے سات بجے دفتر پہنچنا ہوتا ہے۔"

"اور دفتر سے اس حرافہ کے گھر جانا ہوتا ہے۔ پرویز ٹھیک ہی کہتا تھا، تمھارے ہاتھ میں شادی کی دو لکیریں ہیں۔"

"وہ تو شرارتی آدمی ہے۔ اکثر گھروں میں یہ بات کہہ کر لڑائی کروا دیتا ہے۔"

"ہاں بس شریف تو ایک تم ہی رہ گئے ہو۔ تمھارے نانا نے دو شادیاں کیں، تمھارے چچا نے دو شادیاں کیں، تم کیوں نہ کرو گے؟"

"ان کی پہلی بیویاں فوت ہو گئی تھیں۔ تمھارے دادا کے گھر تو بیک وقت تین بیویاں تھیں۔ چوتھی کرنے والے تھے کہ بلاوا آ گیا۔"

"اچھا! اب تم میرے بزرگوں تک بھی پہنچنے لگے۔ گز بھر کی زبان سے ان میں کیڑے ڈالنے لگے۔ اب میں اس گھر میں بالکل نہیں رہ سکتی۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ایک منٹ بھی یہاں ٹھہرنے کا۔ جس گھر میں میرے بزرگوں کی عزت محفوظ نہیں، وہاں میں رہ نہیں سکتی۔"

"پہلے تم نے میرے بزرگوں کی بات کی۔"

"کیسے بزرگ؟ کون سے بزرگ؟ تمھارے خاندان میں کہاں سے آئے بزرگ؟ بزرگی میرے خاندان میں ہے۔ میرے بزرگوں کی قبریں دیکھنا چاہتے ہو تو چلو میرے ساتھ میانی صاحب قبرستان۔"

"میانی صاحب تمھارے ساتھ جا کر میں اپنی آخری امید بھی توڑ لوں؟ وہاں جب بھی جاؤں گا، اکیلا ہی جاؤں گا۔"

"تمھاری تو یہی کوشش ہوتی ہے کہ جہاں جاؤ اکیلے جاؤ۔ وہ تو میں ڈھیٹ بن کر ساتھ ہو لیتی ہوں۔ لیکن اب؟..... میں تمھاری شکل دیکھنا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔ تم نے کبھی بیوی کو بیوی سمجھا ہی نہیں۔ تمھاری عادتیں اتنی پختہ ہیں کہ بدل نہیں سکتیں۔ میرا کوئی رشتے دار آ جائے تمھارا منہ لٹک جاتا ہے۔ اپنا کوئی اچکا آ جائے تو چہک چہک کر باتیں کرتے ہو۔ چھٹی والے دن بھی اخبار پکڑ کر چاٹنا شروع کر دیتے ہو یا کسی کا فون آ جاتا ہے۔ بیوی بچوں کے لیے تمھارے پاس وقت ہے ہی نہیں۔ تم جیسے شخص کو تو شادی کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ تم شادی کے لائق ہی نہ تھے۔ اب میں چلی جاؤں گی تو کر لینا جی بھر کے عیاشیاں۔"

"یا اللہ! تیرا شکر ہے کہ میری بیوی تندرست ہو گئی۔ اب ماہر نفسیات کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔"

◆◆◆

جب غیر متوقع طور پر پیش آیا

حادثہ

ٹھوکے دے کر ضمیر جگانے کی سعی
کرنے والے کھٹ مٹھے نثر پارے

مبشر علی زیدی

گاڑی تیز چلا رہا تھا،
میں خانم سے کلفٹن کے ریستوران میں ملاقات طے تھی۔
"تم سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔
اتنے خوش اخلاق کم لوگ ہوتے ہیں۔" وہ کہتی تھی۔
'آج شادی کی دعوت دے کر رہوں گا۔' میں نے ارادہ کرلیا۔
لیکن دیر ہو رہی تھی اور ایک رکشا راستہ نہیں دے رہا تھا۔
کسی طرح میں نے گاڑی بڑھائی اور شیشہ اتار کے رکشے والے کو خوب سنائیں۔
آپ جناب کیا کرتا، بے حساب گالیاں دیں۔
چپکا ہوا تو رکشے والے کے بجائے اس کی سواری بولی،
"رکشا موڑلیں، مجھے کلفٹن نہیں جانا۔"
میں نے گھبرا کے دیکھا، رکشے میں خانم بیٹھی تھی۔

ڈھکن

"میرے دماغ میں اتنی جان نہیں کہ روبوٹس کے ساتھ مسلسل کام کروں۔"
میں نے باس سے صاف صاف کہہ دیا۔
"آپ کو روبوٹس اچھے لگتے ہوں گے،
وہ چوبیس گھنٹے کام کرتے ہیں،
ہماری طرح چھٹی نہیں کرتے،
تنخواہ نہیں مانگتے،
لیکن وہ ہم انسانوں کی طرح سوچ بھی نہیں سکتے،
ان کے جذبات نہیں ہوتے،
وہ قوت فیصلہ سے عاری ہوتے ہیں۔
میں ٹھنڈی مشینوں کے ساتھ مزید کام نہیں کرسکتا۔"

باس نے بظاہر دھیان سے میری بات سنی۔
لیکن پھر کہا "مرضی ہے، نئی ملازمت ڈھونڈ لو۔"
اس کے بعد اپنے دماغ کا ڈھکن اٹھا بڑی تبدیلی کرلی۔

باخبر ذرائع

کرائم رپورٹر بھاگم بھاگ اس چوراہے پر پہنچا جہاں قتل ہونے والا تھا۔
اسے 'باخبر ذرائع' نے اس بارے میں بتایا تھا۔
ہر صحافی کے کچھ 'ذرائع' ہوتے ہیں جو اندر کی باتیں بتا دیتے ہیں۔
کچھ صحافیوں کے 'ذرائع' نامعلوم ہوتے ہیں، کچھ کے 'نامعلوم افراد' ہوتے ہیں۔
اس رپورٹر کو 'ذرائع' نے ہمیشہ پکی خبر دی تھی۔
وہ سب سے بڑی خبر حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے پہنچا۔
اگلے دن اس خبر کی سرخی یوں شائع ہوئی
"نامعلوم افراد کی فائرنگ سے کرائم رپورٹر ہلاک"

احتیاطاً

"گولی مت چلانا بھائی!" اس نے التجا کی۔
"آپ کا شک درست نہیں،
میں آپ ہی کے مسلک کا ماننے والا ہوں،
آپ ہی کی قومیت سے تعلق رکھتا ہوں،
آپ ہی کی زبان بولتا ہوں،
مجھے کسی اختلاف کی بنا پر مارنے کا جواز نہیں۔"
پستول والے نے کہا،
"جی ہاں،
آپ ہمارے ہی مسلک کے ماننے والے لگتے ہیں،
ہماری ہی قومیت سے تعلق ظاہر ہے،
ہماری ہی زبان بول رہے ہیں،
آپ کو کسی اختلاف کی بنا پر مارنے کا جواز نہیں،
لیکن چوں کہ شک رفع نہیں ہو رہا،
اس لیے احتیاطاً کی بنا پر مار رہے ہیں۔"

معمول

میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ اس سے کتنی شدید محبت کرتا ہوں،
لیکن ابھی صبح کے سات بجے ہیں، وہ سو رہی ہوگی۔
بعد میں کال کر کے بتاؤں گا۔
بارہ بج گئے، اس وقت فون کرنا مناسب نہیں،
وہ دفتر میں ہوگی۔
دو بج چکے، وہ کھانا کھا رہی ہوگی۔
کچھ دیر بعد بات کرتا ہوں۔
ساڑھے چار ہوگئے، وہ ڈرائیو کر رہی ہوگی۔
شام کے چھ بج گئے لیکن کیسے کال کروں؟ پہلے اپنے بیٹنگ کی تیاری کرلوں۔
نو بجے کا خبرنامہ ہو جائے، پھر خبر سنا کے رہوں گا۔
اوہو، گیارہ بج رہے ہیں، وہ سو چکی ہوگی۔
کل ضرور بتاؤں گا۔

فرمائش

"میں نے خودکشی کا فیصلہ کرلیا ہے۔" اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔
"میری بیوی اور تم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو۔
مجھے درمیان میں نہیں آنا چاہیے۔"
اس نے میز کی دراز سے پستول نکال لیا۔
"خوب!" میں نے اسے داد دی،
"مجھے تم جیسے بہادر آدمی سے یہی توقع تھی۔"
اس نے شکست خوردہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

”مرنے سے پہلے ہمیں شادی کا تحفہ نہیں دو گے؟“ میں نے پوچھا۔
”کیوں نہیں؟ بولو، کیا چاہیے؟“ اس نے پستول میں ایک گولی ڈال کر کہا۔
”خودکشی سے پہلے میری بیوی کو ٹھکانے لگا دو، پلیز!“

روزانہ

”ہر روز سولفظوں کی ایک کہانی لکھتا ہوں۔“ میں نے اسے بتایا۔
وہ مجھے دفتر کے پیچھے والی گلی میں ملا تھا۔
پوچھ رہا تھا کہ کیا کام کرتا ہوں۔
”روز کہانی لکھنا ایسے ہے جیسے......
یوں سمجھو کہ روز کنواں کھودتا ہوں، روز پانی پیتا ہوں۔“
گلی میں اندھیرا تھا لیکن اس کے چہرے پر روشنی پھیل گئی۔
بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔
”تم کیا کام کرتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
”میں بھی روز کنواں کھودتا ہوں، روز پانی پیتا ہوں۔“ اس نے کہا۔
پھر ایک پستول لہرا کے بولا ”ہر روز ایک موبائل فون چھینتا ہوں۔“

مزدوری

وہ ایک دہاڑی دار مزدور تھا۔
جس دن اسے کام نہیں ملتا تھا، سب فاقہ کرتے تھے۔
اس شام بھی گھر میں چولھا نہیں جلا، بچے بھوکے رہے۔
بتی بھی نہیں جلی۔ بجلی گئی تو گھنٹوں نہیں آئی۔
اس کی بیوی کی طبیعت خراب تھی، دوا کے پیسے نہیں تھے۔
وہ کسی سے ادھار مانگنے گھر سے نکلا تو اندھیری سڑک پر اندھی گولی کا نشانہ بن گیا۔
گولی مارنے والا ٹارگٹ کلر نہیں تھا۔
اسے کسی کا نام بتا کر سپاری نہیں دی گئی تھی۔
اسے بس ایک لاش گرانے کے پیسے ملے تھے۔
وہ ایک دہاڑی دار مزدور تھا۔

◆◆◆

موبائل چوری روکنے کے نئے اقدامات

دنیا بھر میں موبائل فون کی چوریوں پر قابو پانے کے لیے کوششیں جاری ہیں اور اسی سلسلے میں امریکی شہروں نیویارک اور سان فرانسسکو میں نئے اقدامات آزمائے جائیں گے۔ حکام چوری کو روکنے کے لیے نئے اقدامات پر ٹیسٹ کریں گے۔ اس ٹیسٹ میں یہ بات معلوم کی جائے گی کہ نئے اقدامات موبائل چوروں کے حربوں کے خلاف کس حد تک موثر ثابت ہوتے ہیں۔ دنیا کے بڑے شہروں کے حکام نے موبائل تیار کرنے والی کمپنیوں پر موبائل چوری روکنے کے لیے اقدامات کرنے پر زور دیا ہے۔ نیویارک میں ۴۰ فی صد چوریاں موبائل کی ہوتی ہیں۔ موبائل چوری اس قدر عام ہے کہ پولیس نے اسے 'ایپل پکنگ یا ایپل اٹھانے' کا نام دیا ہے۔
اسی طرح لندن میں بھی موبائل فونز کی چوری میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ لندن کے میئر کے دفتر کے مطابق چوری کے ۷۰ فی صد واقعات موبائل چوری کے ہوتے ہیں۔ لندن میں دس ہزار موبائل سیٹ ماہانہ چوری ہو رہے ہیں۔ ایپل کا ایکٹیویشن لاک نئے آئی فون اور آئی پیڈ سافٹ ویئر کا حصہ ہوگا۔ موبائل چوری کرنے کے فوراً بعد چور موبائل کو ڈی ایکٹیویٹ کر دیتے ہیں تاکہ ان کا سراغ نہ لگایا جا سکے۔ ایکٹیویشن لاک کا مقصد موبائل کو دوبارہ ایکٹیویٹ کرنا مشکل بنانا ہے کیونکہ اس کے لیے موبائل کو رجسٹر کرتے وقت دی گئی اصلی لاگ ان کی تفصیلات کی ضرورت ہوگی۔

لختِ جگر

ایک پتھردل باپ کو جب بیٹے کی محبت نے عجب امتحان میں ڈال دیا

شولم آش / غلام عباس

بچے کے بلکنے سے بوریا کی نیند اچٹ گئی۔ آنکھیں بند کیے بیوی کو پکارا۔ "گولڈا کو چپ کرائیو۔ رو رہا ہے۔"

گولڈا کی طرف سے کوئی جواب نہ سنا، تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ادھر ادھر دیکھا، معلوم ہوا کہ گھر میں نہیں ہے۔ پہلے تو کچھ حیرت ہوئی۔ پھر سوچا نہانے گئی ہو۔ قریب ہی ایک چچی پڑی تھی۔ اٹھا کر بچے کے منہ میں ٹھونس دی کہ روئے نہیں۔ پھر کپڑے پہننے کو اٹھ کھڑا ہوا۔

کپڑے پہنتے پہنتے یکا یک خیال آیا کہ زوبلطر کے گھر سے جو چاندی کے شمعدان اڑا لایا تھا، ان کے بدلے کتنی رقم ملے گی۔

یہ خیال دل پر کچھ ایسا چھا گیا کہ اسی وقت بالاخانے چل دیا کہ چرائے ہوئے مال کا اندازہ لگائے۔ لیکن جا کر دیکھا، تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ گھر کا کونا کونا چھان مارا...... بے سود۔

پھرتی سے نیچے آیا اور اس طرف گیا جہاں اس کی بیوی نے اپنی چیزیں لٹکا رکھی تھیں۔ پردے کو نوچ ڈالا۔ دیکھا تو وہ بھی غائب...... اب کھلا کہ بھاگ گئی ہے۔

"ہونہہ بلا سے بھاگے

گئی، تو جائے۔ لعنت ہو، یہاں پرواہ کسے ہے۔" جبراً بے پروائی ظاہر کرتے اور دیواروں پر تھوکتے ہوئے اپنے آپ کہا تھا" بھئی کیا کہنا! خوب کارستانی ہے..... ہاہاہا....."

پھر بچے کی طرف دیکھا۔

"لیکن اس کمبخت کا کیا ہوگا؟" یہ سوچ کر وہ فکرمند سا ہو گیا۔ "اگر اتنا ہی معلوم ہو جائے کہ نامراد کہاں گم ہے تو خدا کی قسم اسے ابھی لے جا کر اس کے دروازے پر رکھ دوں اور کہوں، لے اسے بھی ساتھ لیتی جا..... یہ تیرا ہی ہے۔"

یکا یک ایک خیال اس کے دماغ میں آیا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ اپنا اوپر کا ہونٹ دانتوں سے کاٹنے لگا اور ہاتھ لرزنے لگے۔ بچے کے پاس آیا۔ جو ننگا پڑا تھا۔ اوپر کا میلا کچیلا چیتھڑا اپنی ننھی نازک ٹانگیں چلا چلا کر پرے پھینک دیا تھا۔ ہاتھ منہ میں ٹھونسے ہوئے تھے۔ ہلکے ہلکے مسکرا رہا تھا۔ دونوں گالوں پر ننھے ننھے گڑھے پڑے تھے..... چہرے کے خدوخال نے اسے شبے میں ڈال دیا، پچھ سمجھ میں نہ آیا۔

بچے کے پاس سے ہٹ گیا۔ ٹوپی پہنی اور جلدی سے دروازے میں قفل لگا باہر نکل گیا۔ بلا مقصد چلا جا رہا تھا مگر دل کا سکون کھو بیٹھا تھا..... بچے کی چیخیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں، جیسے اسے بلا رہی ہوں..... خیال ہی خیال میں نظر آیا جیسے اس کے سامنے پڑا اپنی ننھی ننھی ٹانگیں چلا رہا ہے۔ بے تحاشا رو رہا ہے۔ اس نے سوچا "نہیں مجھے پلٹ جانا چاہیے، یہ ظلم ہے۔"

پھر اپنے آپ سے کہنے لگا "خدا کی قسم اگر اب وہ کمبخت ہاتھ لگ جائے، تو میں گلے سے پکڑ لوں اور اس زور سے گھونٹوں، اس زور سے گھونٹوں کہ زبان نکل کر باہر آ پڑے۔"

چلتے چلتے نان بائی کی دکان میں داخل ہوا۔ ایک ڈبل روٹی خریدی اور واپس گھر لوٹ آیا۔ بچہ پہلے کی طرح ننگا پڑا ہوا تھا۔ مگر اب مسکرا رہا تھا۔

"لو مردود کیا مزے سے پڑا ہنس رہا ہے۔"

وہ پھر گھر سے نکل گیا۔ مگر ایک ایک قدم اٹھانا دوبھر تھا۔ راستہ بھر رہ رہ کے محسوس ہوتا جیسے بچے کے رونے کی آواز کانوں میں آتی ہے۔ دل میں جیسے کوئی نشتر سا اترا جا رہا تھا۔

زور سے مٹھیاں بند کیں اور پھر گھر لوٹ آیا۔ اب کے بچہ لگاتار چلائے جا رہا تھا۔ "ماما..... ماما....."

"کیوں بے مما کے بچے..... جا کے اپنی پیاری اماں کو ڈھونڈ کیوں نہیں لاتا؟! الٰہی اسے ہیضہ آ جائے؟"

اس نے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ بچہ سینے سے لگتے ہی چمٹ گیا اور اپنے پتلے پتلے ہونٹوں سے بے تابانہ کچھ تلاش کرنے لگا۔

"الٰہی اس پر بجلی گر پڑے۔ ناگ ڈس جائے۔" وہ کوستا اور پیار سے ننھے کے گالوں پر تھپکی دیتا جاتا۔ "رومت..... بس چپ ہو جاؤ..... چپ کرو..... شاباش شاباش!"

بچہ اپنے نازک منہ سے تلاش میں مصروف رہا۔ ادھر ادھر ہاتھ گھماتا۔ کبھی سر ہلاتا جیسے کچھ کہنے کو ہے مگر کہہ نہیں سکتا۔ اشاروں سے مطلب سمجھ کر بدریا نے ادھر ادھر دیکھا، چولھے پر ایک کٹورا رکھا تھا۔ اس میں تھوڑا سا دودھ تھا۔ ذرا سی ڈبل روٹی توڑ دودھ میں بھگوئی اور چمچے کے ساتھ بچے کو کھلانے لگا۔ چمکارتا بھی جاتا۔ "کھا لے بیٹا، کھا لے..... تیری ماں، اسے شیطان لے جائے، تجھے چھوڑ کر بھاگ گئی ہے..... کتیا بھی اپنے بچے کو یوں نہیں چھوڑتی..... وہ اس سے بھی بدتر ہے..... روومت..... نہیں میں تجھے نہیں چھوڑوں گا..... اپنے پاس سے کبھی الگ نہیں کروں گا۔"

جب بچہ چپکا ہو گیا، تو اسے ایک کپڑے میں لپیٹ بازار کو لے چلا۔ منڈی میں اس کے آنے سے ہل چل سی پڑ گئی۔ "ایں بدریا کولک اور بچہ!"

دکان میں بیٹھے کریڈنگ نے آواز دی۔ "اے کولک، یہ بچہ کہاں سے لیا؟"

کریڈنگ کی بیوی بے تابی سے اٹھی اور اپنی بانہیں کھولے بچے کی طرف لپکی۔ خوشی سے باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ کئی بار اپنے چہرے کو دامن سے پونچھا اور بچے کے پھول سے گالوں پر ہلکے ہلکے طمانچے مارے۔

"کولک یہ تیرا ہے؟..... اس کی پیاری پیاری آنکھوں کو تو دیکھ۔ ہیں نا بالکل مرینہ کی سی..... اسی کی ناک ہو بہو..... خدا کی قسم

بچہ تو لعل بے بہا ہے..... لا مجھے دے دے۔“

اس نے بودیا سے بچہ لیا اور اسے اچھالنے لگی۔ ”ارے چل شریر..... بہت تیرے شریر کی۔“

بوڑھا کریڈ تنگ، چوروں کا سردار آہستہ سے اٹھا اور بچے کے پاس آ کر اسے اچھی طرح دیکھا بھالا۔ پھر کولک کی پیٹھ تھپ تھپا کر کہنے لگا۔ ”واہ بیٹا کولک۔ بچہ تو خوب حسین ہے..... ذرا اسے بڑا ہو جانے دے۔ پھر دیکھیو کیسی آسانی سے دیواروں کو پھاندا کرے گا..... اس کی ماں کون ہے؟“

”خدا کرے آگ میں جل جائے سردار..... چاندی کے شمع دان لے کر چمپت ہو گئی۔“

”اور بچہ چھوڑ گئی؟“

”ہاں“

”یہ تو برا ہوا..... بہت برا؟“

بوڑھے کریڈ تنگ نے اپنا سر کھجایا۔ اتنے میں اس کا بیٹا بھی آ دھمکا۔ اور کولک پر آواز سے کسنے لگا۔ ”بہت اچھا ہوا..... میں جانوں اب تم اپنا پیشہ چھوڑ دایہ گری کا کام شروع کر دو گے..... کیوں بے کیسا چکمہ دے گئی ہے نا؟“

کولک نے جھنجھلا کر کہا۔ ”جا میاں اپنی راہ لگ۔ اللہ رزق رساں ہے اور کولک، کولک ہی رہے گا۔“

اس نے بچہ گود میں لیا اور گاؤں کے بیچوں بیچ چل دیا۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے لوگ اس پر انگلیاں اٹھا رہے ہیں، ہنس رہے ہیں۔

جب گاؤں سے دور نکل کر جنگل میں پہنچ گیا، تو ایک بڑے سے پتھر پر جا بیٹھا۔ آس پاس کسی آدم زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ درختوں کی ٹہنیاں اپنے زرد پتے گرا گرا آہیں بھر رہی تھیں۔ دور سے ایک ندی کی مدھم سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ پتھروں سے ٹکراتی، اچھلتی کودتی بہے جا رہی تھی۔

اس نے بچے کو پاس ہی زمین پر رکھا اور اسے ترچھی نظروں سے گھورنے لگا۔ بچہ انگوٹھا چوستے ہوئے چپکے چپکے باپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی سوچ میں کھویا ہوا ہے۔ بودیا کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ بچے کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ لمحہ بھر کے لیے جی میں آئی کہ اسے یہیں جنگل میں چھوڑ کر چل دے۔ مگر فوراً ہی اس ننھی سی جان، اپنے ہی جگر، اپنے ہی خون کی بے بسی پر دل بھر آیا۔

اس نے بچہ گود میں اٹھا لیا اور محبت سے اس کا نازک جسم بھینچا۔ پھر غور سے چہرے کی طرف جو دیکھا تو اسے اپنے ہی خدوخال جھلکتے نظر آئے اور اس کے تمام جسم میں خوشی کی گرمی دوڑ گئی۔

”ننھے کولک“ وہ محبت بھری آواز میں کہنے لگا۔ ”ہاں تو ننھا کولک ہی ہے..... مجھے یقین ہے، تو بڑا ہو کر عجیب و غریب نکلے گا، تو مکانوں، کھڑکیوں، ہوادانوں اور چھجوں سے داخل ہوگا..... اور قفل توڑ کر بھیڑوں کی کھالیں چرا لائے گا..... پھر تیرے بچے ہوں گے..... اور ان کی ماں بھی انہیں چھوڑ بھاگ جائے گی..... پھر کیا، تو اپنے بچوں کو لیے در بدر بھیک مانگتا پھرے گا؟..... تو کون ہے؟..... کولک..... تو بھی میری طرح..... تو..... میں.....“

اس نے بچے کو ندی کنارے بٹھا دیا اور آپ ایک درخت کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا کہ دیکھوں کیا کرتا ہے۔ بچہ ادھر ادھر لڑھکنے لگا۔ ہاتھوں کو چوستا اور کہتا۔ ”ماما..... ماما.....“

وہ آگے بڑھ کر ایک اور درخت کے پیچھے چھپ گیا لیکن ابھی بچے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ وہ درختوں کے پیچھے چھپتا دور ہٹنے لگا یہاں تک کہ اب اسے کچھ سنائی اور دکھائی نہ دیا۔ پھر وہ سرپٹ بھاگا۔ مگر بھاگتے ہوئے بھی ننھے کی چیخیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

یکا یک خیال آیا۔ ”کہیں لڑھکتا لڑھکتا ندی میں نہ گر پڑا ہو.....“ یہ سوچ کر اس کا سر دور کرنے لگا۔ ہوش و حواس غائب ہو گئے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا معلوم ہونے لگا اور لگا دل کو جیسے کوئی چرکے لگا رہا ہے..... مگر وہ بھاگتا ہی رہا.....

آخر وہ یک لخت ٹھہر گیا۔ ادھر ادھر دیکھا اور پوری تیزی سے الٹے پاؤں لوٹا۔ بچے کے پاس پہنچا، تو دیکھا کہ زور زور سے رو رہا ہے۔ اس نے گود میں لیا اور وہاں سے چلا آیا۔ جنگل کے سرے پر کچھ جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں..... وہ ہر گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھرائی آواز میں بھیک مانگنے لگا ”یتیم بچے کو تھوڑا سا دودھ دے دو۔ بن ماں کے بچے کو تھوڑا سا دودھ دے دو.....“

◆◆◆

کلمہ طیبہ کی برکت

ذکرِ خدا کے معجزے نے جب ایک غیر مسلم کا سینہ نورِ اسلام سے بھر دیا

مولانا محمد تقی عثمانی

سڈنی سے ۱۰۰ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع شہر وایونگ تک جانے والی شاہراہ اتنی صاف ہے کہ یہ فاصلہ گھنٹے سوا گھنٹے میں طے ہو جاتا ہے۔ وایونگ شہر میں ہماری قیام گاہ سے تقریباً پانچ سات کلو میٹر کے فاصلے پر ایک مسجد واقع ہے۔ عشا کی نماز ہم نے اسی میں ادا کی۔

مسجد رضوان نامی یہ اللہ کا گھر ایک انڈونیشی مسلمان نے تعمیر کیا ہے۔ اس وقت وہ متعدد فیکٹریوں کے مالک اور بڑے دولت مند انسان ہیں۔ نماز عشا کے بعد وہ ملاقات کے لیے قیام گاہ پر آ گئے۔ باتوں باتوں میں ایک صاحب نے ذکر کیا کہ وہ نومسلم ہیں اور ان کا اصل نام رابرٹ واجو تھا۔ پھر انھوں نے بتایا کہ وہ تقریباً دس سال پہلے مسلمان ہوئے ہیں۔ انھوں نے پھر اپنے مسلمان ہونے کی داستان سنائی جو بڑی ایمان افروز ہے۔ وہ انھی کی زبانی سنیے۔

میرے دادا اگرچہ مسلمان تھے، لیکن انھوں نے عیسائی خاتون سے شادی کر لی۔ اس خاتون نے (رضوان صاحب کی دادی) اپنی ساری اولاد کو عیسائی بنا لیا جن میں میرے والد بھی شامل تھے۔ ان کے زیرِ اثر میں بھی عیسائی ہو گیا۔ میں اپنے لڑکپن میں خطرناک حد تک آوارہ لڑکا تھا جو شراب و شباب سے لے کر قتل و غارت گری تک ہر برائی میں مبتلا رہا۔

اپنے جیسے آوارہ لڑکوں کے ساتھ رہ کر یہ ساری برائیاں

میرے لیے روزمرہ کی عادت بن گئی تھیں، لیکن کبھی کبھی میرے اندر سویا ہوا ضمیر جاگتا اور مجھے احساس ہوتا کہ میں سنگین گناہوں کا ارتکاب کر رہا ہوں۔ ایسے موقع پر میں کبھی کبھی چرچ جاتا اور پادری صاحب سے اپنے گناہوں کا ذکر کرتا۔ پادری صاحب میری بخشش کی دعا کر کے مجھے مطمئن کر دیتے۔

میں جس تعلیمی ادارے میں پڑھتا تھا، وہاں میری ایک استانی مسلمان تھیں۔ مجھے ان کی باتیں اچھی لگتی تھیں اس لیے میں کبھی کبھی ان کے پاس بھی چلا جاتا اور اپنی حالت کا ذکر کرتا۔ وہ مجھے ایسی حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کرتیں اور بتاتیں کہ ان کاموں کا انجام دنیا میں بھی برا ہے اور آخرت میں بھی۔ میرے والد فوج کے اونچے عہدے پر فائز تھے، انھوں نے مجھے بی ایم ڈبلیو گاڑی خرید کر دی ہوئی تھی۔ اس کا ڈرائیور مسلمان تھا۔ وہ بھی کبھی کبھی باتوں باتوں میں میرے سامنے اسلام کی خوبیاں بیان کیا کرتا۔

اسی دوران میرے دادا بیمار ہو گئے۔ پتا چلا کہ انھوں نے میرے لیے ایک وصیت نامہ سربمہر کر کے رکھا ہوا ہے اور یہ وصیت کی ہے کہ یہ تحریر ان کی وفات کے بعد مجھے دی جائے۔ مجھے یقین تھا، انھوں نے اس تحریر میں اپنی جائداد وغیرہ مجھے دینے کی وصیت کی ہوگی۔ کچھ عرصے بعد جب میرے دادا کا انتقال ہوا، تو ان کی وصیت کے مطابق وہ سربمہر لفافہ میرے حوالے کیا گیا۔ میں خوش تھا کہ وصیت نامے کے نتیجے میں مزید مال دار ہو جاؤں گا، لیکن جب لفافہ کھول کر دیکھا، تو میری حیرت اور افسوس کی انتہا نہ رہی۔ اُس میں ایک سادہ کاغذ تھا جس پر کسی وصیت نامے کے بجائے صرف یہ کلمہ لکھا ہوا تھا:

"اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ"

مجھے یہ پرچہ دیکھ کر اتنا صدمہ ہوا کہ میں نے اس کے دو ٹکڑے کر دیے اور ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور سیدھا اپنی مسلمان استانی کے پاس جا کر یہ واقعہ سنایا۔ وہ میرے ساتھ گھر آئیں، پرچہ دیکھا اور مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ تمھارے دادا نے تمھیں دنیا کے مال و دولت سے کہیں بڑی نعمت دینے کی وصیت کی ہے کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔ مگر میں نے ان کی بات نہ مانی اور اپنی انھی بداعمالیوں میں مصروف رہا۔

کچھ عرصے بعد پھر میرے ضمیر کے کچوکے مجھے چرچ لے گئے اور میں نے پادری صاحب سے کہا، میں بار بار آپ کے پاس آتا ہوں اور آپ مجھے مغفرت کی بشارت سنا کر واپس بھیج دیتے ہیں۔ لیکن میری زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آتی، میں پھر بےدھڑک وہی کام کرنے لگتا ہوں۔ پادری نے پھر وہی بات دہرائی کہ جب میں تمھارے لیے مغفرت کی دعا کر دیتا ہوں، تو پھر تمھیں کس بات کی فکر ہے؟ مجھے پادری کی اس بات پر اتنا غصہ آیا کہ میں نے جیب سے پستول نکالا اور ان پر اس طرح فائر کیا کہ وہ زخمی ہو جائیں۔

بعد میں پتا چلا کہ پادری کو معمولی خراش آئی تھی، اسی لیے وہ پولیس کے پاس بھی نہیں گیا، مگر تب میں یہی سمجھا کہ مجھ سے جرم سرزد ہو چکا۔ یہ واردات کر کے میں باہر نکلا، تو میرے اندر کی بےچینی میں اور اضافہ ہو گیا۔ قدرتی طور پر مجھے اس واقعے کے بعد فرار ہونا چاہیے تھا، لیکن میں نے اپنی بےچینی کا تذکرہ اپنے مسلمان ڈرائیور سے کیا۔ اُس نے کہا کہ میں آپ کو ایسی جگہ لے جاتا ہوں جہاں شاید آپ کی بےچینی میں کمی آ جائے۔ میں نے رضامندی ظاہر کی، تو وہ مجھے ایسے حلقے میں لے گیا جہاں بہت سے لوگ بیٹھے "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کا ذکر کر رہے تھے۔

میں جب اس حلقے میں پہنچا، تو میرے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ مجھ پر ایک ناقابلِ بیان کیفیت طاری ہو گئی۔ ذکر کرنے والوں کی آواز "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" میری رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ مجھ پر ذکر نے کچھ ایسا طلسماتی اثر کیا کہ میرا سارا وجود لرز اٹھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں سر سے پاؤں تک بدل چکا۔ میں جلدی سے باہر نکلا اور اپنی مسلمان استانی کے پاس پہنچا،

انھیں سارا واقعہ سنایا۔ وہ انھیں اور تھوڑی دیر میں پھٹا ہوا پرچہ اٹھا لائیں جو میرے دادا نے میرے لیے چھوڑا تھا۔ استانی نے ٹکڑوں کو جوڑ کر مجھے وہ پرچہ دکھایا جس پر لکھا تھا:

"اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ"

پھر استانی نے کہا کہ تمھارے دادا کے وصیت پر عمل کرنے کا وقت آ گیا ہے، اب تم اس کلمے پر ایمان لا کر مسلمان ہو جاؤ۔ میری زندگی میں پہلے ہی انقلاب آ چکا تھا اور اس کلمے کی حقانیت میرے دل میں اتر گئی تھی۔ میں نے بلا تاخیر اسلام قبول کر لیا۔

اسلام قبول کرنے کے بعد میں اپنے عیسائی والد کے پاس پہنچا اور انھیں بتایا کہ میں مسلمان ہو چکا۔ وہ غصے سے آگ بگولا ہو گئے۔ انھوں نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ میری قیمتی گاڑی واپس لے لی اور اپنی ساری دولت سے مجھے محروم کر دیا۔ مگر اسلام میرے دل میں گھر کر چکا تھا۔ میں چند روز کچھ مسلمان درویشوں کے پاس رہا اور میرے دل میں یہ بات سما گئی کہ "ذکر" ہی سب کچھ ہے۔ چناں چہ کچھ عرصے بعد میں نے شہر سے باہر ایک جھونپڑی بنائی اور وہاں دن رات "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کے ذکر میں مشغول ہو گیا۔

مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس ذکر نے میری گناہوں کی زندگی کو دھو دیا اور میرا ہر کام اسی ذکر کی بدولت ہوتا ہے۔ میں اس وقت نماز، روزے اور دوسرے احکام اسلام سے بھی بے بہرہ تھا اور صرف ذکر پر قناعت کیے ہوئے تھا۔ بھوک پیاس دور کرنے کے لیے تھوڑا سا کام کرتا پھر اپنی جھونپڑی میں آ کر ذکر میں مشغول ہو جاتا۔ جب اسی حالت میں کچھ عرصہ گزر گیا، تو ایک روز میں نے خواب میں کسی بزرگ کو دیکھا۔

انھوں نے فرمایا کہ میں (شیخ) عبدالقادر جیلانیؒ ہوں اور جو طریقہ تم نے اختیار کیا، وہ صحیح نہیں۔ اسلام کا تقاضا یہ نہیں کہ انسان دنیا چھوڑ کر جنگل میں جا بیٹھے اور صرف ذکر کرتا رہے۔ اسلام میں ذکر کے علاوہ فرض عبادتیں بھی ہیں جن میں نماز سرفہرست ہے۔ اسلام ہی کا یہ حکم ہے کہ انسان سنت کے مطابق انسانوں کے ساتھ زندگی گزارے۔ اب جنگل چھوڑ کر شہر واپس جاؤ اور اسلام کی صحیح تعلیم حاصل کر کے اس کے مطابق زندگی بسر کرو۔

اس خواب کے بعد میں دوبارہ شہر آیا اور اپنی مسلمان استانی سے دین کی تعلیمات حاصل کیں۔ اس دوران میرے والد کا غصہ بھی ٹھنڈا ہو چکا تھا، آخر میں ان کا بیٹا تھا اور مجھے کھو کر وہ پریشان تھے۔ وہ پھر مجھ سے بیٹے جیسا سلوک کرنے لگے اور جو سہولتیں مجھ سے چھینی تھیں، بڑی حد تک لوٹا دیں۔ میری والدہ آسٹریلیا رہتی تھیں، وہ بھی پریشان ہو کر مجھے ڈھونڈنے انڈونیشیا چلی آئی تھیں۔

میری واپسی کے بعد وہ پھر مجھے ملنے آئیں اور مجھے اسلام سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ اسلام ترک کرنا میرے لیے ناقابل تصور ہے۔ اسی دوران ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا جس نے میری زندگی پر مزید گہرے اثرات مرتب کیے۔ میرے والد کے ایک مسلمان دوست فوج میں جنرل تھے۔ وہ مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ میں دیکھتا تھا کہ وہ مسجدوں کی تعمیر، اسپتالوں کے قیام اور دوسرے خیراتی کاموں میں بڑا حصہ لیا کرتے۔

ان کا انتقال ہو گیا، تو میں ان کے جنازے میں شریک ہوا۔ جب انھیں قبر میں اتارنے کا وقت آیا، تو ان سے اپنے قلبی لگاؤ کے باعث میں نے قبر میں میت اتاری۔ قبر پر مٹی ڈال دی گئی مگر جب میں واپس جانے لگا اور وقت دیکھنے کے لیے گھڑی دیکھنی چاہی تو کلائی سے غائب تھی۔ یہ گھڑی قیمتی تھی اور مجھے یقین ہو گیا کہ قبر میں رہ گئی ہے۔ اس وقت میں نے کسی سے کچھ ذکر نہ کیا لیکن رات کے وقت مرحوم کے رشتے داروں کو آگاہ کیا۔

گھڑی چونکہ بہت قیمتی تھی، اس لیے انھوں نے کہا کہ صبح

قبر کھود کر گھڑی نکال لی جائے گی۔ کچھ تردد کے بعد میں بھی راضی ہو گیا۔ چناں چہ قبر کھودی گئی، تو وہاں ایسا بھیانک منظر نظر آیا جو آج بھی میری نگاہوں سے نہیں ہٹتا۔ جنرل صاحب قبر میں نیم اکڑوں حالت میں بیٹھے تھے۔ ان کا منہ خوف ناک انداز میں کھلا ہوا تھا۔ کہنیوں سے خون بہہ رہا تھا۔ سینے اور ہاتھ پاؤں پر نیلے نیلے نشان تھے۔ ہم نے گزشتہ دن چار بجے شام کے قریب انھیں دفن کیا تھا اور یہ اگلے دن صبح نو بجے کا وقت تھا، یعنی تدفین کو سولہ سترہ گھنٹے سے زیادہ نہیں گزرے تھے۔ اتنی سی دیر میں ان کی لاش کا یہ حشر دیکھ کر ہم سب پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ گھڑی اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ آج بھی وہ ہیبت ناک منظر میری نگاہوں کے سامنے گھومتا رہتا ہے۔

میں نے اس واقعے کا ذکر اپنی استانی سے کیا اور ان سے پوچھا کہ یہ جنرل صاحب تو خیراتی کاموں میں بہت حصہ لیا کرتے تھے، اس کے باوجود ان کے ساتھ ایسا معاملہ کیوں ہوا؟ استانی نے کہا "کوئی شخص بھی کسی دوسرے کے اندرونی حالات سے باخبر نہیں ہو سکتا۔ اگر خیراتی کاموں میں اخلاص نہ ہو، بلکہ وہ شہرت اور نام و نمود کے لیے کیے جائیں، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کی کوئی قیمت نہیں۔"

اس واقعے کے بعد ہر وقت اپنی قبر نگاہوں کے سامنے رہنے لگی۔ میں زیادہ اہتمام کے ساتھ اپنے حالات درست کرنے کی فکر کرنے لگا۔ بالآخر فیصلہ کیا، غیر مسلم والد کے ساتھ رہنے کے بجائے اپنا کوئی ذریعہ معاش تلاش کروں۔ چناں چہ میں آسٹریلیا چلا آیا جس کی قومیت مجھے ماں کے توسط سے حاصل ہو چکی تھی۔

شروع کا زمانہ میں نے بڑی غربت میں گزارا اور سڑکوں پر چھوٹے چھوٹے کام کر کے پیٹ بھرا۔ (جس وقت رضوان صاحب یہ واقعہ سنا رہے تھے، ان کے ساتھ ایک اور انڈونیشی مسلمان بیٹھا تھا۔ ان کی طرف اشارہ کر کے رضوان صاحب نے کہا، ان سے پوچھیے، یہ میرے تب کے دوست ہیں۔ ان صاحب نے تصدیق کی اور بتایا کہ واقعی یہ اس وقت بڑی غربت کی حالت میں آسٹریلیا میں رہ رہے تھے)

میں نے اپنی پچھلی زندگی سے دو سبق حاصل کیے، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ سے مضبوط تعلق قائم رکھو اور اس کے احکام پر عمل کرو۔ دوسرے جو کام کیا جائے، اخلاص اور محبت کے ساتھ ہونا چاہیے۔ انھی دو اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے میں اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتا اور کثرت سے ذکر کرتا۔ اپنی قبر ہر وقت میرے سامنے رہتی۔ یہاں تک کہ میرے رزق کے دروازے کھلتے چلے گئے اور الحمدللہ آج میں متعدد فیکٹریوں کا مالک ہوں۔

رضوان صاحب نے یہ طویل داستان ختم کی، تو حاضرین میں سے ان حضرات نے جو انھیں مدت سے جانتے تھے، یہ بتایا کہ اس سے پہلے انھیں بھی اس پورے واقعے کا علم نہیں تھا۔ آج پہلی بار انھوں نے یہ واقعات تفصیل کے ساتھ سنائے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ رضوان صاحب انڈونیشیا کے ایک سابق صدر کے سسرالی رشتے دار ہیں۔ (انھوں نے اس وقت اپنا صحیح رشتہ بھی بتایا تھا جو اب مجھے یاد نہیں رہا)

ان کی اس داستان میں بعض پہلو عجیب ضرور ہیں، لیکن مجھے ان کی شخصیت میں غلط بیانی یا مبالغہ آمیزی کا کوئی امکان نظر نہیں آیا۔ احباب نے بتایا کہ رضوان صاحب اس وقت مسلمانوں کے اجتماعی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ وایونگ کی ایک اور خوبصورت مسجد میں ہم نے عشا کی نماز پڑھی، وہ بھی انھی کی تعمیر کردہ ہے۔ اس کا نام انھوں نے مسجد القہار اس لیے رکھا کہ ان کی استانی جن کی بدولت انھیں اسلام کی دولت نصیب ہوئی، انڈونیشیا میں جس مدرسے میں پڑھاتی تھی، اس کا نام القہار تھا۔ انھوں نے ایک اور مصلیٰ اپنی فیکٹری کے ساتھ بنایا ہوا ہے، وہاں بھی پنج وقتہ نماز ادا ہوتی ہے۔ اگلی صبح ہم نے نماز فجر اسی مصلیٰ میں ادا کی اور اللہ پاک کا شکر بجا لائے۔

◆◆●

جولائی ۱۹۸۷ء، کو سری لنکا کے صدارتی محل میں بحریہ کے

۳۰ وزیر اعظم راجیو گاندھی کے اعزاز میں چوکس چوبند گارڈ تیار کھڑے تھے۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریہ ہونے کے دعوے دار بھارت کے "پردھان منتری" کا ایک چھوٹے پڑوسی ملک سری لنکا کا یہ دورہ غیر معمولی اہمیت اختیار کر چکا تھا۔ ایل ٹی ٹی ای کے خاتمے کے لیے بھارت، سری لنکا حکومتوں کے درمیان معاہدے کے بعد بھارتی افواج سری لنکا کی سرزمین پہ تعیناتی اور انسداد دہشت گردی کے آپریشنز کرنے کا اختیار حاصل کر چکی تھیں۔ اس دورے کے ذریعے خطے میں بھارت کے منی سپر پاور بننے کا بھرپور تاثر پڑوسی ممالک کو دیا جا رہا تھا۔ اور یہی اس دورے کا اہم ترین پہلو تھا۔

پریڈ انچارج نے رسمی کارروائی مکمل کرتے ہوئے بھارتی وزیر اعظم کو گارڈ کے معائنے کی دعوت دی۔ وزیر اعظم راجیو گاندھی تکبر اور رعونت کے ملے جلے احساسات کا مجموعہ بنے گارڈ کے معائنے میں معروف تھے کہ وہ کچھ ہو گیا جو شاید کسی غیر ملکی سربراہ کے رسمی دورے میں نہیں ہوا۔ پہلی صف میں سلامی دینے کے لیے تعینات سری لنکن بحریہ کے سیلر وجے منی ڈی سلوا نے اپنی رائفل کے بٹ سے راجیو گاندھی پر وار

برصغیر ہندو شدت پسندی کے نرغے میں

بھارتی سرکار کا جنگی جنون نئے گل کھلانے لگا

عبداللہ مصطفوی

کیا۔ راجیو گاندھی جھکائی دے گئے تاہم رائفل کا بٹ ان کے سر کے عقبی حصے کو چھوتا ہوا کندھے پر پڑا۔ یہ ایک غیرت مند سری لنکن کا احتجاج تھا۔

بھارت کے خطے میں توسیع پسندانہ عزائم کے خلاف احتجاج کرنے پر وجے منی ڈی سلوا نے محکمہ جاتی کارروائی اور کورٹ مارشل کے بعد چھے سال قید کی سزا پائی۔ ڈھائی سال قید کے بعد سری لنکن صدر نے اُسے خصوصی معافی دے دی۔ اپنا کاروبار شروع کرنے کے علاوہ وجے منی ڈی سلوا نے انتخابات میں حصہ لیا اور سری لنکن پارلیمنٹ کا رکن بھی منتخب ہوا۔ سری لنکا، بھارت معاہدے کے خلاف اُن دنوں پورے سری لنکا میں غصہ پل رہا تھا۔ سری لنکن عوام اور ایل ٹی ٹی ای کے حمایتی اس حقیقت سے واقف تھے کہ تامل گوریلوں کی پشت پناہی بھارت نے کی تھی۔ اس دہشت گردی کو بنیاد بنا کر سری لنکا میں بھارتی سینا کی تعیناتی درحقیقت خطے میں عسکری بالادستی اور چھوٹے ممالک کو دبا کر رکھنے کی پالیسی کا تسلسل تھا۔ اسی پالیسی پر عمل درآمد کر کے بھارت نے مشرقی پاکستان میں بھی مکتی باہنی کے ذریعے دہشت گردوں کا جال پھیلایا۔ مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگے، نسلی اور لسانی تعصبات کو ہوا دی۔ پاکستان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُسے غیر مستحکم بھی کیا اور بالآخر مشرقی پاکستان میں فوجی در اندازی کر کے تعصب، تشدد اور درندگی کی بنیاد پر بنگلہ دیش قائم کرا دیا۔

بنگالیوں کو نجات دلانے والی مکتی باہنی کا اصل پر تشدد چہرہ بھی کچھ عرصے بعد سامنے آ گیا۔ بنگلہ بندھو، شیخ مجیب ایک فوجی بغاوت کے نتیجے میں 'آزاد بنگلہ دیش' میں بنگالی فوج کے ہاتھوں اپنے اہل خانہ سمیت قتل ہو گئے۔ اُن کی صاحبزادی حسینہ واجد بیرون ملک ہونے کی وجہ سے بچ رہیں۔ اصل موضوع خطے میں بھارت کی تشدد پسندانہ روش ہے۔ سقوط مشرقی پاکستان پہ ہی موقوف نہیں، بھارتی جنونیت کا شکار سکھ بھی بنے۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں مشرقی پنجاب میں ابھرنے والی خالصتان تحریک کو

نعت شریف

کون آیا تھا، کس کا ہوا پھیرا مرے گھر میں
خوشبو نے لگا رکھا ہے ڈیرہ مرے گھر میں

ذکر شہہ کونین کی خوشبو سے معطر
ہر شام اترتا ہے سویرا مرے گھر میں

جاری جو ہوئی نعت نبیؐ مری زبان پر
روشن ہو جاتا ہے اندھیرا مرے گھر میں

کانٹے کی طرح دل سے نکالا تجھے دنیا
اب ذکر بھی ہوتا نہیں تیرا مرے گھر میں

سرسبز جسے رکھتی ہیں طیبہ کی ہوائیں
لہراتا ہے اک پیڑ گھنیرا مرے گھر میں

اس بات پر اتراتا ہوا پھرتا ہوں آقا
سب آپؐ کا ہے، کچھ نہیں مرا گھر میں

دیوار پہ لکھا تھا کہیں نام محمدؐ
اب تک ہے اجالوں کا بسیرا مرے گھر میں

(سلیم کوثر)

کچلنے کے لیے گاندھی جی کے عدم تشدد کے فلسفے کو فوجی بوٹوں تلے روندتے ہوئے بھارتی افواج نے ظلم و ستم کی ایک نئی تاریخ برصغیر میں رقم کی۔ ہزاروں سکھ نوجوان قتل ہوئے اور کئی لاپتا ہونے والوں کا سراغ نہ ملا۔ سکھوں کا مقدس مذہبی مقام ''گولڈن ٹیمپل'' آپریشن بلیو اسٹار کے نتیجے میں خون سے نہا گیا۔ ہندو شدت پسندی کے ہتھیار نے گزشتہ ۶ دہائیوں سے برصغیر کے جسم پہ کئی کاری زخم لگائے۔ وادی کشمیر جنت نظیر میں بھارتی جارحیت اور ریاستی تشدد کون انصاف پسند نظرانداز کر

سکتا ہے۔ قتلِ عام، ریاستی تشدد، نسل کشی، عصمت دری یہ ہے دنیا کی سب سے بڑی سیکولر جمہوریہ کا تحفہ، برصغیر کے لیے۔

مذہبی منافرت، نسلی تعصب اور ریاستی طاقت کا اندھا استعمال جب ریاستوں کی پالیسی بن جائیں، تو کئی نسلیں اس کا خمیازہ بھگتتی ہیں۔ محکوم رعایا اور کمزور پڑوسی بھی اس آگ میں جلتے ہیں اور آگ کو ہوا دینے والے بھی ردعمل کا شکار ہوتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں خون کی ہولی کھیلنے، کشمیری ماؤں کی گود اجاڑنے اور گولڈن ٹیمپل کی بے حرمتی کرنے والی وزیراعظم اندرا گاندھی اپنے ہی ۲ سکھ باڈی گارڈز کی گولیوں کا نشانہ بنیں۔

انتہائی قابلِ اعتماد بینت سنگھ ۱۰ برس سے زائد عرصے تک اندرا گاندھی کا ذاتی باڈی گارڈ رہا ہے جبکہ اکیس سالہ ستونت سنگھ چھے ماہ قبل وزیراعظم اندرا گاندھی کے ذاتی گارڈ کے طور پہ تعینات ہوا تھا۔ دونوں نے تیس گولیاں انتہائی قریب سے اندرا گاندھی پر چلائیں۔ تینتیس گولیاں بدن سے آرپار ہوگئیں اور سات جسم کے اندر رہیں۔ یہ ردعمل تھا اُن سکھوں کا جن کی روحیں بھارت کے ریاستی تشدد سے زخمی ہوئی تھیں۔ بھارتی دانشور اور پالیسی ساز اگر اس واقعے سے سبق سیکھتے، تو وہ جے می ڈی سلوا کی رائفل کا بٹ بھارتی توسیع پسندی کے ردعمل میں راجیو گاندھی پہ کبھی نہ اٹھتا۔ یہی راجیو گاندھی ۱۹۹۱ء کو ایک خاتون کے خودکش حملے کا شکار بنے اور اس کا الزام تامل تنظیم ایل ٹی ٹی ای پر عائد کیا گیا۔

بھارت کے سیاسی وجود میں تعصب، تشدد، طبقاتی تفریق، ذات پات اور توہم پرستی کے زہریلے اثرات صدیوں پرانے ہیں۔ اسی ہندو جنونیت کا ردعمل قیامِ پاکستان کی صورت میں سامنے آیا۔ ہندو شدت پسندی کا عفریت عدم تشدد کے پرچارک گاندھی جی کو بھی نگل گیا۔

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو نتھو رام گوڈسے نے انھیں پاکستان کا حمایتی قرار دیتے ہوئے قتل کر دیا۔ نتھو رام آر ایس ایس کا کارکن تھا۔ جی ہاں وہی آر ایس ایس جس کا بنیادی کارکن نریندر مودی بھی ہے۔ بی جے پی کی بغل بچہ تنظیموں کے ہاتھوں بابری مسجد کا انہدام ہوا۔ ۲۰۰۲ء میں نریندر مودی کے زیرِانتظام احمد آباد اور گجرات میں ۲۰۰۰ سے زائد مسلمانوں کے قتل، عصمت دری اور زندہ جلانے جیسے بدترین تشدد کے واقعات، سیکولر بھارت میں ہندو مذہبی شدت پسندی کے غیر معمولی پھیلاؤ کا تاریخی تسلسل ہیں۔ حال میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی جبری مذہبی تبدیلی اور عیسائی گرجا گھروں پر حملے اچانک رونما نہیں ہوئے۔ سیکولر ہونے کے دعوے دار کانگریس کے ہاتھوں لہولہو برصغیر کو اب علی الاعلان ہندو شدت پسندی کے پرچارک مودی، بی جے پی اور آر ایس ایس کے ہاتھوں کیا کچھ سہنا پڑے گا؟

اجیت دول نے بھارت کی اصل پالیسی کا اعلان کر دیا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے آج تک پاکستان بھارتی جارحانہ عسکری عزائم کے ردعمل میں ایک مضبوط دفاعی فوج قائم رکھے ہوئے ہے۔ روایتی ہتھیاروں کی دوڑ کے ساتھ بھارت برصغیر کو نیوکلیئر فلیش پوائنٹ میں تبدیل کر چکا ہے۔

کشمیریوں کی پانچ نسلوں کو جبر، خوف، ریاستی تشدد کے ساتھ ساتھ عسکریت پسندی کی آگ میں جھونکنے والا بھارت اب ٹی ٹی پی اور آئی ایس آئی ایس کے ساتھ روابط قائم کر چکا۔ پاکستان میں جہادی تنظیموں اور لشکروں کی جڑیں افغان جنگ سے کہیں پہلے مقبوضہ کشمیر میں بھارتی ریاستی تشدد سے بھی جڑی ہیں۔ پاک فوج کے پالیسی ساز اذہان ہمیشہ سے بھارت کے خلاف سنگین تحفظات رکھتے ہیں۔ یہ تحفظات بے حد شدید اور منطقی ہیں۔ پاک بھارت جنگیں، مشرقی پاکستان میں بھارتی دراندازی، چین بھارت جنگ، ہتھیاروں کی دوڑ اور جارحانہ ایٹمی پالیسی جیسے اقدامات کو تاریخی ہندو شدت پسندی سے جوڑا جائے، تو پاکستان بھارتی عسکری جارحیت کا ہدفِ اوّل ثابت ہوتا ہے۔

افغانستان میں روسی جارحیت کے بعد امریکا نے پاکستان کے ذریعے افغانستان میں جہادی گروپوں کو منظم کیا جبکہ

پاکستان نے مستقل بھارتی خطرات کے پیش نظر امریکی تعاون سے پاک فوج کو روایتی دفاعی جنگ کے لیے منظم کیا۔ ہندو جنونیت سے لہولہو برصغیر ۲۰۰۷ء کی دہائی میں تین عالمی طاقتوں کی آمد کے بعد آج پہلے سے کہیں زیادہ غیر مستحکم، غیر محفوظ اور زخمی ہو چکا ہے۔ پاکستان، افغانستان اور کشمیر میں عسکریت پسندی اور شدت پسندی کے اسباب ہندو جنونیت، روسی توسیع پسندی اور امریکی مداخلت کی پیداوار ہیں۔ پاکستان میں شدت پسندی اور دہشت گردی کی آگ لگانے کی بھارتی پالیسی پورے خطے کو عدم استحکام کا شکار کر دے گی۔

روس کے خلاف افغانستان کی سرزمین پر امریکی مفادات کی جنگ نے پاکستان اور افغانستان کو کئی عشرے پیچھے دھکیل دیا ہے۔ بھارت آج چین کی دفاعی طاقت کے خلاف ہونے والی نئی امریکی صف بندی میں فطری حلیف بن کر ابھر رہا ہے۔ ہندو شدت پسندی اور امریکی حکمت عملی کا ملاپ اس خطے میں پہلے سے موجود عسکریت پسندی کی آگ پر تیل چھڑکنے کے مترادف ہے۔ بھارت کے انصاف پسند دانشور اس حقیقت کا ادراک نہ کر سکے اور مودی سرکار اسی رفتار سے آگ اور خون کا کھیل کھیلتی رہی، تو یہ بدقسمت برصغیر کی لہو رنگ تاریخ کا بدترین باب ہوگا۔

یہ آگ پاکستان اور افغانستان تک محدود نہیں رہ سکے گی۔ گاندھی، شیخ مجیب الرحمان، اندرا گاندھی، راجیو گاندھی، جنرل ضیا اور سی۔۱۳۰ میں ان کے ہم سفروں کی موت برصغیر کی المناک تاریخ کے اس ناقابل تردید پہلو کو ظاہر کرتے ہیں کہ شدت پسندی اور عسکریت پسندی بالآخر اپنے گھر کو بھی پھونک ڈالتی ہے۔ غربت، افلاس، بنیادی سہولیات کا فقدان، مذہبی شدت پسندی اور عدم برداشت جیسے مسائل پاکستان اور بھارت کی عوام کو نگل رہے ہیں۔ بھارت سرکار کا جنگی جنون اور پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کی پالیسی بالآخر بھارت کو بھی اپنی لپیٹ میں لے گی۔ تاریخ کا سبق یہی ہے۔

آسام، ناگالینڈ، میزورام میں پہلے سے موجود علیحدگی پسند تحریکیں، مسلم اور عیسائی اقلیتوں پر جبر و تشدد، بیس کروڑ مسلمانوں پر سیاسی و سماجی ظلم اور وادیٔ کشمیر کی تحریک آزادی کے شعلے بالآخر سیکولرازم کے کمزور غلاف کو اپنی لپیٹ میں لے کر راکھ کر دیں گے۔ اگر بھارت مستقبل میں مذہبی شدت پسندوں اور عسکری جتھوں کا گڑھ بن جائے، تو کسی صاحب بصیرت کو تعجب نہ ہوگا۔ نوشتۂ دیوار واضح نظر آ رہا ہے۔

◆◆◆

اچھا وکیل قائد کی نظر میں

کچھ نوجوان ڈیرہ دون سے بیرسٹر محمد علی جناح کی بلاغت اور قابلیت کا سن کر ملاقات کرنے آئے۔ وقت نہیں لیا تھا۔ سیکرٹری نے کہا، آپ جو پوچھنا چاہتے ہیں، مجھے لکھ کر دیں لیکن وہ ملاقات پر اصرار کرنے لگے۔ اتنے میں قائداعظم باہر سے آئے۔ نوجوانوں نے سلام کیا اور پہلا سوال رہبر ملت سے یہ کیا، آپ اپنے کو قائداعظم کیوں کہتے ہیں؟ آپ کو اسلام کی خدمت کرنی چاہیے؟

قائداعظم محمد علی جناحؒ نے جواب دیا، میں کب اپنے آپ کہتا ہوں۔ لوگ خود مجھے کہتے ہیں۔ جہاں تک میری خدمت کا تعلق ہے، میں اس قوم کا وکیل ہوں۔ وکیل کیسا ہونا چاہیے۔ قائداعظم نے پھر نوجوانوں کو بتایا، وکیل میں تین خوبیاں ہونی چاہئیں:

۱۔ اپنے موکل سے فیس مناسب لے زیادہ نہ لے۔
۲۔ کیس اچھی طرح تیار کرے اور خوب محنت کرے۔
۳۔ کسی عدالت میں جج سے مرعوب نہ ہو۔

میں ہندوستان کے مسلمانوں اور مسلم قوم کا کیس لڑ رہا ہوں۔ اگر مجھ سے کوئی اچھا وکیل نظر آتا ہے تو اسے چن لو ورنہ میں اپنا اخلاقی فرض پورا کروں گا۔

(آفتاب احمد، چند یادیں، ص ۱۶)

انسانی جدوجہد کے استعارے

ستارے جو غربت میں چمکے

محنت وذہانت کے بل بوتے پر عزت و شہرت پانے والی شخصیات کا سبق آموز تذکرہ

غلام حسین میمن

عظیم شخصیات کے بارے میں عموماً یہ غلط فہمی رہتی ہے کہ وہ منہ میں سونے کا نوالہ لے کر پیدا ہوتے ہیں، جبکہ حقیقت برعکس ہے۔ بڑا آدمی بننے کے لیے خلوص دل سے کی گئی محنت اور نیت کا صاف ہونا ضروری ہے۔ دنیا میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں کہ مرد وزن نے غربت سے اپنا سفر شروع کیا اور محنت کی بدولت منزل مقصود تک پہنچ گئے۔ ایسی ہی چند شخصیات کا تذکرہ درج ذیل ہے۔

سقراط

قبل مسیح کے زمانے میں یونان کا بڑا فلسفی سقراط گزرا ہے، جسے زہر کا پیالہ پینے کو دیا گیا۔ اس پر الزام تھا کہ وہ ایتھنز کے نوجوانوں کو گمراہ کرتا ہے۔ وہ ایک سنگ تراش (پتھر تراشنے والے) کا بیٹا تھا۔ اس نے باپ کا پیشہ اختیار کرنے کے بجائے علم اخلاق اور تحقیق حق کو ترجیح دی۔ اپنا علم آگے تک منتقل کرنے میں اس نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ وہ اپنے عقیدت مندوں

اور شاگردوں سے بھی کوئی نذرانہ، فیس یا امداد وصول نہ کرتا۔
ساٹھ سال کی عمر میں وہ سینٹ کا رکن منتخب ہوا، تو اس نے اس عزم کا اظہار کیا:
"میں ہزار بیماریوں کو تو سہ سکتا ہوں، لیکن دوسرے شخص کے لیے بے انصافی ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔"

موت کے وقت اس نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا "میں نے اپنی تمام عمر میں کوئی گناہ نہیں کیا۔ اب تک میری عمر نہایت اطمینان سے گزری ہے اور میں لگاتار اخلاقی ترقی کرتا رہا ہوں۔ لوگوں کو بھی اخلاقی تعلیم دی۔ تمام لوگ میری عزت کرتے ہیں۔ ممکن ہے میری موت کی وجہ سے میری عزت پہلے سے بڑھ جائے۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ اس کے لائق شاگرد افلاطون نے کہا "یہ دنیا میں سب سے عقلمند، منصف اور نیک شخص تھا۔" سقراط نے ۷۱ سال کی عمر پائی۔ اور ۳۹۹ قبل مسیح میں زہر پی کر چل بسا۔

قطب الدین ایبک

برصغیر کا پہلا مسلمان بادشاہ جس نے دہلی میں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی ... اسے غلام کی حیثیت سے نیشاپور لایا گیا تھا۔ قاضی فخر الدین نے اسے خرید کر شاہ افغان، سلطان شہاب الدین غوری کی خدمت میں پیش کیا۔ غلام کی ایک چھنگلی (ہاتھ کی چھوٹی انگلی) اضافی تھی، اسی لیے اس کا نام ایبک پڑ گیا۔

قطب الدین ایبک نے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا اور بادشاہ کی نظر میں اپنے لیے خاص مقام بنا لیا۔ جلد ہی اسے فوج کا سپہ سالار بنا دیا گیا۔ سلطان نے اسے پہلے دہلی اور پھر اجمیر فتح کرنے بھیجا۔ یہ شہر فتح ہوئے، تو اسے وہاں کا گورنر مقرر کیا گیا۔ وفاداری اور سپہ گری کی صلاحیتوں کی بنا پر سلطان نے بعد ازاں اسے اپنا فرزند بنا لیا۔

سلطان شہاب الدین غوری کی وفات کے بعد جون ۱۲۰۱ء میں قطب الدین نے لاہور میں اپنی تخت نشینی کا اعلان کیا۔ اپنی فیاضی کی وجہ سے تاریخ میں اسے "لکھ بخش" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ نومبر ۱۲۱۰ء میں قطب الدین ایبک کا پولو کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر انتقال ہوا۔ اس کا مقبرہ انارکلی، لاہور میں واقع ہے۔

جابر بن حیان

اس مشہور عرب کیمیادان کے والد دوا ساز تھے۔ لیکن اس نے اپنی زندگی کو کیمیائی تحقیقات کے لیے وقف کیے رکھا۔ مسلمان سائنس دانوں کی فہرست میں اس کا نام بہت نمایاں ہے۔ وہ اس نظریے کا حامی تھا کہ بنیادی دھاتیں جن میں ٹین، سکہ، لوہا اور تانبا شامل ہیں، ایک پوشیدہ عنصر کی مدد سے سونے چاندی میں منتقل ہو سکتی ہیں۔ اس عنصر کی تلاش میں اس نے کئی کیمیاوی تجربے کیے مگر دریافت نہ کر سکا۔ البتہ کئی دوسرے مفید مرکب ضرور معلوم کر لیے۔ اس کا اہم کارنامہ شورے اور گندھک کے تیزابوں کی دریافت ہے۔ اس نے سو سے زائد کتابیں تحریر کیں۔ وہ تاعمر عباسی خلیفہ ہارون رشید کے دربار سے وابستہ رہا۔ اس کا زمانہ ۷۲۲ء تا ۸۱۵ء تک کا ہے۔ کوفہ میں انتقال کر گیا۔

اڑن تختہ

جاپان میں کاریں بنانے والی مشہور کمپنی لیکسس نے ایک انقلابی ایجاد کا اعلان کیا ہے۔ یہ کوئی عالی شان گاڑی نہیں بلکہ ایسا تختہ ہے جو زمین سے چند سینٹی میٹر بلند ہو کر آگے بڑھتا ہے۔ اس "اڑن تختے" یا ہوور بورڈ کو "سلائیڈ" کا نام دیا گیا ہے۔ کمپنی کے مطابق اس میں مائع نائٹروجن سے ٹھنڈے کیے گئے سپر کنڈکٹرز اور مستقل مقناطیس لگائے گئے ہیں۔ اڑن تختے کے لیے جو خاص فرش بنایا گیا، اس میں مقناطیس چھپائے گئے ہیں، اسی لیے اس کو ہر جگہ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم کمپنی اس اڑن تختے کے لیے مخصوص مقناطیسی سکیٹ پارک تعمیر کرے گی۔

صدیق سالک

پاک فوج کے اعلیٰ افسر اور ادیب۔ بریگیڈیئر صدیق سالک تین سال کی عمر میں یتیم ہوگئے تھے۔ والدہ نے محنت کر کے نہ صرف گھر سنبھالا بلکہ اپنے اکلوتے بیٹے کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا۔ ترقی کے راستے میں ان کے پاس کوئی سفارش نہیں تھی۔ البتہ تعلیم نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ وہ لکھتے ہیں "تعلیم حاصل کر کے مجھے محسوس ہوا جیسے اب میں اپنے لیے کامیابی کا ہر دروازہ اس چابی سے کھول سکتا ہوں۔"

ایم اے انگریزی کرنے کے بعد پہلے لیکچرار بنے۔ بعدازاں پاک فوج میں شمولیت اختیار کی اور ترقی کرتے کرتے بریگیڈیئر کے عہدے تک پہنچے۔ سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد وہ بھی ۹۰ ہزار جنگی قیدیوں کے ساتھ بھارت میں بہ حیثیت قیدی رہے۔ بعد میں حالت اسیری کی یادداشتوں پر مبنی کتاب "ہمہ یاراں دوزخ" تحریر کی۔ آپ بیتی کا نام "سلیوٹ" ہے۔ سانحہ بہاولپور ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء میں شہید ہوئے۔

احسان دانش

پاکستان کے ایک بڑے شاعر، جن کا اصل نام احسان الحق تھا۔ ۱۹۱۴ء میں مظفر نگر (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ غربت کے باعث چوتھی جماعت سے آگے نہ بڑھ سکے، مگر تعلیم کا سفر نجی طور پر جاری رکھا۔ عربی اور فارسی کی کئی کتابیں پڑھیں۔ ملازمت کی تلاش میں لاہور آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ راج مزدوری اور مالی سمیت سخت محنت والا ہر قسم کا کام کیا۔ بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ غزل اور نظم دونوں میں نام کمایا۔

کہا جاتا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے ایک بلاک کی تعمیر کے وقت انھوں نے بھی راج مزدوری کی۔ محنت اور شاعری کی بدولت ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان کی شخصیت اور شاعری پر تحقیق کرنے والے پنجاب یونیورسٹی کے ایک طالب علم کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی۔ انھیں "شاعر مزدور" بھی کہا جاتا ہے۔ "جہانِ دانش" ان کی خودنوشت سوانح ہے۔ ۱۹۸۲ء میں انتقال ہوا۔

انسان نہیں رہتا ہے تو رہتا نہیں غم بھی!
اک روز زمین اوڑھ کے سو جائیں گے ہم بھی

مائیکل فیراڈے

برطانیہ سے تعلق رکھنے والا مشہور کیمیا دان۔ ۱۷۹۱ء میں پیدا ہوا، تو غربت اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی زبان میں نقص تھا، اس لیے تعلیم بھی جاری نہ رکھ سکا۔ آخر وہ ایک جلد ساز کے ہاں ملازم ہو گیا۔ وہاں جو کتابیں جلد بندی کے لیے آتیں، فیراڈے انھیں شوق سے پڑھتا۔ اس کی دلچسپی علم کیمیا سے زیادہ تھی۔ اسی شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے مشہور سائنس دان، سر ہمفری ڈیوی کو خط لکھا کہ وہ ان کے ساتھ رہ کر کچھ سیکھنا چاہتا ہے۔ اگر ممکن ہو، تو اسے کسی چھوٹے موٹے کام پر لگا دیں۔

یوں اسے سر ہمفری کی اجازت سے سائنسی تجربہ گاہ میں کام کرنے اور سیکھنے کا موقع مل گیا۔ پہلے تو اسے صرف بوتلیں دھونے پر لگایا گیا۔ بعد میں سر ہمفری نے اس کی ذہانت دیکھ کر اپنا نائب بنا لیا اور اپنے تجربات میں اسے بھی شریک کرنے لگا۔ سر ہمفری کے انتقال کے بعد یہ کیمیا کا استاد بن گیا۔ کئی سائنسی دریافتیں اور ایجادات کیں اور برقی کیمیا پر کئی کتابیں لکھیں۔ ۱۸۶۷ء میں چل بسا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی کی تحقیق سے یہ ممکن ہوا کہ بجلی کو عملی طور پر کام میں لایا جا سکے۔

کرسٹوفر کولمبس

اٹلی سے تعلق رکھنے والا مہم جو۔ وہ ہندوستان آنے کے لیے بحری راستہ تلاش کرتا ہوا اتفاقاً امریکا کی دریافت کا موجب بن گیا۔ ۱۴۵۱ء میں ایک جولاہے (کپڑا بننے والے) کے گھر پیدا ہوا۔ اپنی محنت اور لیاقت کے سبب اس نے اپنا نام تاریخ میں روشن کیا۔ بحری ملازمتوں کے سبب وہ نوجوانی میں اچھا ملاح بن گیا۔ اسپین کے بادشاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازابیلا کی اجازت سے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت

کرنے نکلا اور امریکا کی دریافت کا سہرا اپنے سر پر سجا لیا۔
۱۵۰۶ء میں دارفانی سے رخصت ہوا۔

ابراہام لنکن

امریکا کے سولھویں صدر ابراہام لنکن نے ۱۸۰۹ء میں غریب گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ابتدا میں اسٹور کیپر اور ڈاکیے کی ملازمتیں کیں۔ بعد میں فوج میں شمولیت اختیار کر لی۔ ساتھ ہی قانون کا امتحان بھی پاس کیا۔ پھر ملازمت چھوڑ کر وکالت اور سیاست میں بھی حصہ لیا۔ ۱۸۳۴ء تا ۱۸۴۶ء کانگریس کے رکن رہے۔ ۱۸۶۱ء میں امریکا کی سیاسی جماعت، ری پبلکن پارٹی کے ٹکٹ پر صدر منتخب ہوئے۔ یکم جنوری ۱۸۶۳ء کو ملک میں غلامی کا خاتمہ کردیا۔ اس پر امریکا میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ لنکن نے بڑے تدبر سے اس پر قابو پایا۔ ۱۴ اپریل ۱۸۶۵ء کو تھیٹر میں ڈراما دیکھ رہے تھے، اداکار جان ولکس بوتھ کی گولی نے ان کی زندگی کا خاتمہ کرڈالا۔

تھامس ایلوا ایڈیسن

امریکا سے تعلق رکھنے والا دنیا کا سب سے بڑا سائنس دان جس نے ایک ہزار سے زائد ایجادات کرکے انسانوں کے لیے آسانیاں پیدا کردیں۔ ۱۸۴۷ء میں غریب والدین کے گھر پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ بارہ سال کی عمر تک ریل کے ڈبوں میں کتابیں بیچنے کا کام شروع کیا۔ کچھ عرصے بعد وہیں پرنٹنگ پریس کھول لیا اور کیمیائی تجربہ گاہ بھی بنائی۔

کہتے ہیں کہ ایک کیمیائی تجربے کے دوران ریل کے ڈبے میں آگ بھڑک اٹھی۔ ٹکٹ چیکر نے غصے میں آکر اسے ایسا زوردار تھپڑ رسید کیا کہ وہ عمر بھر کے لیے ایک کان کی حس سماعت سے محروم ہوگیا۔ سائنسی ایجادات کا ساتھ اس نے پھر بھی نہ چھوڑا۔ بلب، ٹیلی گراف، فونوگراف (جس نے گراموفون کی شکل اختیار کی) میگافون اور سینما مشین سمیت بے شمار ایجادات کا سہرا اس کے سر ہے۔ ۱۹۱۵ء میں اسے نوبل انعام ملا۔ ۱۹۳۱ء میں یہ عظیم سائنس دان چل بسا۔

ہوچی منہ

ویتنام کے عظیم راہنما ہوچی منہ ۱۸۹۰ء میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں فرانسیسی بحری جہاز پر بیرے کی حیثیت سے ملازم رہے۔ بعد میں لندن چلے گئے اور چھوٹی موٹی ملازمتیں کیں۔ ۱۹۱۷ء میں فرانس پہنچے۔ ان کے ملک پر فرانسیسیوں کا قبضہ تھا، اس لیے واپس آکر انھوں نے آزادی کی تحریک میں بھرپور حصہ لیا اور گوریلا جنگ کا حصہ بنے۔ ۱۹۵۴ء میں ویتنام کو آزادی ملی، تو وہ اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۹ء میں دنیا سے رخصت ہوگئے۔

موٹاپے سے نجات دلانے والی بنیان

امریکا میں ایک ایسی بنیان تیار کی گئی ہے جس کو زیب تن کرنے سے جسم میں موجود اضافی کیلوریز ختم ہوں گی اور آپ موٹاپے سے نجات حاصل کرکے اسمارٹ نظر آسکیں گے۔ کمپنی نے ایسی بنیان بنائی ہے جو انسانی جسم کا درجہ حرارت کم کردے گی۔ دوسرے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ انسانی جسم کے میٹابولک سسٹم کو ہیک کرے گی اور کیلوریز کے جلنے کا عمل تیز ہوجائے گا۔ کمپنی نے اسے "تھن آکس" کا نام دیا ہے جسے پہننے کے بعد چند سیکنڈ تک درجہ حرارت میں کمی کی وجہ سے ٹھنڈک محسوس ہوگی لیکن اس کے بعد جسم کا درجہ حرارت معمول پر آجائے گا اور کیلوریز کے جلنے کا عمل شروع ہوگا۔ تاہم اگر کوئی شخص زیادہ دیر تک ٹھنڈک محسوس کرے، تو اسے اسمارٹ فون میں دیے گئے ایپ سے بھی ایڈجسٹ کرسکتا ہے۔ اس کی مدد سے ایک دن میں ۵۰۰ سے ایک ہزار تک کیلوریز کو جلایا جاسکتا ہے۔ اس بنیان کی قیمت صرف ۹۹ ڈالر ہے۔

چائے والے سے آئی جی بننے تک

ایک جوہرِ قابل کی سبق آموز رودادِ زندگی

سردار محمد چودھری

ٹوبہ ٹیک سنگھ کسی افسانے نہیں ایک حقیقت کا نام ہے۔ اس کا نام نامی ایک نہایت ہی نیک سیرت انسان، ٹیک سنگھ کے نام پر رکھا گیا۔ سنا ہے وہ اس بیابان میں پانی کا ایک ٹوبہ بنا کر صرف اس لیے بیٹھا تھا کہ جھنگ، کمالیہ، شورکوٹ، ملتان وغیرہ سے آنے جانے والے یا بھولے بھٹکے انسانوں اور حیوانوں کی زیست کا سامان اس بے آب و گیاہ بیابان میں کرے جو چاروں طرف سے تقریباً برابر مسافت پر واقع اور بعد میں نہری نظام آنے پر ایک اہم قصبہ منڈی بننے والا تھا۔ نہریں کھدنے سے پہلے یہ تمام علاقہ بے آباد جنگل اور صحرا تھا۔ یہاں کوئی نہ بستا۔ بسا تو صرف ایک ٹیک سنگھ کہ مخلوق خدا کو پانی پلا سکے۔ سنا ہے شیر چیتے بھی اس کے ہاں سے پانی پیتے تھے اور اسے پیار کرتے۔

جب ہمارا خاندان ادھر ادھر دھکے کھا کر ٹوبہ ٹیک سنگھ پہنچا، تو تقسیم ہند ہوئے دو سال ہو چکے تھے اور پہلے آنے

والے مہاجروں نے تمام زرعی اراضی الاٹ کرالی تھی۔ شہر میں کوئی جگہ تھی نہ گاؤں میں۔ دیر سے پہنچنے والوں کے ساتھ ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ والد صاحب نے زمین الاٹ کرانے کے لیے بہت پاپڑ بیلے مگر کوئی بات نہ بنی۔

زندہ رہنے کے لیے کچھ تو کرنا تھا۔ آخر فیصلہ کیا کہ ایک کلہاڑی خرید کر لکڑیاں پھاڑنے کی مزدوری کا کام شروع کرتے ہیں۔ ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ٹوبہ تحصیل میں چپراسی کی ایک اسامی نکل آئی اور خوش قسمتی سے والد صاحب کو وہاں رکھ لیا گیا۔ ان کی ڈیوٹی ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ایس۔ ڈی۔ ایم (سب ڈویژنل مجسٹریٹ) کے ساتھ لگا دی گئی۔ ایس۔ ڈی۔ ایم کی کچہری اور کوٹھی کے ساتھ ہی ایک کمرے کا کوارٹر ہمیں مل گیا اور ہم سب وہاں رہنے لگے۔ یوں بنیادی رزق روٹی کا اللہ تعالیٰ نے بندوبست فرما دیا۔

ہماری والدہ اب تمام بچھڑے عزیز و اقارب کی مختلف طریقوں سے تلاش کرنے لگیں اور ہر آنے جانے والوں سے ہر کسی کا کرید کرید کر پوچھتیں۔ مجھ سے چٹھیاں لکھواتیں اور ایک کا دوسرے سے پتا کرواتیں۔ یوں ہمارا چھوٹا سا کوارٹر عزیز و اقارب اور بچھڑے واقف کاروں کا ہیڈ کوارٹر بن گیا۔ اس وقت جبکہ ایک کاغذ ملنا محال تھا، مجھے ایک بہت بڑا رجسٹر دیا گیا جس پر میں مختلف بچھڑے ہوؤں کے کوائف اور پتے درج کرتا تھا۔ یوں مجھے بچپن ہی سے ایک طرح کی مردم شماری کی تربیت ملنا شروع ہو گئی۔

ظاہری طور پر اس بے معنی مگر لگن سے بھرپور سرگرمی کے چند ہی عمدہ نتائج برآمد ہونا شروع ہو گئے۔ میرے ماموں اور ممانی گرچہ گجرات چلے گئے تھے مگر ممانی کے والد پتا نہیں کیسے اور کس طرح خانیوال پہنچ گئے اور ان کا باقی سارا خاندان سرگودھا۔ ان سب کا مل جانا صرف ہماری والدہ کی کاوش ہی سے ممکن ہوا۔ اسی طرح ہمارے گاؤں کا رمضان نامی ایک لڑکا ہجرت کے دوران اپنے ماں باپ سے بچھڑ گیا اور کسی بھلے انسان کی مدد سے گوجرہ جا پہنچا۔

مصنف

پنجاب کے سابق آئی جی پولیس، سردار محمد چودھری ۱۹۲۷ء میں ضلع ہوشیارپور (بھارت) کے گاؤں کوٹھیرہ جسووالاں میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد والدین کے ساتھ پاکستان چلے آئے۔ آپ نے لڑکپن ٹوبہ ٹیک سنگھ میں گزارا۔ زیرنظر تحریر اسی دور کی دلچسپ و سبق آموز یادوں پر مشتمل ہے۔

یہ تحریر آپ کی سوانح حیات "متاعِ فقیر" سے بشکریہ لی گئی ہے۔ سردار محمد ۱۹۶۳ء تا ۱۹۹۷ء پولیس سے وابستہ رہے۔ دیانت دار اور فرض شناس پولیس افسر کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ۲۰۰۴ء میں فوت ہوئے۔

رمضان کی ماں اپنے بچھڑے بیٹے کو مرا کر میں روتی رہی۔ ہماری ماں نے ہر ایرے غیرے سے پوچھ پوچھ اور نہایت تربیت یافتہ پولیس والوں کی طرح رمضان کا حلیہ بتا بتا کر آخر اسے ڈھونڈ ہی نکالا۔ جب رمضان کی والدہ اسے لینے ہمارے ہاں پہنچی، تو ماں اور بیٹے کے ملنے کا منظر دیکھنے والا تھا۔ ہر آنکھ پرنم اور ہر ہاتھ دعائے خیر کے لیے اٹھا ہوا تھا۔ یوں ہماری والدہ کی کاوش سے سیکڑوں بچھڑے رشتہ دار، بہن بھائی ایک دوسرے سے مل پائے۔ لیکن اس سارے عمل سے معاشی بوجھ بہت بڑھ گیا۔

ہمارے چچا اور والد کی تنخواہ مل کر بھی گزارے کے لیے کافی تھی۔ ہمارا کوارٹر آہستہ آہستہ کیمپ بن گیا تھا۔ میرے ماموں کی سخت تکلیف کے باعث ہمارے پاس آ کر صاحب فراش ہو چکے تھے۔ جگہ کم تھی اور ہر روز درجن بھر مرد عورتیں اور بچے آتے اور جاتے تھے۔ ان سب کے کھانے پینے کا بندوبست کرنا پڑتا۔

چناں چہ ہم سب بوڑھے بچے کوئی نہ کوئی کام کرنے لگے۔ میں اور میری بہن لکڑیاں اکٹھے کرتے، پانی بھر لاتے۔ میری بہن موتیے کے پھول چن کر ہار بنا دیتی اور میں بھاگ کر انھیں

ریلوے اسٹیشن پر گزرتے مسافروں کے پاس جا کر بیچ دیتا۔ اگر کوئی مسافر سامان اٹھوا لیتا تو قلی کا کام بھی کرتا اور آنہ دو آنے مزید مل جاتے۔ یوں ہم سب اس مہاجر اکھاڑ و آبادکاری میں حصہ لینے لگے جس کا اصل سہرا اور جذبہ صرف اور صرف ہماری والدہ کا تھا۔

ایک دن ایک شخص نے مجھ سے اپنا ہلکا سا بیگ اٹھانے کو کہا۔ میں اٹھا کر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہ نوبہ بازار میں پہنچ کر ایک چائے خانہ پر بیٹھ گیا اور چائے کے دو پیالوں کا آرڈر دیا۔ چائے خانہ معمولی سے لکڑی کے کھوکھے میں واقع تھا۔ مالک پتھر کے کوئلے کی انگیٹھی گرم کرنے میں مصروف تھا۔ مسافر نے مالک کو جلدی کرنے کو کہا جس کا نام بعد میں شیخ سردار محمد معلوم ہوا۔ میں نے شیخ سردار کو کہا، میں اس کی بھٹی جلاتا ہوں اور وہ جلدی سے مسافر کو چائے بنا دے۔ میں نے پنکھا چلا کر بھٹی تیز کر دی اور چائے بن گئی۔ مسافر نے مجھے بھی چائے کا کپ پلایا اور ایک ابلا ہوا انڈا کھانے کو دیا۔

میں اس عمدہ سلوک پر بہت خوش ہوا کیونکہ کبھی کوئی مسافر میرے ساتھ ایسے پیش نہیں آیا تھا۔ پھر مجھے چار آنے مزدوری دے اپنا بیگ خود ہی اٹھا کر چلا گیا۔ مجھے اس سے پہلے اتنی زیادہ مزدوری کبھی نہیں ملی تھی۔ مجھے تجسس ہوا کہ معلوم کروں یہ شخص کون ہے؟ پتا چلا کہ یہ عیسائیوں کا پادری اور لائلپور سے آیا ہے۔ اب میری بلا جانے کہ پادری کیا چیز ہوتی ہے۔ میں نے شیخ سردار سے پوچھ لیا کہ پادری کسے کہتے ہیں۔ اس نے مجھے بڑے آرام سے سمجھایا کہ جیسے ہم مسلمانوں میں مولوی ہوتے ہیں اسی طرح عیسائیوں کے ہاں پادری ہوتے ہیں۔ بیٹا تم اسے عیسائیوں کا مولوی ہی سمجھ لو۔ اور پھر کہنے لگا:

"بیٹا کیا کام کرتے ہو؟"

مصنف کی والدہ

میں نے کہا "کچھ نہیں، یونہی مزدوری کرتا ہوں۔ ریلوے اسٹیشن پر بار بیچتا ہوں۔ کوئی کہے تو قلی کا کام کر لیتا ہوں۔"

"اچھا! تم تو بڑے محنتی لڑکے معلوم ہوتے ہو۔ میری دکان پر کام کرو گے؟"

میں نے پوچھا "کس طرح کا کام؟"

"بس یہی جو آج تم نے کیا ہے، کوئلے کی بھٹی سلگانے کا! یہ خاصا مشکل کام ہے۔ یہ پتھر کے کوئلے بڑے مشکل سے جلتے ہیں۔ لیکن تم نے تو جلدی سے جلا لیے۔"

میں نے کہا "اگر اچھی تنخواہ مل جائے، تو ضرور نوکری کر لوں گا۔"

"ہاں! میں تمھیں اچھی تنخواہ دوں گا۔ پورے دس روپے ماہوار۔ مگر آنا صبح صبح پڑے گا، فجر کی نماز کے بعد۔ اس وقت لوگ چائے پینے آتے ہیں۔ اگر انگیٹھی تیار ہو، تو فوراً چائے بن جاتی ہے۔ وہ میں بنایا کروں گا اور بھٹی جلانا تمھارا کام ہوگا۔"

میں نے فوراً ہاں کر دی۔ اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ میں نے سوچا ماں بہت خوش ہوگی کہ بیٹا نوکر ہو گیا۔ مگر جب بہن نے جا کر ماں کو بتایا، تو وہ غصہ تو نہ ہوئیں مگر کہنے لگیں "تمھیں تو پڑھنا ہے۔ اس کا کیا بنے گا۔"

میں نے کہا "ابھی تو گرمیوں کی چھٹیاں ہیں۔ ابھی میں یہ نوکری کرتا ہوں۔ پھر میں اسکول میں داخل ہو جاؤں گا۔"

کیسے اور کب؟ مجھے اس وقت کچھ پتا نہ تھا۔ ویسے میری آمدنی کا ایک اور ذریعہ بھی تھا۔ بعض لوگ مجھ سے چٹھی لکھواتے تھے۔ مجھے فی چٹھی ایک پیسہ مزدوری مل جاتی۔ ان میں غریب مہاجر تھے جو اپنے بچھڑوں کی تلاش کے لیے چٹھیاں لکھواتے۔ بہت سی چٹھیاں میں مفت میں ہی لکھ دیتا۔

اب میں شیخ سردار محمد کا باقاعدہ تنخواہ دار ملازم بن گیا۔ صبح صبح پہنچ کر انگیٹھی جلاتا۔ بلکہ میں نے پتھر کے کوئلے کے ساتھ ساتھ بورے برادے سے بھر کر انگیٹھی جلانی بھی سیکھ لی۔ وہ جلانا زیادہ دشوار تھی مگر ایک دفعہ جلی، تو بہت دیر تک جلتی رہتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شیخ سردار محمد نے چائے کے ساتھ ساتھ دال روٹی کا بھی کاروبار کرلیا اور خوب کام چل پڑا۔

ایک دن ماسٹر شاہ محمد مرحوم ...... اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، ہمارے کھوکھا پر چائے پینے آئے۔ انھیں پتا چلا کہ میں پرائمری پاس ہوں بلکہ میں نے پرائمری دو دفعہ پاس کی ہے، تو کہنے لگے کہ تم ہمارے ہاں اسکول میں کیوں نہیں داخل ہوجاتے؟

میں نے کہا کہ میں پڑھنا چاہتا ہوں، مگر میرے پاس فیس کی رقم اور کتابیں کاپیاں نہیں ہیں۔ میں ایک دو ماہ اور کام کر کے پیسے کمالوں پھر اسکول داخل ہوں گا۔

شیخ سردار محمد ہماری باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ یکدم کہنے لگا "ماسٹر جی! آپ اس بچے کو ضرور اسکول میں داخل کریں۔ سارا خرچہ میں دوں گا۔ یہ بڑا برکت والا بچہ ہے۔ جب سے میرے پاس آیا ہے میرا کام چمک اٹھا اور آمدنی دگنی ہوگئی ہے۔ یہ سب اس نے کمایا۔ آپ اسے پڑھائیں، خرچہ میں دوں گا۔"

خدا شیخ سردار محمد کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ کتنا بھلا انسان تھا۔ پھر اس نے مجھے کہا "بیٹا تم صبح صبح دونوں انگیٹھیاں جلا کر اسکول چلے جایا کرو۔ چھٹی ہونے پر پھر دکان پر آجانا۔ پنکھا ہی جھلنا ہوتا ہے۔ جھلتے رہا کرو اور ساتھ کتاب پڑھتے رہا کرو۔ تمھیں پوری تنخواہ ملا کرے گی اور اسکول کا خرچہ بھی۔"

یوں میں ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی اسکول ٹوبہ ٹیک سنگھ کی پانچویں جماعت میں داخل ہوگیا۔ ایک مہینا بعد ہی میں جماعت کا مانیٹر بن گیا۔ ماسٹر غلام قادر انگریزی کے استاد تھے۔ نہایت سخت اور محنتی! میں نے تھوڑی سی انگریزی ہندوستان میں ہندو ماسٹروں سے پڑھی تھی۔ بنیاد موجود تھی، جلد ہی میں انگریزی میں سب سے اچھا طالب علم بن گیا۔ شیخ سردار کی دکان پر پڑے بعض لفافوں پر انگریزی پڑھتا رہتا اور یوں میں ماسٹر غلام قادر اور ماسٹر شاہ محمد کی آنکھ کا تارہ بن گیا۔

میں ریاضی کے مضمون میں اچھا تھا اور ہمیشہ سو فیصد نمبر لیتا۔ سالانہ امتحان ہوا، تو اول آیا۔ اسی طرح چھٹی اور ساتویں جماعت میں بھی ہر مضمون میں اول رہا۔ مزدوری بھی چلتی رہی۔ تنخواہ لیتا اور خوب پڑھتا بلکہ بعد میں تو شیخ سردار محمد نے مجھے صرف صبح کے وقت انگیٹھی سلگانے کی زحمت دی۔ باقی سارا دن میری چھٹی ہوتی اور میں خوب پڑھتا۔ یوں میں آٹھویں جماعت میں پہنچ گیا۔

گھر میں کچھ نہ کچھ کرتا رہتا اور اہل خانہ کا بھی ہاتھ بٹاتا۔ میونسپلٹی کے نلکے سے پانی بھنگ کر بھر لاتا۔ میری صحت بھی بہت اچھی ہوگئی۔ کبڈی اور والی بال بھی کھیل لیتا۔ اور ایس۔ ڈی۔ ایم کے بچوں کو بھی کھیلاتا یا ان کے ساتھ کھیلتا۔

روشنی کا سفر

آٹھویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے ہونہار طالب علم ہونے کی میری شہرت کافی پھیل چکی تھی۔ راجا محمد رفیق اور بشیر عرشی کے ساتھ میرا مستقل مقابلہ رہتا لیکن میں ہمیشہ ہر مضمون میں جیت جاتا۔ میں خوش قسمت تھا کہ ہمیں بہترین اور محنتی استاد ملے۔ اس وقت پرائیویٹ ٹیوشن کا کوئی رواج نہ تھا۔ پورے شہر میں استادوں کی بے انتہا عزت تھی۔ ہر شخص انھیں اٹھ کر ملتا اور جھک کر سلام کرتا۔ ہر استاد کی کوشش ہوتی کہ وہ بہترین شاگرد تیار کرے اور اس کا نتیجہ سب سے اعلیٰ ہو۔ انسپکٹر صاحبان ہر سال اسکول کا تفصیلی معائنہ کرتے۔ تمام استاد اپنی اپنی جماعت اور شاگردوں کو اس معائنے کے لیے دن رات محنت کر کے تیاری کراتے۔ بہترین کارکردگی ان کا سب سے بڑا فخر ہوتا تھا۔

آٹھویں جماعت میں تب ایک امتحان ہوتا جس کا نام تھا: اینگلو ورنیکولر فائنل (Agnlo-Vernacular final exam)

امتحان۔ یہ پورے پنجاب کی سطح کا امتحان ہوتا جس میں بہترین نمبر لینے والے طلبہ کو وظائف ملتے۔ ہمارے اسکول سے مجھے، راجا رفیق، بشیر عرشی، رشید اور ضیا کو منتخب کیا گیا۔ شیخ غلام قادر چھٹی کے بعد کافی دیر تک اس امتحان کی تیاری کے لیے پڑھاتے رہتے۔ لاہور اردو بازار سے بہت اچھی اچھی کتابیں اپنے خرچے پر ہمارے لیے منگواتے اور پڑھاتے۔ اتوار یا دوسری کسی چھٹی کے دن ہمیں اپنے گھر پر پڑھاتے۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور اس کا وہ کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ معاوضہ ہم دینے کی حیثیت ہی میں نہ تھے۔ بلکہ زیادہ وقت گزر جائے، تو وہ اپنے گھر سے ہمیں کھانا بھی کھلاتے۔ وہ کبھی کسی بھی صورت چھٹی نہیں کرتے تھے۔ جنون کی حد تک محنتی انسان تھے۔ انھیں صرف ایک ہی شوق تھا کہ ان کے شاگرد بہترین طالب علم بن جائیں اور یہی ان کا فخر تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ کبھی تو چھٹی ہو جیسے کہ بچوں کی ایک فطری عادت ہوتی ہے مگر چھٹی کہاں، لمحہ بھر کے لیے بھی فارغ نہ چھوڑتے۔

ایک دن ہم ان کے گھر پڑھنے صبح صبح پہنچے، تو معلوم ہوا کہ ماسٹر صاحب گھر پر موجود نہیں ہیں۔ رات کو ان کی جوان بیٹی کا انتقال ہو گیا جو تپ دق کی مریضہ تھی۔ وہ اسے دفنانے گئے تھے۔ قبرستان ساتھ ہی تھا۔ ہم نے سوچا ہم بھی قبرستان چلتے ہیں لیکن دیکھا، تو ماسٹر جی کچھ اور لوگوں کے ساتھ واپس آ رہے ہیں۔ ہم دبک کر بیٹھ گئے اور منہ رونا سا کر لیا۔ ہم نے سوچا، آج تو ضرور چھٹی مل جائے گی۔ مگر چھٹی نہ ملنا تھی اور نہ ملی۔ ماسٹر صاحب آتے ہی پڑھانے لگے۔ ہمیں افسوس بھی نہ کرنے دیا۔ لوگ افسوس کے لیے آتے، ہاتھ اٹھاتے دعا ہوتی اور ان کے رخصت ہوتے ہی دوبارہ حسب دستور پڑھائی شروع ہو جاتی۔ ان کے ایک رشتہ دار شیخ انوار الحق افسوس کے لیے آئے، تو دیکھا کہ ماسٹر جی خوب انہماک سے ہمیں پڑھا رہے ہیں۔ وہ بہت حیران ہوئے۔ کہنے لگے:

"غلام قادر! آج تو چھٹی کر لیتے!"

"کیوں؟"

"تمھاری بیٹی فوت ہوئی ہے۔"

"اسی کے لیے تو میں انھیں پڑھا رہا ہوں۔ اس پڑھانے کا جو ثواب ہو گا سب اس کو بخش دوں گا۔ یہ کہہ کر وہ رو پڑے۔ اور ہم سب بھی رونے لگے۔

یہ تھی ان استادوں کی اپنے فرض سے لگن کہ ہم ایسے بے ڈھنگے اور علم سے لاتعلق انسان بھی زیور تعلیم سے آراستہ ہو گئے۔

امتحان ہوا۔ ہم سب بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوئے۔ میں پورے ضلع لائلپور میں اول آیا بلکہ پورے پنجاب میں میری بہت ہی امتیازی پوزیشن تھی۔ مجھے خاص طور پر لارنس کالج گھوڑا گلی میں مزید تعلیم کے لیے اس وقت (۱۹۵۳ء میں) ۷۵ روپے ماہوار وظیفہ ملا۔

سردار محمد چودھری کے والد

میرے اسکول بلکہ پورے شہر میں اس کامیابی پر زبردست خوشی منائی گئی۔ مجھے بتایا گیا کہ اسکول کو ہائی اسکول بنے اس وقت چھتیس سال گزر رہے ہیں اور اس دوران میں نے سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے ہیں۔ فطری امر ہے کہ میں بہت خوش ہوا۔ شیخ سردار محمد نے مجھے کہا "اب بیٹا تمھیں انگیٹھی جلانے کی ضرورت نہیں۔ بس تم پڑھا کرو اور سارا خرچہ میرے ذمے ہے۔" میں نے کہا کہ میری فیس معاف ہے اور اب مجھے وظیفہ بھی ملا

کرے گا۔اس لیے پیسوں کی ضرورت نہیں۔ گزارہ چل جائے گا۔"

نوکری تو میری مجبوری تھی، شوق قطعاً نہیں تھا۔ یوں میں اس کام سے فارغ ہو کر کلی طور پر علم کے حصول میں جت گیا۔ اسکول میں کوئی لائبریری نہ تھی۔ میں اخبار میونسپلٹی جا کر پڑھتا۔ کچھ کتابیں جماعت اسلامی ٹوبہ ٹیک سنگھ کے امیر، مفتی انصاف سے لے کر پڑھ لیتا۔ قرآن مجید میں نے اپنی والدہ ہی سے پڑھا۔ مقامی مسجد میں بھی مولوی صاحب سے عربی کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اسکول میں بھی ماسٹر عبدالصمد ہمیں عربی پڑھاتے تھے۔ مجھے افسوس رہا کہ کبھی فارسی نہ پڑھ سکا۔

اینگلو ورنیکولر فائنل امتحان کے اچھے نتیجے کے بعد ہمارے اسکول میں ایک زبردست جلسہ منعقد ہوا جسے یوم والدین کے نام سے موسوم کیا گیا۔ تمام شہر کے معززین اس میں مدعو تھے اور مجھے اس میں تقریر کرنا تھی۔ مقامی تحصیلدار صاحب نے صدارت فرمائی تھی۔

شیخ غلام قادر نے ہم چار لڑکوں کو تقریر کرنے کے لیے تیار کیا۔ جو تقریر مجھے لکھ کر دی وہ پندرہ صفحوں پر محیط تھی۔ حکم ہوا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر زبانی یاد کرنا ہے اور اس کا بہترین طریقہ ہے کہ باہر کھیتوں کھلیانوں میں نکل جاؤ اور درختوں فصلوں کو سامعین سمجھ کر خوب زور زور سے تقریر کرو۔ یاد ہو جائے گی اور جلسہ میں ذرا دقت نہ ہوگی۔

بہرحال جیسا ماسٹر صاحب نے کہا میں نے ویسا ہی کیا۔ چھٹی کے بعد میں کھیتوں کی طرف نکل گیا اور زور زور سے تقریر کرتا رہا۔ اگلے دن صبح پھر یہی کام شروع کر دیا۔ اس دن اتوار تھا۔ میں سارا دن تقریر یاد کرتا رہا۔ میری یادداشت اچھی تھی اور میں نے سبق یاد کرنے کے بہت سے اپنے طریقے نکالے ہوئے تھے۔ کیونکہ میں بہت غریب تھا۔ کاپیاں مہنگی تھیں۔ کم ازکم میرے لیے مہنگی تھیں۔ لہٰذا میں اکثر مضامین اور ریاضی کے سوال ذہنی نشانیاں رکھ رکھ کر زبانی یاد کر لیتا۔ میری یادداشت کی نشانیاں چند الفاظ، پیراگراف، حروف و ہندسے ہوتے۔ یہ مشق بعد کی زندگی میں بھی بہت کام آئی۔ اور میں نے دفتری زندگی میں زیادہ اسٹیشنری کبھی ضائع نہیں کی۔ شاذ ہی میں نوٹس بناتا۔ سب کام اپنے ذہن سے کرتا رہتا۔

مشہور ڈراما نویس اشفاق احمد خان اکثر ایک مستری کی بات سنایا کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک بار مستری سے پوچھا، آپ اتنے اتنے پیچیدہ اور نازک کام بغیر کسی نقشہ کے کیسے کر لیتے ہیں؟ مستری نے کہا، بابا جی ہم کوئی پڑھے لکھے لوگ تو ہیں نہیں کہ لکیر کے فقیر ہوں۔ ہم تو اپنے دماغ سے کام لیتے اور سب کچھ بنا لیتے ہیں۔ وہ جب بھی یہ قصہ سنائیں میں ہمیشہ مسکرا دیتا ہوں۔ انھیں کیا معلوم کہ میں بھی کبھی دماغ ہی سے کام لیا کرتا تھا۔ یہ سب میری غربت کا فیض تھا۔

جب اگلے دن یعنی سوموار کو دوبارہ اسکول کھلا تو شیخ غلام قادر نے مجھے تقریر کے دو پہلے صفحے سنانے کو کہا۔ میں نے پندرہ کے پندرہ صفحے سنا دیے۔ وہ حیران پریشان میرے منہ کی طرف دیکھتے رہے پہلے تو انھیں یقین ہی نہ ہوا۔ انھوں نے دوبارہ سہ بارہ سنا۔ پھر میرے ہاتھ اور بازو وغیرہ کی اچھی طرح تلاشی لی ..... جماعت کی دیواروں کو دیکھا اور جب انھیں یقین ہو گیا کہ میں نے واقعی ساری تقریر زبانی یاد کر لی ہے، تو بہت زیادہ خوش ہوئے اور کہنے لگے "تم تو کوئی جینئس ہو۔"

مجھے جینئس کے معنی نہیں آتے تھے۔ بعد میں راجا رفیق سے پوچھا کہ اس کے معنی کیا ہیں، تو اس نے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا "شیطان" اور میرا منہ لٹک گیا۔ میں نے سمجھا کہ شاید ماسٹر جی ناراض ہو گئے ہیں حالانکہ راجا رفیق صرف میری ٹانگ کھینچ رہا تھا۔ اپنی بات کو مزید پکا کرنے کے لیے کہنے لگا "ماسٹر جی ٹھیک ہی تو کہتے ہیں، کوئی انسان" پندرہ صفحے ایک دن میں کیسے یاد کر سکتا ہے۔ یہ تو شیطانی صفتیں ہو سکتی ہیں۔ مجھے بہت بعد میں پتا چلا کہ جینئس کے معنی کیا ہیں۔ میں کچھ پریشان بھی رہا مگر اس بات کا یہ فائدہ ہوا کہ ماسٹر غلام قادر نے مجھے اس کے بعد کبھی نہ مارا۔ ماسٹر صاحب کی عادت تھی کہ وجہ بلاوجہ اور وقت

بے وقت مارتے بہت تھے اور ہمیں ان سے ڈر لگتا تھا مگر میری یادداشت ڈھال بن گئی۔

جلسے کے وقت تک مجھے اپنی تقریر مکمل طور پر حفظ ہو چکی تھی۔ یہ میری زندگی کی پہلی تقریر تھی اور میں خاصا گھبرایا ہوا تھا..... ماسٹر جی نے تقریر کے زیر و بم بھی خوب سکھا دیے تھے۔ میری آواز ویسے ہی ذرا بھاری اور گرجدار تھی۔ بس آخری بات انھوں نے یہ کہی کہ جب تم تقریر کرنے لگو، تو سمجھنا کہ تمھارے سامنے سب الو کے پٹھے بیٹھے ہیں۔ تحصیلدار سے ڈرنا اور نہ ہیڈ ماسٹر صاحب سے اور اپنی تقریر جاری رکھنا۔ ٹھہر ٹھہر کر اور مناسب طور پر رک رک کر جیسے تمھیں سکھایا گیا ہے۔

میں نے بھری مجلس میں ماسٹر جی کے بتائے ہوئے طریقے پر ایک دھواں دھار تقریر جھاڑ ڈالی۔ کسی کی پروا نہ کی۔ تقریر ختم ہوتے ہی صدر نشین تحصیلدار صاحب اپنی نرسی سے اٹھے اور میرا ماتھا چوم لیا اور مجھے Orator یعنی خطیب کا خطاب دے دیا۔ سب لوگوں نے زبردست تالیاں بجائیں۔ مجھے یہ دیکھ کر یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ میرے لیے ہو رہا ہے۔ میں خوش ہوا اور جذباتی بھی اور جب میں اپنی نشست پر جا کر بیٹھا، تو کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ میرے آنسو جاری ہیں۔ میرے آنسو غیر شعوری طور پر نکل گئے تھے جس کا بعد میں میرے دوستوں نے خوب مذاق بنایا۔ اس دن کے بعد میرا حجاب جاتا رہا اور بعد کی زندگی میں مجھے لوگوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کبھی دشواری نہ ہوئی۔ یہ سب شیخ غلام قادر کی راہنمائی اور بے لوث مدد کا نتیجہ تھا۔ خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ میری انگریزی بھی ان ہی کی وجہ سے اچھی ہوگئی۔ ایسے استاد قسمت ہی سے ملتے ہیں اور میں بہت زیادہ خوش قسمت تھا۔

اسی تقریر کی وجہ سے مجھے ایک اور بزرگ ہستی کی شفقت ملی اور وہ تھے مرحوم شیخ محمد یوسف، ہمارے شہر کے رئیس اعظم اور سب سے معروف تاجر۔ وہ بہت ہی سمجھدار اور دانا انسان تھے۔ ذاتی زندگی میں نہایت سادہ اور کفایت شعار مگر کارِ خیر میں سب سے آگے اور خاموش خاموش ..... انھیں شوق تھا بلکہ ان کی زندگی کا مشن تھا کہ وہ ہونہار غریب طلبہ کی نہایت خاموشی سے مدد کرتے کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔ اس بات کا سوائے ان لوگوں کے جو مستفید ہوتے، کسی اور کو علم، تو کیا کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ دل میں شیخ صاحب نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اس تقریر کرنے والے طالب علم نے اگر اپنی تعلیم اسی ڈگر پر جاری رکھی، تو اس کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک کے بہترین تعلیمی ادارے میں اہتمام کریں گے۔

جب میں نے ۱۹۵۵ء کے میٹرک امتحان میں ضلع بھر میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی، تو وہ خاموشی سے ہمارے گھر آئے، مجھے سیر کرانے ساتھ لے گئے اور مجھ سے آئندہ کا پروگرام پوچھتے رہے۔ میرے فرشتوں کو معلوم نہ تھا کہ ان کے دل میں کیا ہے۔ قصہ کوتاہ فرمانے لگے "کبھی تم نے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا سوچا ہے؟"

"ہاں!" میں نے کہا۔ "مگر میں کس طرح پڑھ سکتا ہوں۔ مجھے جو وظیفہ ملے گا وہ کافی نہیں۔ کالج کی کتابیں علیحدہ خرچہ مانگیں گی۔ میرے پاس تو مناسب کپڑے بھی نہیں ہیں۔"

کہنے لگے "تم بالکل فکر نہ کرو۔ یہ سب کچھ اللہ کے ذمے ہے۔ تم گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لو۔ وہ سب سے بہترین کالج ہے۔ میں تو کالج میں پڑھ نہیں سکا۔ تم وہاں پڑھ لو، تو میں سمجھوں گا کہ میں نے خود وہاں پڑھ لیا۔ جتنی رقم درکار ہو وہ حساب کر کے مجھے ایک دو دن میں بتا دو۔ وہ تم مجھ سے لے لینا اور جو ماہوار خرچ ہوگا، وہ تمھیں بذریعہ منی آرڈر مل جایا کرے گا۔ تم نے مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ ہر ماہ کتنا خرچ درکار ہے۔ خوامخواہ چٹھی نہ لکھنا، لوگوں کو پتا چل جاتا ہے۔ بس میری ایک شرط ہے کہ کسی سے اس بات کا کبھی ذکر نہ کرنا اور کبھی بھی یہ نہ سمجھنا کہ میں غریب ہوں۔ اچھی طرح سے رہنا اور خوب پڑھنا۔ زندگی میں اپنی عزت نفس کا کبھی سودا بھی نہ کرنا۔ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔ محنت کرنا اور کبھی فکر نہ کرنا۔

"ہاں! اگر ہو سکے، تو جب تم صاحب روزگار ہو جاؤ، تو پھر ایک لڑکا اپنے ہی جیسا ڈھونڈ لینا اور اسے پڑھا سکو تو پڑھا دینا۔

اس کے علاوہ میرا تم سے اور کوئی تقاضا نہیں ہے۔" تم جانو اور تمہارا خدا! میں تم سے کوئی حساب نہیں مانگوں گا۔

ایک بات اور، گھر میں کسی کو نہ بتانا۔ اپنے ابا جی کو بھی بتانے کی ضرورت نہیں۔ کہہ دینا کہ مجھے اچھی پڑھائی پر حکومت کی طرف سے وظیفہ ملتا ہے۔"

اب میں سوچتا ہوں کہ یہ کیسے لوگ تھے اور کیا سے کیا ہو گیا۔ ایسے لوگ کیوں میرے معاشرے سے چلے گئے۔ میں پڑھ لکھ کر بہت بڑا افسر بن گیا۔ آئی۔ جی۔ پنجاب بنا مگر شیخ محمد یوسف نے مجھے کبھی کام نہ کہا۔ کبھی کوئی سفارش نہ کی۔ مجھے حسرت ہی رہی کہ وہ کوئی کام کہیں اور میری قسمت کھل جائے مگر اس اللہ کے بندے نے کبھی کوئی کام نہ کہا:

ڈھونڈو انھیں چراغ لے کر
یہ لوگ کہاں ملتے ہیں
ہزاروں میں
لاکھوں میں
کہیں نہیں ملتے
یہ سب اس کی قدرت تھی جس نے یہ سب جہان پال رکھا ہے
اور اس جہان رنگ میں
میرا حصہ کچھ زیادہ ہی رکھ دیا تھا
شکر ہے اس کا
اس کے نیک بندوں کا
جو اس کی بتائی راہ پر چلتے ہیں

شیخ محمد یوسف مدظلہ کا انتقال ہوا تو بس بولتے بولتے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بعد از موت ان کے چہرے کا نور دیدنی تھا۔ ہمارے ایک ساتھی عرفان محمود نے دیکھا تو پکار اٹھے:

"یہ تو کسی دیوتا کے مانند نظر آتے ہیں" گویا سکون کی نیند سوئے ہوئے تھے۔ چہرے پر مسکراہٹ تھی جیسے اللہ سے مل کر فرحت پا رہے ہیں۔ شاید جنت ایسے ہی لوگوں کا مقسوم ہے۔ خدا کرے وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے سائے میں رہیں۔

ان کے صاحبزادے طاہر یوسف اپنے عظیم والد کی روایات قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ایک بہت ہی اعلیٰ معیار کا ٹرسٹ اسکول ٹھوکر نیاز بیگ میں چلا رہے ہیں جہاں غریب اور ہونہار طالب علموں کی بالکل مفت تعلیم کا بندوبست ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے کام میں برکت ڈالے۔ میں بھی کچھ نہ کچھ طاہر صاحب کے ساتھ شریک ہوں مگر کم کم حالانکہ میرا فرض زیادہ بنتا ہے۔

میری اس تقریر کا ایک اور عجیب و غریب اثر ہوا۔ جب تحصیلدار صاحب کو پتا چلا کہ میں ان کی تحصیل کے ایک چپڑاسی کا بیٹا ہوں، تو وہ اور بھی خوش ہوئے۔ اگلے دن ہمارے گھر تشریف لائے اور میرے والد کو اس بات پر راغب کرتے رہے کہ سردار کو ضرور ہی لارنس کالج گھوڑا گلی بھجوائیں۔ پاکستان کو ایسے ہونہار طالب علموں کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ پاکستان نیا ملک ہے۔ اسے سائنسدانوں اور ڈاکٹروں کی ضرورت ہے۔ آپ اپنے بیٹے کو ضرور گھوڑا گلی بھجوا دیں۔ باتوں باتوں میں جب انھیں معلوم ہوا کہ ہمیں اپنی ہندوستان میں چھوڑی زرعی زمین کے بدلے کوئی زمین ابھی تک نہیں ملی، تو انھوں نے اگلے ہی دن تمام تحصیل کے پٹواریوں کی ڈیوٹی لگا دی کہ ہمارے لیے فوراً متروکہ زمین ڈھونڈی جائے۔ چند دنوں بعد ہی ہمیں ٹوبہ شہر سے ملحق گاؤں چک نمبر ۳۲۲ ج۔ب میں ایک قطعہ اراضی الاٹ ہو گیا۔

ہمارے والد تو مجبوراً نوکری کر رہے تھے۔ زمین ملتے ہی نوکری چھوڑی، اپنا آبائی پیشہ کاشتکاری شروع کر دیا اور کوٹھیرہ کے اجڑے کاشتکار آخر کار چک نمبر ۳۲۲ ج۔ب میں آباد ہو گئے..... یوں پناہ گیری کا طویل دور ختم ہوا۔

ملک محمد اسلم تحصیل دار مرحوم و مغفور نے میری قابلیت سے متاثر ہو کر ہمیں آباد کیا۔ ان کے صاحبزادے میرے ہم جماعت تھے۔ دوسرے بیٹے ڈی۔ آئی۔ جی حمید اسلم پولیس میں رفیق کار رہے۔ باپ کی طرح بیٹا بھی بڑی ہی علمی دسترس رکھتا ہے اور ایک فہیم افسر ہے۔

ہم ۱۹۴۷ء میں عید کے فوراً بعد کوٹھیرہ جسوال میں سے سکھوں

کے حملوں کے خوف سے بھاگ گئے تھے۔ ۱۹۵۳ء یعنی پورے چھے سال بعد کہیں وہاں پاؤں رکھ سکے جسے ہم اپنی زمین کہہ سکتے۔ ہم سب لوگ گاؤں چلے گئے، وہاں حسب حیثیت کچے کوٹھے بنائے اور وہیں سے پھر مزید زندگی کے شگوفے نکلے۔ میری بہنوں کی شادیاں ہوئیں۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد میری شادی ہوئی۔ زندگی نے مزید نشوونما پائی۔ اب میرا وطن چک نمبر ۳۲۲۔ج۔ب کی سرزمین کے حوالے سے پاکستان ہے۔ لاہور، تعلیم اور ملازمت یہ سب کچھ بعد کی باتیں ہیں۔

جو کچھ بعد میں ہوا، وہ بھی کسی افسانے یا عجوبے سے کم نہیں۔ اس کی تفصیل ذرا بعد میں مگر میں اس وقت بھی محسوس کرتا ہوں کہ میری جڑ میرے اس نئے گاؤں ہی میں ہے۔ کوٹھیرہ میں گزرا بچپن بھولتا تو نہیں بلکہ سہانا نظر آتا ہے مگر ٹوبہ ٹیک سنگھ اور چک نمبر ۳۲۲۔ج۔ب کا بھی کوئی جواب نہیں ہے۔ وہیں میرا چچا اور ان کی اولاد رہتی ہے۔ وہیں میرے دادا دادی کی قبریں ہیں۔ وہیں میرے ماموں اور ان کی اولاد رہتی ہے اور میری دونوں بہنیں، بہنوئی اور ان کی پیاری پیاری اولاد۔ خدا کرے کسی کو اب وہاں سے اجڑنا نہ پڑے۔ پناہ گیری عذاب ہے، خدا ہر کسی کو اس سے محفوظ رکھے۔

گورنمنٹ کالج، لاہور

تاج شاہی میں جڑا تابناک کوہ نور ہو یا کسی حسینہ کی زینت کا بقعہ نور، ہیرا ابھی ہیرا بنتا ہے جب اسے کوئی صاحب ذوق جوہری اپنے کمال فن سے تراش خراش کر اس کی صورت گری کر دے ورنہ تو کسی کان سے نکلا پتھر کب ہیرا کہلا سکتا ہے۔

گورنمنٹ کالج، لاہور ایسا ہی مرکز فن تھا جہاں سے علامہ اقبال ایسے عظیم شاہکار بن سنور کر نکلے۔ جس سردار چودھری کو بہت سے لوگ جانتے ہیں، گورنمنٹ کالج، لاہور کے ماحول اور اساتذہ ہی نے اُسے تراش خراش کر محنت سے تراشا اور ڈھالا۔ وہ نہیں جو کوٹھیرہ کی پہاڑیوں اور وادیوں میں اچھلتا کودتا رہا تھا اور نہ ہی وہ جو ٹوبہ ٹیک سنگھ کی گلیوں میں محنت مزدوری کر کے گزارہ کرتا رہا۔ گرچہ پالش ہو کر چمک اٹھنے والے کی ٹھوس بنیاد وہی خمیر تھا جو اس کے بے انتہا سادہ اور محبت کرنے والے والدین اور خاندان نے اٹھایا تھا یا اچھے انسانوں کی صحبت نے اسے مزید پروان چڑھایا۔

گورنمنٹ کالج کے علاوہ سردار محمد کی تشکیل شخصیت و کردار میں سب سے بڑا حصہ میاں محمد شفیع کی نیک اور عالمانہ صحبت کا ہے کہ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے...... ایسا سرچشمہ فیض جس کے حوض کوثر سے سردار محمد اور ناصر حسین شمسی نے مسلسل دن رات فائدہ اٹھایا۔ میاں صاحب کی مجلس میں بیٹھنا تہذیب گری و تعلیم کے اول و آخری ہونے کے لیے کافی تھا۔ علم و فضل اور خلق حسن کا ایسا بے کراں سمندر کہ جو چاہے اس سے سیراب ہوتا رہے۔

لاہور شہر میرے لیے بالکل اجنبی تھا، سوائے اس کے کہ میں ہجرت کے وقت وہاں سے گزرا تھا۔ لاہور میں میرا کوئی رشتہ دار یا واقف کار نہ تھا... صرف میاں شفیع سے شناسائی تھی اور وہ بھی پانچ سال پرانی۔ مجھے تو ڈر تھا کہ شاید وہ مجھے پہچان بھی نہ سکیں کہ ٹوبہ کے بعد میں کبھی انھیں ملا تک نہ تھا۔ خیر لاہور پہنچ کر میں سب سے پہلے میاں صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ اس وقت لاہور کارپوریشن کے چیف ایگزیکٹو آفیسر تعینات تھے۔

ریلوے اسٹیشن سے سیدھا ان کے دفتر پہنچا۔ اطلاع ملتے ہی فوراً اندر بلا لیا اور بڑے تپاک سے ملے۔ انھیں میرا نام یاد تھا۔ میں بہت خوش ہوا۔ جب میرے گھر والوں کی خیریت معلوم کی تو مجھے ایسے معلوم ہوا جیسے کسی نے بیابان میں بہار کی پروا چلا دی ہو۔ جب میں نے اپنے میٹرک کے نمبر بتائے، تو کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور میرا ماتھا چوم لیا جیسے میں ان کا اپنا بیٹا ہوں اور میرے کہے بغیر کہتے ہیں "گورنمنٹ کالج، لاہور میں داخلہ لے لو۔ بہت اچھا کالج ہے۔ میں بھی وہاں پڑھتا رہا ہوں۔" فوراً نہایت ہی شستہ اور خوبصورت اردو میں پروفیسر جی۔ ایم۔ اثر کے نام چٹھی لکھ دی اور فرمانے لگے، رہائش کے لیے جگہ نہ ہو تو ہر روز گھر آ جانا۔ بستر مل جائے گا۔ اس کے بعد مجھے لاہور بالکل گھر محسوس ہونے لگا اور تمام اجنبیت منٹوں میں ختم ہو گئی۔

◆◆◆

سب سے بڑا اروپیا

کالموں سے چشم کشا واقعات کا منفرد انتخاب

محسن فارانی

یہ اس وقت کی بات ہے جب آفتاب احمد شیرپاؤ کے ساتھ خیبرپختونخواہ کی وزارت اعلیٰ پر قبضے کی دوڑ شروع ہوئی۔ میاں محمد نواز شریف نے خیبرپختونخوا کے ارکان اسمبلی خریدنے کی ذمے داری اپنی پارٹی کے راہنماؤں، غفورخاں جدون اور اے این پی کے فرید خاں طوفان کو دی۔ کیپٹن صفدر اور ریحام خاں کے علاقے سے تعلق رکھنے والے ایک رکن اسمبلی کو قائل کر فرید طوفان، میاں صاحب کے پاس لاہور لے گئے۔ بات طے ہوگئی لیکن ایم پی اے صاحب نے کہا کہ انھوں نے قسم کھا رکھی ہے، وہ میاں صاحب کے پیسوں کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔

میاں صاحب اور فرید طوفان نے ان سے کہا کہ آپ اپنی قسم پر قائم رہیے۔ آپ جھولی ہاتھوں سے پکڑ کر آگے لائیے۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ فرید طوفان نے رقم ان کی جھولی میں ڈال دی۔ ایم پی اے صاحب رقم کو ہاتھ لگائے بغیر جھولی میں گاڑی تک لے گئے اور پچھلی نشست میں پھینک کر ڈرائیور سے اسے گننے اور سنبھال کر رکھنے کا کہا۔ یوں ان کی قسم کی لاج بھی رہ گئی اور میاں صاحب کا کام بھی ہوگیا۔

پاکستان تحریک انصاف کے صوبائی صدر، اعظم سواتی امریکا میں اپنا کاروبار بچوں کے سپرد کر ڈالروں کا انبار لیے جب وطن سے لوٹے، تو پہلے انھوں نے رقم کے عوض ضلعی نظامت حاصل کر لی۔ پھر سینیٹر بننے کا شوق ہوا، تو ایم ایم اے کی قیادت سے رابطہ کر لیا۔ ایم ایم اے (متحدہ مجلس عمل) کی قیادت نے

ان کے ساتھ یہ "ڈیل" کرلی کہ نصف ارکان انھیں پارٹی کی طرف سے دیے جائیں گے اور باقی وہ ان کی صفوں میں سے خود خرید لیں۔ چناں چہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور سینیٹر منتخب ہو گئے۔ اسی دولت اور اپنے مخصوص کمالات کی وجہ سے عمران خاں نے انھیں پارٹی کا صوبائی صدر بنا دیا، تو پی ٹی آئی کے پرانے راہنماؤں نے ان کی نامزدگی کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ کے پی کے ہاؤس کے ایک اجلاس میں بڑی تلخی ہوئی۔ کچھ راہنماؤں نے خان صاحب کی موجودگی میں اعظم سواتی کے خلاف گواہیاں دیں، تو خان صاحب نے یہ کہہ کر مخالفین کو رام کر لیا، بلدیاتی انتخابات تک سواتی صاحب کو برداشت کر لیں کیونکہ ان میں پیسوں کی بہت ضرورت پڑتی ہے۔"

("جرگہ" سلیم صافی۔ "جنگ" ۲۸ فروری ۲۰۱۵ء)

حیدرآباد دکن کے آخری نظام میر عثمان علی خان

برطانیہ کا وفادار ترین دوست

میر عثمان علی خاں (۱۹۱۱ء تا ۱۹۴۸ء) چالیس سال سے تک بھک برصغیر کی امیر ترین ریاست حیدرآباد دکن کا حکمران رہا۔ اس کی ریاست رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑی شخصی حکومت تھی۔ حیدرآباد دکن کا کل رقبہ ۲ لاکھ تئیس ہزار مربع کلومیٹر تھا۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں اس کی مجموعی دولت دو ارب ڈالر تھی جو آج کے اعتبار سے ۳۳ ارب ڈالر کے قریب بنتی ہے۔ پورے برصغیر میں نظام واحد حکمران تھا جسے برطانوی حکومت نے اپنا سکہ جاری کرنے کی اجازت دی۔

۱۹۱۸ء میں نظام کے حکم پر سو روپے کا کرنسی نوٹ بھی جاری ہوا۔ برصغیر کے تمام ریاستی حکمرانوں کے لیے درجے کے لحاظ سے توپوں کی سلامی کا سرکاری رواج تھا۔ نظام حیدرآباد ان پانچ حکمرانوں میں آتا تھا جنھیں ۲۱ توپوں کی سلامی کا حقدار قرار دیا گیا۔ نظام حیدرآباد کے لیے ہز ہائی نیس کا لقب استعمال نہ ہوتا بلکہ ہز ایگزالٹڈ ہائی نیس کا لقب مخصوص تھا۔ شہزادی الزبتھ کی شادی پر جو ہار نظام کی جانب سے تحفے میں دیا گیا، وہ اپنی مثال آپ تھا۔ یہ ہار آج بھی ملکہ الزبتھ پہنتی ہیں۔ اس کا نام بھی تحفہ دینے والے ہی کے نام پر رکھا گیا۔ یہ Nizam of Hyderabad Necklace کے طور پر جانا جاتا ہے۔

جنگ عظیم میں نظام نے جہاز خرید کر برطانوی فضائیہ کو عطیہ کر دیے۔ ان جہازوں کے پروں پر نظام کا نام لکھا تھا۔ ایئرفورس کے اس سکواڈرن کا نام "حیدرآباد سکواڈرن" رکھا گیا۔ نظام نے ۱۹۴۰ء میں ایک بحری جنگی جہاز خرید کر رائل آسٹریلین نیوی کو تحفہ دیا۔ اس کا نام "ایچ ایم اے ایس نظام" رکھا گیا۔ میر عثمان علی خاں کو حکومت برطانیہ نے "برطانوی حکومت کا سب سے وفادار دوست" کہا تھا۔ ستمبر ۱۹۴۸ء میں بھارتی حکومت نے نظام کے دور کو فوجی آپریشن "پولو" کے ذریعے قصۂ پارینہ بنا دیا۔ اس کے بعد نظام سرکاری حیثیت سے مختلف نمائشی عہدوں پر فائز رہا۔ اس کی ریاست تین صوبوں میں تقسیم کر دی گئی: کرناٹک، مہاراشٹر اور آندھرا پردیش۔ یہ صوبے اس ریاست کی جغرافیائی تقسیم کی بدولت وجود میں آئے ہیں۔ (آندھرا پردیش کی تقسیم سے اب تلنگانہ کا نیا صوبہ بن چکا)۔

("غلام گردش" راؤ منظر حیات۔ ایکسپریس ۲۸ فروری ۲۰۱۵ء)

ترکی کی حسینہ "الف" اور قاضی حسین احمد

نجم الدین اربکان ترکی کے وزیراعظم ہوا کرتے تھے۔ وہ اسلام آباد تشریف لائے، تو ترکی کے سفارت خانے نے ایک مشہور ہوٹل کے بہت بڑے ہال میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ اس میں قاضی حسین احمد مرحوم بھی مدعو تھے۔ قاضی صاحب کو ہوٹل کے صدر دروازے سے لا کر نجم الدین اربکان سے ملوانے کے لیے سفارت خانے نے اپنی تھرڈ سیکرٹری کو مامور کیا۔ وہ تیس سے کم عمر ایک دراز قد خاتون تھی۔

بے تحاشا حسین اور حیران کن حد تک لمبے بالوں کی مالک۔

میں اسے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ انتہائی ڈھٹائی سے اس کے پاس جا اپنا نام بتا کر تعارفی کارڈ دیا، تو اس نے بڑی معصومیت سے افسوس کا اظہار کیا کہ وہ تقریب میں وقت پر پہنچنے کی پریشانی میں اپنا پرس گھر چھوڑ آئی ہے۔ اس کے پاس تعارفی کارڈ نہیں مگر نام اس کا "الف" ہے۔ "ہاں، تم بالکل الف کی طرح شاندار ہو۔" میں نے فوراً اعتراف کیا۔ مگر جانے کیوں پہلی ہی ملاقات میں مجھے اپنا دوست سمجھ کر اس نے استفسار کیا کہ میرے خیال میں اس کا لباس غیر اسلامی تو نہیں۔ میں نے دو قدم پیچھے ہٹ کر اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ ہماری اسلامی روایات کے مطابق صرف دوپٹے کی کمی ہے۔ باقی ہر شے بہت مناسب ہے۔

اسے مطمئن کرنے کے بعد پوچھنا واجب ٹھہرا کہ وہ اپنے لباس کے بارے میں اس قدر متفکر کیوں ہے؟ جواباً اس نے مطلع کیا کہ قاضی حسین احمد کو لے کر مین ہال تک پہنچانا اس کی ذمے داری ہے۔ مگر اسے بتایا گیا ہے کہ قاضی صاحب اور ان کی جماعت بہت قدامت پسند ہے اور خواتین کے بے حجاب ہونے کی شدید مخالف بھی۔ میں نے اسے حوصلہ دیا کہ قاضی صاحب کوئی سخت گیر قدامت پسند نہیں۔ میں ان کے آنے تک آپ کے ساتھ ہی کھڑا رہوں گا۔ ہم دونوں انھیں مل کر مین ہال تک لے جائیں گے۔

پھر قاضی صاحب آ گئے۔ وہ "الف" کو دیکھ کر تھوڑا گھبرائے ضرور، مگر فوراً سنبھل گئے۔ اس نے جب ملانے کے لیے ہاتھ بڑھایا، تو انکار نہ کیا بلکہ مصافحہ کرتے وقت ترکی زبان میں اس کا نام اور "کیا حال ہے؟" جیسا کوئی فقرہ بھی کہا۔ ہال کی طرف اس خاتون کے ساتھ چلتے ہوئے البتہ ان کا چہرہ بچوں کی معصومیت والی شرم سے تھوڑا سرخ رہا۔ اربکان سے ملنے کے بعد وہ اس خاتون کو بھول بھال گئے۔ وہ مگر ان کے قریب منڈلاتے رہنے پر مجبور تھی اور میں اس دوران اس کے ساتھ چپکا رہا۔ "الف" کے ساتھ میری یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی، مگر ایک خوشگوار یاد کی طرح اس کا چہرہ اور وجود میرے ذہن میں امڈ آتا ہے۔

("برملا" نصرت جاوید۔ ایکسپریس ۱۴ نومبر ۲۰۱۴ء)

گوروں کے کتے سے "کھلا مقابلہ"

آج سے سو برس پہلے امریکا میں ایک نسل پرست تنظیم کوکلکس کلان (Ku Klux Klan) سیاہ فاموں کو انسانی حقوق دینے کی مخالف تھی۔ اس تنظیم کے افراد نے ایک افریقی

نڈھال سرنگی پر تشدد کیا اور پھر کندھوں تک اسے ریت میں دبا دیا۔ اس کے بعد وہ نسل پرست پر ایک شکاری کتے کو کچھ فاصلے سے چھوڑتے۔ وہ بھاگتا ہوا اس سیاہ فام پر حملہ کرتا۔ لیکن وہ شخص ہر بار اپنی گردن اور کندھے تیزی سے گھماتا اور کتا اسے کاٹ نہ سکا۔ کتا آخر تھک کر ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس پر نسل پرست لیڈر چلایا: اے کالے! یہ چالبازی، حیلہ سازی اور فریب چھوڑو اور ہمارے کتے سے "کھلا مقابلہ" کرو۔

(حسین احمد شیرازی۔ "جنگ" ۱۲ جنوری ۲۰۱۵ء)

جنرل کیانی کا مشرف کی بیساکھی بننے سے انکار

وزیراعظم گیلانی کے دورۂ امریکا میں صدر مشرف کو ہٹانے کا حتمی فیصلہ ہو گیا تھا۔ "میں ان خراب حالات میں چپ بیٹھنے والا نہیں....." گورنر ہاؤس کراچی میں پرویز مشرف اس قسم کی تقریر کر چکے تھے۔ ادھر جنرل (ر) محمود درانی دو سفیروں کو ایوان صدر کی انتظارگاہ میں بٹھا مشرف سے اپنی گھنٹا بھر کی میٹنگ میں انھیں دوستوں کا فیڈ بیک اور اہم اہم پیغام پہنچا گئے تھے۔ صدر مشرف کے مواخذے کی باتیں اور اسمبلیاں توڑنے کی چہ میگوئیاں ایک ساتھ جاری تھیں۔ پرویز مشرف جن کے بارے میں کہا کرتے تھے "وہ میری جیب میں رہتا ہے۔" وہ اب جیب سے نکل کر انھیں "جاب لیس" کرنے کی تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔

اگست ۲۰۰۸ء کے دوسرے ہفتے کی ایک شام صدر مشرف نے چیئرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی جنرل طارق مجید کو ایوان صدر بلایا۔ "اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟" صدر مشرف نے چند رسمی جملوں کے بعد ان سے پوچھا۔

"آپ کے پاس کیا کیا آپشن ہیں؟" جواب دینے کے بجائے جنرل طارق نے سوال کیا۔

مشرف کا جواب انتہائی مختصر تھا۔

"جنرل کیانی سے بات ہوئی؟ ان کی کیا رائے ہے؟" جنرل طارق نے دوسرا سوال کیا۔

"وہ تو کچھ بولتا ہی نہیں۔ جب بھی میں نے بات کی، وہاں کے آگے کچھ کہتا ہی نہیں۔" مشرف اکتائے لہجے میں بولے۔

"سر، پھر میرا خیال ہے کہ اب آپ کے پاس باعزت آپشن ایک ہی رہ گیا ہے اور وہ ہے استعفا۔" جنرل طارق نے صدر کو اپنی رائے سے آگاہ کیا۔

"تمھارے خیال میں میرے پاس یہی آپشن باقی بچا ہے!" لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد صدر مشرف بولے۔

"جی سر۔" جنرل طارق نے جواب دیا۔ اور پھر ملائیشیا کے مہاتیر محمد کو استعفا دینے کے لیے فون پر فون کرنے والے صدر مشرف نے تین دن بعد اپنی اس تقریر میں خود استعفا دے دیا جسے وہ ہر صورت لائیو آن ایئر کرانا چاہتے تھے۔ کچھ لوگوں کے باہمی مشورے کے بعد تقریر کو ہر ۳۰ سیکنڈ کے وقفے سے صرف اس لیے نشر کیا جاتا رہا کہ صدر مشرف کا کوئی بھی غیر متوقع اعلان لائیو نہ جا سکے۔ ادھر پرویز مشرف کی تقریر مکمل ہوئی، ادھر عملے کو الوداعی لنچ دینے اور خود ایک چکن سینڈوچ کھانے کے بعد مشرف گارڈ آف آنر لے کر رخصت ہو گئے۔

("اعمال نامہ" ارشاد بھٹی "جنگ" ۱۲ جنوری ۲۰۱۵ء)

ایوانِ صدر سے رخصتی پر ایوب خاں کے لرزتے ہونٹ

۱۹۳۶ء میں انڈین سول سروس جوائن کرنے اور زندگی کے آخری دنوں میں مذہبی ہو جانے والے الطاف گوہر نے ایک دفعہ بتایا "دس سال تک سیاہ و سفید کے مالک ایوب خان کی ایوان صدر سے روانگی کا منظر بڑا ہی دردناک تھا۔ ان الوداعی لمحوں میں ہم صرف تین لوگ ان کے ساتھ تھے۔ ایک میں، ایک اے ڈی سی اور ایک ملٹری سیکرٹری جنرل رفیع۔ ایوب خان گاڑی میں بیٹھے، پھر اترے اور دوبارہ ایوان صدر کے اندر چلے گئے۔

"تھوڑی دیر بعد باہر آئے، تو ان کے ہاتھوں میں کچھ کاغذات اور چند کتابیں تھیں۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ ایوب خان نے کھڑکی میں سے منہ نکال کر خدا حافظ کہا۔ گیٹ پر گارڈوں نے آخری مرتبہ اپنے صدر کو سلیوٹ کیا۔ لیکن ہمیشہ کے لیے ایوان

اقتدار سے رخصت ہوتے وقت ایوب خاں کے چہرے کی دو سلوٹیں اور لرزتے ہونٹ میں آج تک نہیں بھلا پایا۔"

("اعمال نامہ" ارشاد بھٹی۔ "جنگ" ۱۲ جنوری ۲۰۱۵ء)

جب ضیاالحق نے بھٹو کے لیے فاتحہ خوانی کی

"بھٹو نے چھے سات سینئر افسروں کو نظر انداز کر کے آپ کو آرمی چیف بنایا، مگر آپ نے انھیں پھانسی دے دی، کیوں؟"

صدر جنرل ضیاالحق کا انٹرویو کرتے ہوئے بی بی سی کے مائیکل شارٹن نے جب یہ سوال کیا تو ضیاالحق برجستہ بولے: "اس کی پھانسی قدرت کا فیصلہ تھا اور یہ اس کی قسمت میں لکھا جا چکا تھا۔"

"آپ کا اپنی قسمت کے بارے میں کیا کہنا ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ قدرت نے آپ کے لیے کیا فیصلہ لکھ رکھا ہے؟"

اس سوال پر کوئی واضح جواب دینے کے بجائے ضیاالحق نے ایک لمبا لیکچر جھاڑ دیا۔

گزشتہ ماہ دبئی میں جنرل ضیاالحق کے ساتھ پانچ سال بطور اسٹاف آفیسر کام کرنے والے سابق بیوروکریٹ سے ملاقات ہوئی جو صدر ضیا کی وفات سے اب تک بیرون ملک مقیم ہیں۔ انھوں نے بتایا: بھٹو کو ۴ اپریل ۱۹۷۹ء کو پھانسی دی گئی۔ میں ۳ اپریل کو صبح ۱۰ بجے سے رات ۱۱ بجے تک جنرل ضیاالحق کے ساتھ تھا۔ مجھے کسی ملاقات، ٹیلی فون کال یا باڈی لینگویج سے یہ محسوس تک نہیں ہوا کہ اگلے چند گھنٹوں میں اتنا بڑا واقعہ ہونے والا ہے۔ صبح اخبار پڑھا، تو میں حیران رہ گیا کہ گزشتہ رات نہ صرف بھٹو کو پھانسی دے دی گئی، میت ہی دن تھرنی پر لاڑکانہ پہنچا دی گئی، جنازہ ہو گیا بلکہ انھیں دفنا بھی دیا گیا۔

"۴ اپریل کی صبح ہمیں وزارت خارجہ کی بریفنگ میں شرکت کرنا تھی۔ ہم معمول کے مطابق صبح دس بجے جنرل ضیاالحق کو لینے آرمی ہاؤس پہنچے۔ وہ اس صبح بھی بالکل نارمل لگ رہے تھے۔ ہم راولپنڈی سے اسلام آباد روانہ ہوئے، تو صدر ضیا کی گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر میں بیٹھا جبکہ پچھلی نشست پر جنرل کے ساتھ بیٹھے۔ ملٹری سیکرٹری انھیں اس دن کی مصروفیات کے حوالے سے بریف کر رہے تھے، لیکن پھر اچانک گاڑی میں خاموشی چھا گئی۔ میں نے ہلکا سا سر گھما کر پیچھے دیکھا، تو مجھے ملٹری سیکرٹری دعا کے انداز میں دونوں ہاتھ اٹھائے منہ میں کچھ پڑھتے نظر آئے۔ (بعد میں ملٹری سیکرٹری نے بتایا کہ ضیاالحق کے کہنے پر دونوں بھٹو صاحب کے لیے فاتحہ خوانی کر رہے تھے۔) خیر انھیں دیکھ کر میں نے بھی ہاتھ اٹھا لیے۔ انہی لمحوں میں میری نظر سامنے پڑی، تو مجھے جیل کی وہ عمارت نظر آئی جہاں گزشتہ رات بھٹو کو پھانسی دی گئی تھی۔ جونہی ہماری گاڑی جیل کے مرکزی دروازے کے سامنے پہنچی، تو ضیاالحق کی آواز گونجی: "How Unfortunate!" (کس قدر بدقسمت تھا!) اور پھر اگلے ہی لمحے ہماری گاڑی آگے نکل گئی۔

("اعمال نامہ" ارشاد بھٹی۔ "جنگ" ۱۲ جنوری ۲۰۱۵ء)

جنرل مشرف اور جنرل کیانی

قذافی امریکی اداکارہ کوئین کے شیدائی نکلے

ایک دن شوکت عزیز کا ذکر چھڑا، تو (مشہور کاروباری شخصیت) باشوانی صاحب نے بتایا: "مشرف کا ابتدائی دور تھا اور میرے خلاف کئی انکوائریاں کھل چکی تھیں۔ مسٹر اینڈ بیگم شوکت عزیز کے ساتھ نیویارک میں ان کے فلیٹ پر میں اور میری بیگم لنچ کر رہے تھے کہ شوکت عزیز نے کہا "صدرو! اگر تم مشرف سے صلح کرنا چاہتے ہو تو ایک بلینک چیک کاٹ کر دے دو۔"

"کیوں دوں چیک؟ نہ میری کمائی حرام کی ہے اور نہ میں ڈاکو ہوں۔ تم بھی سن لو اور مشرف کو بھی بتا دینا۔ ایک پیسا بھی نہیں دوں گا اور اگر لڑنا پڑا، تو آخری سانس تک لڑوں گا۔" میں نے صاف صاف کہا۔

شوکت عزیز نے ان کا یہ پیغام مشرف تک پہنچا دیا۔ کچھ عرصہ بعد مشرف حکومت نے امریکا میں باشوانی کے پیچھے پرائیویٹ جاسوس لگا دیے۔ پھر پانچ ماہ بعد ہی انھیں اپنے ہوٹلوں کے شیئرز بیچ کر امریکا سے نکلنا پڑا۔ چند سال پہلے باشوانی آئل اور ہوٹلنگ کے کاروبار کے لیے لیبیا گئے، تو معمر قذافی ان سے بہت گرمجوشی سے ملے اور سب کو نظرانداز کر کے تمام وقت انھی سے گفتگو کرتے رہے۔ اس کے بعد باشوانی جب بھی لیبیا گئے، قذافی کی گرمجوشی بڑھتی ہی گئی۔

ایک عرصے بعد یہ راز کھلا کہ قذافی کا پسندیدہ اداکار انتھونی کوئین ہے۔ چونکہ باشوانی کی اس سے مشابہت ہے، اس لیے کرنل قذافی ان سے خصوصی برتاؤ کرتے۔ (کوئین قذافی کی سپانسرڈ فلم "لائن آف ڈیزرٹ" میں کام کرنے سے پہلے عرب ثقافت سیکھنے کے لیے قذافی کا مہمان بھی رہا تھا۔)

("اعمال نامہ" ارشاد بھٹی۔ "جنگ" ۲۵ نومبر ۲۰۱۳ء)

جتنا جلد ممکن ہو مشرقی پاکستان سے جان چھڑا لیں

المیہ مشرقی پاکستان سے تھوڑا عرصہ پہلے پروفیسر وارث میر نے پنجاب یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے عہدیداروں حفیظ خان اور جاوید ہاشمی کے وفد کے ساتھ دورہ کیا تھا۔ وہ اپنے نامکمل سفرنامے میں بنگالی محرومیوں کا ذکر کرتے ہوئے وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی ڈاکٹر محمود حسین کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"میرے ذاتی مشاہدے کی بات ہے کہ مغربی پاکستان کا سرکاری افسر اپنے حاکم ہونے کا تاثر دے کر بہت خوش ہوتا تھا اور بعض ذمے دار افسر تو بنگالیوں کو ان کے منہ پر گھٹیا، نیچ، ذلیل اور پسماندہ کہنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہی بنگالی مسلمان جو تحریک پاکستان میں سب سے آگے اور ہندوؤں سے نفرت کرتے تھے وہ مغربی پاکستان کے مسلمانوں کو اپنی جدوجہد میں شریک چیم سمجھتے تھے، قیام پاکستان کے بعد انہی مغربی پاکستانیوں سے شدید نفرت کرنے لگے اور پھر چند سیاست دانوں نے "بنگلہ دیش" کا نعرہ لگایا اور سینوں میں چھپی ہوئی تمام نفرتیں اور کدورتیں ان دو الفاظ میں ڈھل گئیں۔"

جنرل ضیا الحق اور وزیراعظم بھٹو

پروفیسر ڈاکٹر مہدی حسن "میرا رفیق، حریت فکر کا مجاہد" میں پروفیسر وارث میر کے دورۂ مشرقی پاکستان (۱۹۷۱ء) کے حوالے سے لکھتے ہیں: "واپسی پر میں نے ان سے مشرقی پاکستان کے متعلق پوچھا، تو وہ مجھے ایک جانب لے گئے اور سرگوشی کے انداز میں کہا: مجھے صورت حال میں بہتری کا امکان نظر نہیں آتا۔ یوں سمجھو مشرقی پاکستان گیا۔"

متحدہ بنگال کے وزیر اعظم اور تحریک پاکستان کے راہنما حسین شہید سہروردی کی یادداشتیں آکسفرڈ نے Memoirs of Huseyn Shaheed Suhra Wardy کے نام سے شائع کی ہیں۔ مصنف محمد ایچ آر تعلقدار کو یہ نامکمل یادداشتیں سہروردی مرحوم کے بیٹے راشد سہروردی (لندن) نے مہیا کی تھیں۔ راشد سہروردی کہتے ہیں: "لندن میں قیام کے دوران میں مغربی پاکستان کی زیادتیوں پر زور وشور سے دلائل دے رہا تھا، تو میرے والد نے انتہائی آہستگی اور اختصار سے میرے تمام نکات کو دلائل کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اگرچہ میرے دلائل کی تاریخی بنیاد سے اتفاق کیا، مگر ان میں موجود تعصب، لاعلمی اور خطیبانہ زورِ بیان کو رد کر کے اسے حقیقت کا رنگ دے دیا۔ (صفحہ xviii)

اسی کتاب کے مطابق حسین شہید سہروردی نے اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ اگر آئینی راستے بند رکھے گئے، تو مشرقی پاکستان میں عوامی تحریک اٹھے گی۔" (صفحہ ۲۱۴)۔ آکسفرڈ ہی نے شیخ مجیب الرحمٰن کی یادداشتیں The Unfinished Memoirs کے نام سے شائع کی ہیں۔ وہ پاکستان کے حق میں سلہٹ کے تاریخی ریفرنڈم کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: "سلہٹ ریفرنڈم جیتنے کے بعد ہم جونہی کلکتہ پہنچے، تو پتا چلا کہ مسلم لیگ کے ایک دھڑے نے فیصلہ کیا تھا کہ بنگال مسلم لیگ (کی صدارت) کے لیے سہروردی کے مقابلے میں خواجہ ناظم الدین انتخابات لڑیں گے۔" (صفحہ ۸۰) بعدازاں سہروردی ہار گئے اور خواجہ ناظم الدین جیت گئے۔ ولی خاں کی اس کہانی پر بھی غور کرنا چاہیے کہ گول میز کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا: جب میں نے ایوب خاں سے ہاتھ ملایا، تو مجھ سے کہا: "میں آپ کو نصیحت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ نے پاکستان بچانا ہے، تو جتنی جلد ممکن ہو مشرقی پاکستان سے جان چھڑا لیں۔" (چھوٹے صوبے پنجاب سے ناراض کیوں؟" صفحہ ۳۳) ظاہر ہے یہی وہ سوچ تھی جس نے پاکستان کو دولخت کیا۔

سانحہ ارتحال

میرے شوہر، عبدالمنان خان اردو ڈائجسٹ کے بڑے مداح اور قاری تھے۔ کاروان علم فاؤنڈیشن کو مالی امداد دینے میں پیش پیش رہے۔ مگر کچھ عرصہ قبل مالی مشکلات کی وجہ سے یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔ میں بڑے دکھ کے ساتھ آپ کو یہ اطلاع دے رہی ہوں کہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا یہ روشن ستارا ۱۷ جولائی ۲۰۱۵ء کو اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

قارئین اور کاروان علم فاؤنڈیشن کے طلبہ و طالبات سے بھی دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

(آمنہ عبدالمنان خان)

("فیضِ عام" سہیل وڑائچ۔ "جنگ" ۱۰ دسمبر ۲۰۱۴ء)

کالم نگار نے کالم کے آخر میں یہ بھی لکھا ہے کہ "المیہ مشرقی پاکستان کے بارے میں ہمیں سچ بولنا چاہیے" لیکن وہ خود اور دیگر قلمکار جن کے ذہنوں پر بھٹو پرستی کا خول چڑھا ہوا ہے، یہ سچ کبھی نہیں بولیں گے کہ ذوالفقار علی بھٹو نے عام انتخابات کے تین ماہ بعد بلائے جانے والے قومی اسمبلی کے اجلاس (ڈھاکہ ۳ مارچ ۱۹۷۱ء) کا بائیکاٹ کر کے اور ڈھاکہ جانے والوں کی ٹانگیں توڑ دینے کا اعلان پاکستان کے دونوں بازوؤں کو متحد رکھنے کے تمام راستے بند کر دیے تھے اور اگلے ماہ جنرل ٹکا خاں کے ظالمانہ آرمی آپریشن پر یہ کہہ کر اظہار اطمینان کرنے والا بھی بھٹو ہی تھا اور یہ کہ پاکستان کو توڑنے میں جنرل یحییٰ کے ساتھ بھٹو "ہم پیالہ" اور برابر کا شریک تھا۔ آخر برطانیہ سے اسکاٹ لینڈ اور کینیڈا سے کیوبیک مختلف زبان ہونے اور "محرومیوں" کے باوجود الگ کیوں نہیں ہوئے؟ اس لیے کہ وہاں کوئی بھٹو پیدا نہیں ہوا جو عام انتخابات میں اکثریت حاصل کرنے والی جماعت کا مینڈیٹ تسلیم کرنے سے انکار کر کے جرنیلوں کو آرمی ایکشن کرنے کی راہ دکھائے۔

انسان کی ہوس اور بے بسی، دو متضاد جذبے آشکار کرتا یادگار افسانہ

کرشن چندر

اس سڑک پر پہلی عمارت سات منزلہ ہے۔ پھر چار منزلہ عمارتوں کی لمبی قطار بہت دور تک چلی گئی ہے۔ میرے دوست نے سات منزلہ عمارت کے قریب رک کر مجھ سے کہا "وہ دیکھو سڑک کنارے جامن کے پیڑ تلے جو موچی بیٹھا ہے نا....."

"ہاں!"

"یہ سات منزلہ عمارت پانچ سال پہلے اسی موچی کی تھی!"

"کیسے..... کیسے؟" میں نے اپنے سے پوچھا۔

"یہ تم اسی موچی سے پوچھو۔" میرا دوست بولا۔

مگر اس وقت پوچھنے کا موقع نہیں تھا۔ ہم دونوں ایک انٹرویو کے لیے اسی عمارت کی پانچویں منزل پر جا رہے تھے۔ جب ناکام ہو کے لوٹے، تو میرا دوست تو دنیا سے اس قدر خفا اور بیزار ہوا کہ اس نے میرا انتظار بھی نہیں کیا۔ اپنا انٹرویو ختم کر کے چلتا بنا، حالانکہ معاملہ صرف ڈیڑھ سو روپے کی ملازمت کا تھا۔

میں ٹہلتا ٹہلتا موچی کے پاس چلا گیا۔ وہ عمارت کی طرف پیٹھ کیے، پیڑ کے نیچے اپنا سامان رکھے، آلتی پالتی مارے بدھ کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کا جسم کمر تک ننگا تھا۔ نیچے صرف ایک دھوتی تھی۔ سانولے سینے کے بال کھچڑی تھے۔ تانت کی تھی۔

ہاتھ کھردرے اور چہرہ گول مٹول تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی، بے حد چمکیلی اور مسکراتی ہوئی سی تھیں۔ وہ اپنی ہیئت اور شخصیت سے کسی طرح سات منزلہ عمارت تو کجا سات گز زمین کا مالک بھی معلوم نہ ہوتا تھا...... اُس کی شخصیت میں کوئی خاص بات نہ تھی، سوائے اس کے کہ اس کی صحت بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ مگر ایسے صحت مند اور کسرتی جسم تو اس شہر میں لاکھوں ہوں گے ...... سات منزلہ عمارت کتنوں کے پاس ہوگی؟

"پالش کہ مرمت؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"دونوں!" میں نے جواب دیا۔

موچی نے میرے جوتے اتار لیے اور انھیں الٹ پلٹ کے غور سے دیکھنے لگا۔ میں نے سوچا، یقیناً میرے دوست نے مجھ سے مذاق کیا ہے۔ پھر خیال آیا، آخر پوچھ لینے میں ہرج ہی کیا ہے؟

"میں نے سنا ہے، تم بھی اس سات منزلہ عمارت کے مالک تھے؟"

موچی نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ بڑے اطمینان سے میرے جوتے الٹ پلٹ کر انھیں بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ جیسے جوتے دیکھنے کے بجائے انھیں پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر اس نے نگاہ اٹھا کر میرے چہرے کی طرف دیکھا، گویا جوتے کا چمڑا پڑھنے کے بعد میرے چہرے کا چمڑا پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

معلوم نہیں، اس نے کیا دیکھا، کیا پڑھا۔ وہ آہستہ سے مسکرایا اور بولا "معلوم ہوتا ہے اس شہر میں نئے نئے آئے ہو۔"

"ہاں، ملازمت کی تلاش میں آیا تھا!"

"اور وہ ملی نہیں۔" موچی نے پھر کہا۔

"ہاں، مگر تمھیں کیسے معلوم ہے؟" میں نے پوچھا۔

موچی نے لکڑی کا ایک چھوٹا سا کھردرا اسٹول میرے لیے پیڑ کے سائے میں رکھ دیا۔ پھر میرا جوتا لکڑی کے ایک اڈے میں الٹا پھنساتے ہوئے بولا "اس اسٹول پر بیٹھ جاؤ اور سنو۔ میں عام طور پر سناتا نہیں...... مگر تم حقدار ہو سننے کے......

"میں تمھیں اپنی پرانی زندگی کا صرف آخری واقعہ سناؤں گا، جب میں چالیس برس کا تھا، میں نے زمانے کے سرد و گرم سے گزر کر ٹھیکے، پرمٹ، کوٹے، اسمگلنگ، بے ایمانی، رشوت، دھمکی، عاجزی، خوشامد، چاپلوسی، دھوکا دھڑی غرض ہر طرح کی تکڑم استعمال کر کے پانچ کروڑ روپیا اکٹھا کر لیا۔ یہ کوئی معمولی رقم نہیں اور کسی معمولی بے ایمانی سے نہیں ملتی۔ اس کے لیے ایمان داری کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ایسی ایمان داری، جو بے ایمانی کی طرح استعمال ہو سکے اور بہت سا سچ چاہیے، جسے جھوٹ کی طرح خرچ کیا جا سکے۔ تم اسے نہیں سمجھو گے...... ڈیڑھ سو روپے کی ملازمت تلاش کرنے والے اسے نہیں سمجھ سکتے۔ اتنی بڑی رقم حاصل کرنے کے لیے جھوٹ اور سچ، معصیت اور معصومیت، نیکی اور گناہ کو آئن اسٹائن کی اضافیت کی طرح استعمال کرنا پڑتا ہے۔"

میں چونک گیا۔

موچی نے میرے جوتے کا تلا گیلا کیا۔ اور پھر بولنے لگا "لیکن کبھی میں بھی بڑی کومل تھا۔ میری جلد بڑی نازک تھی اور ذرا سی بے ایمانی مجھے گرم لُو کی طرح جھلسا دیتی۔ اور صبح کی ہوا میرے لیے آسمان کی خوش بُو میں لاتی۔ اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ آسمان کی طرف دیکھنا بھی ایک سزا ہے۔

"پچاس برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے میری کھال موٹی اور کھردری ہو گئی۔ اب مجھ پر کسی لُو کا اثر ہوتا تھا، نہ کسی خوش بُو کا۔ میں نے دس کروڑ روپے کما لیے اور یہ سات منزل عمارت، جو تم عقب میں دیکھ سکتے ہو، یہ بھی کھڑی کر لی۔ اور بہت سی جائداد بھی...... وزیر لوگ مجھے لینے ہوائی اڈے آتے۔ میں نے سوچا، اب میں سب کچھ اور سب کو خرید سکتا ہوں۔"

"اور پھر دس کروڑ روپے اپنی مٹھی میں رکھ کر جو میں خریدنے کو نکلا تو معلوم ہوا، ہر چیز بکتی ہے...... سیاست، مذہب، اخلاق، شہرت، دوستی، وفاداری، خوب صورتی، عشق، ادب، سائنس، شاعری...... ہر چیز مناسب بھاؤ سے بکتی ہے۔ دام لگاتے جائیے، مال اٹھاتے جائیے۔ یہ جان کر دماغ اور بھی خراب ہو گیا اور میں ہر ایک کو جوتے کی نوک پر رکھنے لگا۔

"میرے دوست رام دیال ترپاٹھی نے مجھے بہت سمجھایا، تم زندگی کو بالکل غلط سمجھ رہے ہو۔ سٹے، کوٹے، پرمٹ، لائسنس اور اسمگلنگ کے دھندوں نے تمھاری مت ماردی ہے...... زندگی کی اخلاقی قدروں سے تمھارا ایمان اٹھ گیا ہے۔ تم سب کو اپنے ایسا ہی چور اور غرض کا بندہ سمجھتے ہو، حالانکہ آج بھی اس دنیا میں، اسی شہر میں سیکڑوں لوگ ایسے بستے ہیں جنھیں تمھارے روپے کی بالکل پروا نہیں اور جو تمھیں اور تمھارے روپے کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہیں۔

"یہ سن کر میں زور سے ہنسا۔ میری ہنسی سن کر ترپاٹھی کا چہرہ تمتمانے لگا۔ بولا، مجھی کو دیکھو...... کیا میں نے کبھی تمھارے دس کروڑ روپوں سے ایک کوڑی بھی مانگی ہے؟"

میں نے کہا "تم بےوقوف ہو!"

"میری طرح بےوقوف اور اپنی عزت نفس کی خاطر اپنی آن پرست جانے والے اس شہر میں لاکھوں لوگ موجود ہیں۔" وہ بولا

"مجھے یقین نہیں۔" میں نے کہا۔

"آزما کر دیکھو۔" وہ بولا۔

"مجھے فوراً ایک ترکیب سوجھی۔ روپے کی گرمی تھی۔ دماغ بھی گرم تھا...... میں نے اسی وقت ایک اسٹینو کو بلا کے ایک اشتہار کا مسودہ اسے بتایا، جو دوسرے دن 'ٹائمز' میں چھپ بھی گیا۔ اس میں لکھا تھا:

"جوتے کھانے والے کو پانچ سو روپے انعام!"

"جو شخص راقم الحروف سے دس جوتے کھائے گا، اسے پانچ سو روپے انعام دیا جائے گا۔ جوتے کھانے کا وقت وہی ہے جو دفتر کا ہے۔ یعنی صبح دس بجے سے شام پانچ بجے تک۔ جوتے کھانے والے ملاقاتی اپنی بی اے کی ڈگری ساتھ لائیں۔ بی اے کی ڈگری اور اپنا فوٹو دونوں ساتھ لانا لازمی ہے ورنہ جوتے نہیں پڑیں گے۔"

گوری چرن ہاگریا

مالابار ہل روڈ، بمبئی

دوسرے دن 'ٹائمز' میں اشتہار دیکھ کر رام دیال ترپاٹھی دوڑا دوڑا میرے پاس آیا۔ بولا "یہ کیا حماقت ہے؟"

"میں نے کہا، تمھیں معلوم ہے، ہمارے ملک میں جوتے کھانا کس قدر معیوب سمجھا جاتا ہے۔ آپ ایک آدمی کی بیوی بھگا سکتے ہیں لیکن اسے جوتے نہیں مار سکتے۔ پہلی بات وہ شاید برداشت کرلے...... دوسری نہیں...... ہرگز نہیں...... کسی طرح نہیں۔"

"ہاں، یہ تو سچ ہے۔" ترپاٹھی نے اقرار کیا۔

"اسی لیے میں نے اشتہار دیا ہے۔ میں تمھیں دکھانا چاہتا ہوں کہ زندگی کی قدریں کس قدر بدل گئی ہیں۔"

"مگر یہ بی اے کی قید کیوں؟" اس نے پوچھا۔

"کیونکہ مجھے غریبوں پر بھروسا نہیں۔ غریب کا اخلاق کیا اور اس کی اوقات کیا؟ وہ تو دس روپے کی خاطر دس جوتے کھانے پر

جب قائداعظم نے مسجد کا مقدمہ لڑا

قائداعظم ہمیشہ بے لوث اور حق کی حمایت میں وکالت کرتے رہے، روپے کی بدولت نہیں۔ ہندوستان کے ایک شہر میں بڑی مسجد تھی۔ اس کا متولی عیاش ہو گیا۔ لوگوں نے ٹھان لیا کہ اس کو ہٹایا جائے۔ وہ بڑا بااثر تھا۔ مسجد کی جائداد اس زمانے میں کئی لاکھ کی تھی۔ جب متولی کو لوگوں کی نیت کا علم ہوا تو بمبئی کے مشہور بیرسٹر محمد علی جناح کے پاس گیا اور اپنا ماجرا سنایا تاکہ ان کو اپنا وکیل بنائے۔ چوں کہ وہ بددیانت آدمی تھا محمد علی جناح نے بطور وکیل ہامی نہیں بھری۔ محلے دار لوگوں کو جب جناح کی صداقت کا علم ہوا تو وہ ان کے پاس مقدمہ کے لیے آئے کہ وہ سنجیدہ وکالت کریں۔ قائداعظم نے مسجد کی حفاظت کے لیے کیس لیا۔ جج کی عدالت نے جائداد کے لیے چار رکنی کمیٹی بنانے کا فیصلہ کیا جو سنجیدگی سے جائداد کا فیصلہ کرے۔ متولی چند روز بعد مر گیا۔ محلے دار ۱۰ ہزار روپے لے کر جناحؒ کے پاس آگئے۔ انھوں نے کوئی فیس قبول نہیں کی۔ مسجد کا معاملہ تھا۔ اللہ کے گھر سے فیس نہیں لی جا سکتی۔

تیار رہتا ہے۔ اسی لیے میں نے شریفوں کے لیے اشتہار دیا ہے تاکہ تم پر شرافت کی قلعی اچھی طرح کھل جائے۔"

"ترپاٹھی چپ ہو گیا۔ ہم دونوں انتظار کرنے لگے۔ گیارہ بج گئے، بارہ بجے، دو بجے اور پھر تین بج گئے... ایک بھی آدمی جوتے کھانے حاضر نہیں ہوا۔ جب چار بجے تو ترپاٹھی زور زور سے ہنسنے لگا۔ مجھے غصہ تو بہت آیا، مگر کیا کرتا، خاموش بیٹھا رہا۔ ساڑھے چار بجے کے قریب ایک دبلا پتلا نوجوان، جو شکل و صورت سے بے حد فاقہ زدہ معلوم ہوتا تھا، ڈرتے ڈرتے انٹرویو کے لیے آیا۔ اس نے اپنی ڈگری دکھائی، فوٹو دکھایا پھر بولا "جوتے کھانے کے لیے کسی پرائیویٹ کیبن کا بندوبست کیا ہے آپ نے؟"

"نہیں جناب!" میں نے بڑی سختی سے کہا۔ "جوتے سرِعام پڑیں گے، عوام کے سامنے۔ اس عمارت کے باہر میدان میں۔"

"وہ کچھ لمحے سوچتا رہا۔ عجب پس و پیش میں تھا۔ پھر اس نے ایک آہ بھری۔ اپنی بی اے کی ڈگری کو تہ کیا۔ فوٹو جیب میں رکھا اور کچھ کہے سنے بغیر چلا گیا۔

ترپاٹھی خوشی سے چیخنے لگا۔

"اور میں سوچنے لگا؟ سوچ سوچ کر میں نے کہا، غلطی میری ہے۔ میں نے انعام اس قدر کم رکھا ہے۔ ناگرو کو غریب لوٹ تو پڑھتے ہی نہیں ورنہ اب تک بھیڑ سے جوتے کھانے آجاتے۔ اور جو لوگ ناگرو پڑھتے ہیں ان کے لیے پانچ سو کی رقم بہت کم ہے۔ غالباً عزتِ نفس کی فروخت کے لیے یہ شرح بہت کم ہے میں اسے بڑھائے دیتا ہوں۔

"دوسرے دن اشتہار میں، میں نے نرخ بڑھا کے ایک ہزار روپے کر دیے۔ پھر بھی صرف تین آدمی آئے۔ تیسرے دن میں نے نرخ اور بڑھا کے دو ہزار کر دیے اب کے پانچ آدمی آئے، یعنی کل آٹھ آدمی ...... سارے شہر میں سے۔ میں غصے سے دانت پیسنے لگا۔ میرا فلسفہ ناکام ہوا جا رہا تھا اور اُدھر ترپاٹھی مجھے دیکھ کر قہقہے لگا رہا تھا۔

آپ نے ترپاٹھی کی تقاضا جی سنی تھی ورنہ آپ وہی کرتے جو آگے چل کر میں نے کیا...... میں نے ترپاٹھی سے صلاح مشورہ کیے بغیر انعامی رقم دس ہزار کر دی اور جوتوں کی تعداد بڑھا دی ...... جو شخص مجھ سے پچاس جوتے کھائے گا، اسے دس ہزار روپے یک مشت ملیں گے۔ یہ پیشکش صرف دو دن کے لیے تھی۔"

"دوسرے دن سویرے آٹھ بجے کے قریب ترپاٹھی بھاگا بھاگا میرے پاس آیا۔ اس کا رنگ فق تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"عمارت کے باہر دو سو آدمی قطار لگا کر کھڑے ہیں اور ابھی صرف آٹھ بجے ہیں۔"

"میں خوشی سے چیخنے لگا۔ "گھبراؤ نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں نے بینک سے پچاس لاکھ روپے منگا لیے ہیں۔ میں تمھیں سبق دینا چاہتا ہوں۔ اگر ایک کروڑ روپے بھی صرف ہو جائیں تو مضائقہ نہیں۔"

"دس بجے کے قریب قطار اتنی لمبی ہو گئی کہ پولیس کو بلوانا پڑا اور ایک مجسٹریٹ کو بھی...... مجسٹریٹ ایک ڈاکٹر بھی ساتھ لیتا آیا کہ اسے میری ذہنی حالت کے مخدوش ہونے کا شبہ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے میرا دماغی معائنہ کر کے مجھے صحت مند قرار دیا، البتہ اتنا ضرور کہا کہ دماغ ضرورت سے زیادہ گرم ہے۔ میں اپنا کمپوڈر یہاں چھوڑے جا رہا ہوں۔"

ڈاکٹر پھر ذرا سا مسکرایا۔ اپنا سامان سنبھالتے ہوئے بولا، اسے بھی ذرا ... جوتے کھانے کا شوق ہے۔ امید ہے، آپ اسے ناامید نہیں کریں گے۔"

"ڈاکٹر چلا گیا، تو باقاعدہ طور پر جوتے مارنے کا پروگرام شروع ہوا...... مجسٹریٹ اور اس کے ساتھ دو جیوڈیشل کلرک آنے والے کو دیکھتے تھے اور اس سے ایک فارم پر دستخط کراتے۔ اس پر لکھا تھا "میں خود اپنی مرضی سے پچاس جوتے کھا رہا ہوں۔ اس کی اخلاقی یا مالی ذمے داری میرے سوا کسی پر عائد نہیں ہوتی۔"

''اس کے بعد میں جوتے مارتا تھا۔''

''اشرافیہ میں سے ہر سطح کے لوگ آ رہے تھے، ہر مذہب اور ہر قوم کے، ہر رنگ، ہر عمر اور ہر پیشے کے۔ میں ہر ایک کو جوتے مارتا اور رامدیال تریاٹھی کی طرف فخریہ انداز سے دیکھتا۔ وہ تھا کہ زمین میں گڑا جا رہا تھا اور مارے شرم کے مجھ سے آنکھ نہ ملا پاتا...... دوپہر کے قریب وہ کہیں غائب ہو گیا مگر اس وقت تک قطار اتنی لمبی ہو گئی کہ ترزر روڈ، پھر مارٹن روڈ کے ناکے سے نکل کر ریالٹو سینما کے چوک تک پہنچ چکی تھی۔

لوگوں کا وہ اژدحام تھا، وہ ہجوم غفیر کہ پولیس کو دو بار لاٹھی چارج کرنا پڑا کیونکہ دیر میں آنے والے لوگ آگے والے حصے میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جوتا کھانے کے لیے آپس میں وہ جوتا چلا کہ الامان!

''تین بجے کے قریب میرا جوتا ٹوٹ گیا۔ میں نے یہ تماشا بند کر دینا چاہا۔ مگر میرے سامنے اس وقت ایک سفید ریش بڈھا کھڑا تھا۔ وہ زار و قطار روتے ہوئے کہہ رہا تھا ''مجھے جوتے مارو، مگر مجھے دس ہزار روپے دے دو۔''

''مگر میرا جوتا ٹوٹ گیا ہے۔''

''اس نے اپنے پاؤں سے پھٹا چپل نکالا اور میرے ہاتھ میں دے کر بولا ''کوئی بات نہیں، میرا جوتا لے لو۔ مجھے میرے ہی جوتے سے مارو۔ مگر مجھے دس ہزار روپے دے دو۔ میں اپنی بیٹی کی شادی کروں گا۔''

''اس کے پیچھے ایک بڈھی کھڑی تھی۔

''میں نے بڈھے کو بھگتا کے اس سے پوچھا، اماں! تو یہاں کیا کرنے آئی ہے؟''

''جوتے کھانے آئی ہوں، بیٹا!'' وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

''تو تو ماں ہے۔ اپنی عمر دیکھ۔ اپنے سفید بال دیکھ۔ تو عورت ہے۔ میں تجھے کیسے جوتے مار سکتا ہوں؟''

''عورت تو سدا سے مرد کے پاؤں کی جوتی رہی ہے، چاہے وہ گر یجوایٹ کیوں نہ ہو جائے۔ بیٹا! مجھ پر اتنا ظلم نہ کر۔ مجھے جوتے مار۔ پچاس کے بجائے سو جوتے مار لے، مگر مجھے دس ہزار روپے دے ڈال۔ میں اس دنیا میں اکیلی ہوں۔ دس ہزار سے میرا بھلا ہو جائے گا۔''

''وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر مجھے دعائیں دینے لگی۔

''ٹھیک شام پانچ بجے میں نے جوتے مارنا بند کر دیا۔ مگر لوگوں کی بھیڑ کسی طرح کم نہ ہوئی۔ ترزر روڈ پر ایک میلا سا لگ گیا۔ بالکل کسی مذہبی یا قومی تیوہار کا سماں تھا۔ خوانچے، ریڑھی اور چھابڑی والے طرح طرح کی صدائیں لگانے لگے کیونکہ کھڑے ہونے والے لوگوں نے رات بھر وہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کوئی شخص اپنی جگہ سے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔

قطار میں کھڑے ہونے والوں کی جگہ لینے کے لیے سودے ہونے لگے۔ پانچ سو سے لے کر پانچ ہزار تک بولی دی جانے لگی۔ لوگوں نے اپنے گھروں سے کمبل اور بستر منگا لیے۔ چائے والے گرم گرم چائے اور نان خطائی بیچتے پھرتے تھے۔ سگریٹ اور پان، کباب اور تکے، پوری اور بھاجی! سوڈا اور کولا، بلکہ کھڑے تک کی بوتلیں بکنے لگیں۔ انعام حاصل کرنے کے لیے سنڈیکیٹ بن گئے اور کئی امیر لوگوں نے، جو خود آنے میں عار محسوس کرتے تھے، دس، بیس، تیس، چالیس چالیس غنڈے قطار میں گھسا دیے۔ ان غنڈوں کو صرف ایک ہزار روپیا ملے گا۔ باقی سب سیٹھوں کی جیب میں جائے گا۔ راتوں رات بی اے کی ڈگری کے نرخ بڑھ گئے۔ جس ڈگری پر ڈیڑھ سو کی ملازمت نہیں مل سکتی تھی، اسی ڈگری کے کاغذ کے لیے ڈیڑھ ہزار روپے تک کی پیش کش آنے لگی۔

تریاٹھی کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ رات بھر وہ میرے پاس نہیں آیا، صبح بھی نہیں۔ دس بجے پھر سے جوتے مارنے کا پروگرام شروع ہوا۔ اب کے پولیس کا بندوبست زیادہ تھا، اور مجسٹریٹ بھی تعینات تھے۔ گیارہ بجے کے قریب ایک آدمی اپنے منہ پر چادر ڈالے میرے سامنے جوتے کھانے کے لیے پیش ہوا۔ میں نے

اعتراض کیا، جب تک منہ سے چادر نہ ہٹائی جائے گی۔ میں جوتے نہیں ماروں گا۔"

"بہت پس وپیش کے بعد اس آدمی نے اپنے منہ سے چادر ہٹائی...... یہ ادا مویال تریاٹھی تھا۔"

"تم......؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں!" وہ کھسیانا ہو کر بولا، مجھے سبق مل گیا ہے۔ اب تم یہ کھیل بند کر دو۔"

"کیسے بند کر سکتا ہے؟" ترپاٹھی کے پیچھے کھڑا ہوا ایک شخص بڑے تلخ لہجے میں چلایا۔

"میں نے آگے جھک کر دیکھا...... یہ شہر کا سب سے بڑا ٹھیکے دار سیٹھ ماتا پرشاد تھا جس نے میری یہ سات منزلہ عمارت تعمیر کی تھی۔

"تم یہاں کہاں سیٹھ؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ارے، میونسپل کارپوریشن کے دس ہزار جوتے کھا کے ایک ٹھیکا ملتا ہے۔ میں نے کہا چلو، اپنے یار سے پچاس جوتے کھا کے دس ہزار لے لیں گے، پانچ منٹ میں۔ کیا برا سودا ہے؟"

"میں نے کہا، مگر میرے بینک میں تو میرے پانچ کروڑ جو جمع تھے، وہ سب ختم ہو چکے۔"

"کوئی مضائقہ نہیں...... یہ عمارت بیچ دو۔ میں خریدتا ہوں۔"

"میں نے کہا، میں جوتے مارتے مارتے تھک گیا ہوں۔"

"جوتے تو تمھیں مارنے ہی پڑیں گے۔"

"ہم تو جوتے کھانے کے لیے آئے ہیں اور جوتے کھا کر ہی جائیں گے۔" قطار میں کھڑے بہت سے لوگ چلائے۔ پیچھے سے کسی نے نعرہ لگایا "جوتا زندہ باد" اور سیکڑوں لوگ جوتا زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے میں ایجی ٹیشن اور وٹنگ کی فضا پیدا ہو گئی۔

پھر باہر سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ ہنگامہ بڑھتا جا رہا تھا۔ شاید لوگوں کو پتا چل گیا تھا کہ میں مزید انعام بانٹنے سے انکار کر رہا ہوں۔ دو آدمی گولی لگنے سے ہلاک ہو گئے۔ مجسٹریٹ نے کہا، تمھاری پیشکش دو دن کے لیے ہے۔ تم لوگوں کو جوتا کھانے سے نہیں روک سکتے ورنہ شدید بلوا ہو جائے گا۔

"میں نے دو کروڑ مالیت کی عمارت ڈیڑھ کروڑ روپے میں سیٹھ ماتا پرشاد کے ہاتھ اسی وقت بیچ دی اور پھر جوتا چلنا شروع ہو گیا۔

تین بجے تک باقی عمارتیں بھی نیلام ہو گئیں۔ اب صرف ایک بینک کے حصے بچ گئے تھے۔ اس لیے میں بہت دھیرے دھیرے جوتے لگا رہا تھا کہ کسی طرح پانچ بجا دوں اور بینک بچا لوں مگر چار بجے کے قریب بینک کے حصے بھی فروخت کر دینے پڑے۔ جب پانچ بجے تو میرا کل اثاثہ ختم ہو چکا تھا...... میں جوتے بغل میں دبا عمارت سے باہر نکل آیا۔

شام ہو رہی تھی اور لوگ اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے۔ سڑک کی حالت ایک ایسی لٹی پٹی شاہراہ کی تھی جس پر ابھی ابھی فرقہ وارانہ فساد ہو چکا ہو...... عمارت کے باہر اسی جامن کے پیڑ کے نیچے گھسیٹو موچی جوتے بنا رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا:

"ارے گھسیٹو! تو نہیں آیا جوتے کھانے کے لیے؟"

"گھسیٹو میری طرف دیکھ کے بڑی سادگی سے بولا، سرکار! جوتے بناتا ہوں...... جوتے کھاتا نہیں۔"

"اس کی سادگی میرے دل کو لگ گئی...... میں وہیں اس کے پاس اس اسٹول پر بیٹھ گیا جس پر تم بیٹھے ہو۔ جب سے میں یہیں ہوں...... مجھے لوگوں نے طرح طرح سے مدد دینی چاہی۔ میرا کاروبار پھر سے شروع کرانا چاہا مگر میں نے انکار کر دیا کیونکہ مجھے بھی بدھ کی طرح گیان حاصل ہو چکا تھا۔"

موچی نے میرے جوتے کو ماتھے سے لگایا پھر اسے بڑی محبت سے بوسہ دیا اور بولا "تب سے میں اسی پیڑ تلے بیٹھ کر جوتے بناتا ہوں اور ہر روز جوتے کو سلام کرتا ہوں، جوتے کو، جو اس عہد کا آقا ہے اور جو روٹی ہے۔"

◆◆◆

جاتا ہے، مصور اپنے احساسات رنگوں جبکہ شاعر

کہا اپنے جذبات، احساسات اور مشاہدات کو الفاظ سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ اسی لیے لفظ شعر "شعور" سے نکلا۔ ہم آپ کو چند اشعار اور اُن کے دلچسپ تاریخی پس منظر سے آگاہ کر رہے ہیں۔ مضمون کی تیاری میں محمد شمس الحق کی تالیف "اردو کے ضرب المثل اشعار تحقیق کی روشنی میں" اور چند مستند ادبی رسائل سے استفادہ کیا گیا۔

☆☆

غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری
(رام نرائن موزوں)

اس شعر کے خالق راجا رام نرائن موزوں مشہور شاعر، شیخ علی حزیں کے شاگرد اور بہار میں سکونت رکھتے تھے۔ فارسی میں شعر کہتے۔ کبھی کبھی اردو میں بھی کہہ دیتے۔ بنگال کے عظیم مجاہد سراج الدولہ کی شہادت پر روتے روتے درج بالا شعر کہا۔ شعر میں غزالاں سے مراد سراج الدولہ کے ساتھی ہیں۔ مجنوں اور دیوانہ سراج الدولہ کے لیے استعارے ہیں۔ جبکہ ویرانے سے مراد عظیم آباد کی تباہی لی گئی ہے۔ شاعر نے دوسرے مصرع میں گزرا استعمال کیا ہے لیکن لوگ گزری پڑھتے ہیں۔

☆☆

مشہور اشعار اور اُن کا تاریخی پسِ منظر

عوام و خواص میں پھیلی چند غلط فہمیوں کا منفرد ازالہ

احمد وقار

اے شمع جلن کی تدبیر سے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

کچھ خوفِ روزِ حشر ہے دل میں ترے امیر
ہے زندگی سے موت برابر لگی ہوئی

[illegible]

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُس کو فلک نے لوٹ کر ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

(میر تقی میر)

مولانا محمد حسین آزاد اپنی کتاب ''آبِ حیات'' میں لکھتے ہیں ''لکھنؤ میں پہنچ کر جیسا مسافروں کا دستور ہے، ایک سرائے میں میر تقی میر اُترے۔ معلوم ہوا کہ آج وہاں ایک جگہ مشاعرہ ہے۔ رہ نہ سکے، اسی وقت غزل لکھی اور مشاعرے میں شامل ہوئے۔ جب داخلِ محفل ہوئے، تو وہ شہر لکھنؤ، نئے انداز، نئی تراشیں بانکے

میر تھے جوان جمع، انھیں دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ میر صاحب بے چارے غریب الوطن، زمانے کے ہاتھ سے پہلے ہی دل شکستہ تھے۔ دل تنگ ہوئے اور ایک طرف بیٹھ گئے۔

شمع ان کے سامنے آئی، تو پھر سب کی نظر پڑی اور بعض اشخاص نے پوچھا کہ حضور کا وطن کہاں ہے؟ میر صاحب نے متذکرہ بالا قطعہ فی البدیہہ کہہ کر غزل طرحی میں داخل کیا۔ سب کو معلوم ہوا، تو بہت معذرت کی۔''

☆☆

شعلہ بھڑک اٹھا مرے اس دل کے داغ سے
آخر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

(مہتاب رائے تاباںؔ)

''آبِ حیات'' میں مولانا محمد حسین آزاد مرزا محمد رفیع سوداؔ کے متعلق رقمطراز ہیں:

''ایک دن سوداؔ مشاعرے میں بیٹھے تھے۔ لوگ اپنی اپنی غزلیں پڑھ رہے تھے۔ ایک شریف زادے کی بارہ تیرہ برس کی عمر تھی۔ اُس نے غزل پڑھی، مطلع تھا:

دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

گرمیِ کلام پر سودا بھی چونک پڑے۔ پوچھا، یہ مطلع کس نے پڑھا؟ لوگوں نے کہا، حضرت، یہ صاحبزادہ ہے۔ سوداؔ نے بھی بہت تعریف کی، بہت مرتبہ پڑھوایا اور کہا کہ میاں لڑکے! جوان ہوتے نظر نہیں آتے۔ خدا کی قدرت، انھی دنوں میں لڑکا جل کر مر گیا۔''

بعض ناقدین نے اس سارے قصے کو آزاد کا طبع زاد فسانہ کہا ہے۔ ان کے بقول یہ شعر اُس لڑکے کا ہے ہی نہیں بلکہ یہ پنڈت مہتاب رائے تاباںؔ دہلوی کے شعر کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ تاباںؔ، میر درد کے ہم عصر تھے۔ بعض تذکرہ نویس تاباںؔ، بعض تائبؔ اور بعض تابؔ لکھتے ہیں۔ مختار الدین احمد تابؔ کو درست کہتے ہیں۔ ایک کتاب ''آثار شعرائے ہنود'' مطبوعہ ۱۸۸۶ء میں تاباںؔ اور تابؔ کو الگ الگ شاعر کہا گیا ہے۔ دونوں کو برہمن لکھا ہے۔ تابؔ کشمیری الاصل تھے اور اُن کا نام مہتاب رائے تھا۔ تاباںؔ کے متعلق جن سے یہ شعر حقیقتاً منسوب ہے، لکھا ہے ''پنڈت مہتاب رائے بارہ برس کے تھے کہ انھوں نے میر دردؔ کے مشاعرے میں آ کر غزل پڑھی۔ مطلع یہ ہے ''شعلہ بھڑک اٹھا مرے اس دل کے داغ سے.....الخ''

☆☆

پگڑی اپنی سنبھالیے گا میرؔ
اور بستی نہیں یہ دلّی ہے

(بقا اللہ بقاؔ)

یہ شعر دہلی کے مشہور شاعر شاہ حاتم کے شعر کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس کے پہلے مصرع میں تصرف ہوا ہے، پہلا مصرع کچھ یوں ہے: ع پگڑی اپنی یہاں سنبھال چلو۔ شعر میں شاہ حاتم کے شاگرد بقا اللہ نے میر پر چوٹ کی ہے۔ پہلے مصرع میں میر آنے کی وجہ سے لوگ اسے میر تقی میر کا شعر کہتے ہیں۔

☆☆

شاہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثلِ برق
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں بل چلے

مرزا عظیم بیگ ایک دن میر ماشاء اللہ خان (انشاء اللہ خاں کے والد) کے پاس آئے۔ ایک غزل سنائی جو بحرِ رجز میں تھی، مگر ناواقفیت میں کچھ شعر بحرِ رمل میں جا پڑے۔ سید انشا بھی موجود تھے۔ تاڑ گئے، حد سے زیادہ تعریف کی اور اصرار سے کہا ''مرزا صاحب، اسے آپ مشاعرے میں ضرور پڑھیں۔'' مرزا عظیم بیگ نے یہ غزل مشاعرے میں پڑھی۔ سید انشا نے وہیں تقطیع کی فرمائش کر دی۔ مرزا صاحب پر جو گزری سو گزری، لیکن سید انشا کے سامنے دم نہ مار سکے۔ انشا نے ایک مخمس بھی پڑھا جس کا مطلع یہ ہے:

گر تو مشاعرے میں صبا آج کل چلے
کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی حد سے اپنی نہ باہر نکل چلے
پڑھنے کو یار شب جو غزل در غزل چلے
بحرِ رجز میں ڈال کے بحرِ رمل چلے

مرزا عظیم بیگ نے بھی گھر جا کر اس مخمس کا جواب لکھا اور مشاعرے میں پڑھا۔ اس کے کچھ شعر یہ ہیں:

وہ فاضلِ زمانہ ہو تم جامعِ علوم
تحصیلِ صرف و نحو سے جن کی مچی ہے دھوم
رمل و ریاضی، حکمت و ہیئت، جعفر، نجوم
منطق، بیان، معانی، ہیں سب زمیں کو چوم
تیری زباں کے آگے نہ دہقاں کا بل چلے
موزونی و معانی میں پایا نہ تم نے فرق
تبدیلِ بحر سے ہوئے بحرِ خوشی میں غرق
روشن ہے مثلِ مہر یہ از غرب تا بہ شرق
شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثلِ برق
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

آخری شعر کا پہلا مصرع عوام الناس میں یوں مشہور ہوا:
ع گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں

☆☆

اے خانِ رنج یار تجھے ٹھیک بناتا
جا چھوڑ دیا حافظِ قرآن سمجھ کر

(شاہ نصیر)

حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان مغل بادشاہ، شاہ عالم ثانی کی سرکار میں مختارِ کل تھے۔ دربار میں بارہا آپ کے شاہ نصیر سے اختلافات ہوئے۔ شاہ نصیر نے ایک مرتبہ کسی بات پر بگڑ کر درج بالا شعر کہا اور ان کے حافظِ قرآن ہونے پر چوٹ کی۔

☆☆

اے شمع، صبح ہوتی ہے، روتی ہے کس لیے
تھوڑی سی رہ گئی ہے، اسے بھی گزار دے

(حکیم آغا جان عیشؔ)

مولانا محمد حسین آزاد ''آبِ حیات'' میں رقم طراز ہیں: ''ایک دفعہ قلعہ (دہلی) میں مشاعرہ تھا۔ حکیم آغا جان عیشؔ کہ کہن سال،

مشاق، نہایت زندہ دل شاعر، استاد (ذوق) کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ زمین غزل تھی: یار دے، بہار دے، روزگار دے۔ حکیم آغا جان عیش نے ایک شعر اپنی غزل میں پڑھا۔ اُن (ذوق) کے ہاں بھی اس مضمون کا ایک شعر تھا، مگر رتبے کا لحاظ اور پاسِ مروت حد سے زیادہ تھا۔

میرے والد مرحوم پہلو میں بیٹھے تھے، اُن سے کہنے لگے کہ مضمون لڑ گیا ہے، اب میں وہ شعر نہ پڑھوں گا؟ انھوں نے کہا، کیوں نہ پڑھو؟ پہلے سے انھوں نے آپ کا مضمون سنا تھا، نہ آپ نے ان کا، ضرور پڑھنا چاہیے۔ اس سے بھی طبیعتوں کا اندازہ معلوم ہوتا ہے کہ منزل پر دونوں کی فکر پہنچی، مگر کس انداز سے پہنچی۔ چناں چہ حکیم صاحب مرحوم کے بعد ہی اُن (ذوق) کے آگے شمع آئی۔ انھوں نے پڑھا:

اے شمع، تیری عمرِ طبعی ہے ایک رات
رو کر گزار یا اسے ہنس کر گزار دے

کلیاتِ ذوق میں دوسرا مصرع یوں آیا ہے: ہنس کر گزار، یا اُسے رو کر گزار دے۔ غالباً سہوِ حافظہ کی وجہ سے آزاد نے دوسرے مصرع کی ترتیب بدل دی۔

☆☆

درم و دام اپنے پاس کہاں
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں
(غالب)

بقول مولانا محمد حسین آزاد، بحوالہ آبِ حیات، حسین علی خان کا چھوٹا لڑکا ایک دن کھیلتا کھیلتا مرزا غالب کے پاس آیا کہ دادا جان، مٹھائی منگا دو۔ آپ نے فرمایا کہ پیسے نہیں ہیں۔ وہ صندوقچہ کھول کر اِدھر اُدھر پیسے ٹٹولنے لگا۔ غالب نے پھر فی البدیہہ محولہ بالا شعر کہہ دیا۔

☆☆

اے صنم وصل کی تدبیر سے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے
(محمد رضا برق)

یہ شعر درج ذیل شکل میں آغا حشر کاشمیری سے منسوب ہے:

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

کہا جاتا ہے کہ آغا صاحب نے اپنے کسی ڈرامے میں موقع کی مناسبت سے مصرعِ ثانی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مصرعِ اولیٰ کہا۔ لیکن یہ شعر درحقیقت محمد رضا برق کا ہے۔

☆☆

اس دین کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

یہ صفی لکھنوی کا ایک یادگار ترانہ ہے۔ ۱۹۱۲ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنو میں، جس میں علامہ اقبال بھی موجود تھے، صفی لکھنوی نے یہ ترانہ پڑھا۔ اس ترانے میں زیرِ نظر ضرب المثل شعر اسی طرح نظم ہوا ہے۔ البتہ مصرعِ اولیٰ میں "اس دین" کے بجائے "اسلام" ہے۔ پوری نظم یوں ہے:

زندہ ہیں اگر زندہ دنیا کو ہلا دیں گے
مشرق کے سرا اٹھ کر مغرب سے ملا دیں گے
دھارے میں زمانے کے بجلی کا کرشمہ ہے
بہتے ہوئے پانی میں ہم آگ لگا دیں گے
ہم سینۂ ہستی میں انگارہ ہیں انگارہ
شعلے بھڑک اٹھیں گے، جھونکے جو ہوا دیں گے

ہم کون ہیں، ہم کیا ہیں، ہم کچھ بھی نہیں، لیکن
وقت آنے دو وقت آئے، پھر تم کو بتا دیں گے
دنیا کے سمندر میں ہم جزر بھی ہیں مد بھی
دیکھو جو ہمیں روکا طوفان اُٹھا دیں گے
مرجھائی ہوئی کھیتی اب ہم ہیں تو کیا ڈر ہے
چھینٹے ہمیں رحمت کے پھر نشو و نما دیں گے
ایران ہو یا ترکی دونوں کو مٹا ڈالیں
کیا صفحۂ ہستی سے اسلام مٹا دیں گے
اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے
گونجیں گی پہاڑوں میں تکبیر کی آوازیں
یہ صور جہاں پھونکا، مُردوں کو جلا دیں گے
اے جذبۂ اسلامی جس دل میں نہ تُو ہو گا
یہ نظمِ صفی پڑھ کر ہم اُس کو سنا دیں گے

☆☆

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آ جا، اب تو خلوت ہو گئی
(عزیز الحسن مجذوب)

ڈاکٹر غلام حسن اپنے مضمون ''خواجہ مجذوب'' میں لکھتے ہیں ''خواجہ صاحب نے حقیقت کو جس سادگی وہ اثر انگیزی کے ساتھ پیش کیا ہے، اُس پر حضرت شیخ (مولانا اشرف علی تھانوی) کو بھی وجد آ گیا۔ مرض الموت میں فرمایا کہ اگر میرے پاس ایک لاکھ روپیہ ہوتا، تو خواجہ صاحب کو اس شعر کے عوض دے دیتا۔''

☆☆

لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

یہ شعر نظامِ دکن، میر عثمان علی خاں کے والد، میر محبوب علی خاں سے منسوب چلا آ رہا ہے۔ اس شعر کی شانِ نزول یہ بیان کی جاتی ہے کہ میر محبوب علی آصف کی تخت نشینی کے دوران بعض اُمرائے سلطنت نے انگریز وائسرائے سے یہ شکایت کی کہ شہزادہ عیش پسند ہے اور بادشاہت کے لائق نہیں۔ اس لیے ان کے بجائے کسی اور شہزادے کو یہ منصب عطا کیا جائے۔

کہتے ہیں جب اس سازش کا حال میر محبوب علی آصف پر کھلا، تو انھوں نے یہ شعر کہا۔ بعض جید محققین اور ناقدین کی رائے اس ضمن میں بین بین ہے۔ امیر مینائی، مرزا داغ دہلوی اور جلیل مانک پوری کے حوالے سے بھی شبہ کیا جاتا ہے کہ یہ شعر اُن کا ہو سکتا ہے۔ اسی زمین میں امیر مینائی نے بھی اشعار کہے ہیں مثلاً

کچھ خوف روزِ حشر ہے دل میں جرے امیر
ہے زندگی سے موت برابر لگی ہوئی

چقندر کا رس.....بلڈ پریشر کا خاتمہ

حالیہ تحقیق کے مطابق چقندر کا ایک کپ رس پینے سے بلڈ پریشر کا کیا جا سکتا ہے خاتمہ ایک جریدے میں شائع پندرہ افراد پر کی گئی تحقیق کے مطابق چقندر کا رس پینے سے ان کے بلڈ پریشر میں تیزی سے کمی واقع ہوئی ہے۔ سائنسدانوں کا کہنا ہے، چقندر میں موجود نائٹریٹ وریدوں میں خون کے تیز بہاؤ میں مدد کرتے ہیں اور وہی انجائنا کے بہت سے مریض بیماری میں بطور دوا استعمال کرتے ہیں۔ محققین کا کہنا ہے کہ ابھی اس سلسلے میں بہت سا کام کرنا باقی ہے۔ انھوں نے خبردار کیا ہے کہ چقندر کا رس پینے سے غیر متوقع نتیجہ بھی برآمد ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہ آپ کے پیشاب کا رنگ گلابی کر ڈالے۔

منگل خان سے پشاور خان تک

لوگ رکھتے ہیں نرالے نام تیرے شہر میں

حنیف ادیب

ہمارے بعض ہم وطن اپنے بچوں کے عجیب و غریب نام رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی بچے کی پیدائش منگل کے دن ہوئی، تو والدین نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اپنی سمجھ کی چابی سے ذہن کا تالا کھولا اور "منگل خان" کا نام نکال لیا۔ اسی طرح "جمعہ خان" اور "پیر خان" کے ہم قافیہ نام آپ کو ناموں کی فہرست سے بآسانی مل جائیں گے۔

مشہور ماہر تعلیم اور دانشور پریشان خٹک کا اصل نام "پری شان خٹک" ہے۔ مگر لوگ انھیں پریشان خٹک کے نام سے یاد کرتے رہے۔ اس پر وہ پریشان بھی ہو جاتے، تو ہم اور آپ بھلا کون ہوتے ہیں پریشان ہونے والے جبکہ جملہ حقوق "پری شان خٹک" کے نام محفوظ ہیں۔

بڑی مدت کی بات ہے، ریڈیو پاکستان پشاور سے کسی من چلے اناؤنسر کی یہ دلکش آواز فضا میں گونجا کرتی: "ریڈیو پاکستان پشاور سے پشاور خان سے گیت سنیے۔"

واہ! کیا آواز تھی، روح مسرور ہو جاتی۔ لمحے، مہینے اور سال بیتے، تو ٹیلی ویژن نے جنم لیا۔ ادھر ٹی وی کا وجود آیا اور گھر گھر میں برقی ڈبے پر نظریں جم گئیں۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے ریڈیو سے جدائی کے لمحے آ گئے۔ ہم ریڈیو سے بچھڑے اور وہ ہم سے بچھڑ گیا۔ یوں یار لوگ ریڈیو پاکستان پشاور سے پشاور خان کی ابھرنے والی آواز سے محروم ہو گئے۔

بعض والدین بچوں کے نام رکھنے میں زیادہ الجھن میں نہیں پڑتے۔ اگر نومولود ملتان میں تشریف لے آئے، تو چپکے سے 'ملتان خان' کا خوبصورت نام نومولود کے ساتھ جڑ دیا۔

اُردو کی نو وارد نے ڈیرہ غازی خان میں جنم لے لیا، تو والدین محترم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ نومولود کا نام 'غازی خان' رکھ چھوڑا۔ لو جی! جنگ تھی نہ جنگجوئی اور رنگ بھی آ گیا چوکھا۔ محترم نومولود بغیر کسی محنت ومشقت کے غازی بن گئے۔ بھتوڑے کی ایک قسم کو ودان کہتے ہیں۔ اگر وہ قدم بڑھا کر اس کا نام 'مہمان خان' یا 'میزبان خان' رکھ دیا جاتا، تو ہم کون ہوتے ہیں انگلی اٹھانے والے؟؟

جو چاہے آپ کا حُسن کرشمہ ساز کرے

ویسے ایک بچی کا نام 'مسکان' بھی ہے۔ معنی تو اچھے ہیں مگر یہ خالص ہندی زبان کا لفظ ہے جو ہندو بچوں کو ہی زیب دیتا ہے۔

ایک خاتون نے ذکر کیا کہ ان کی ایک رشتہ دار خاتون کا نام طالحہ تھا۔ طالحہ کا لفظ طالح کا مونث ہے۔ جبکہ طالح بُرے بندے کو کہتے ہیں۔ شیخ سعدی کا شعر ہے۔

محبت صالح ترا صالح کند
محبت طالح ترا طالح کند

نہلے پہ دہلا، ایک بچے کا نام والدین گرامی نے 'جمل' رکھ چھوڑا۔ جب ڈکشنری میں جمل کے معنی دیکھے گئے، تو وہاں 'اونٹ' لکھا تھا۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسن کرشمہ ساز کرے

قارئین محترم! اگر ہم انسانوں کے اسمائے گرامی کی طول وطویل وادی میں قدم رکھیں، تو وہاں عجیب وغریب ناموں کا جمگھٹا نظر آئے گا۔ واہ! کیا خوب کہا ہے شاعر نے۔

لوگ رکھتے ہیں نرالے نام تیرے شہر میں

◆◆◆

قابلِ فخر پاکستانی نوجوان، شمائل حسن

امریکا میں ہونے والے "ڈوٹا ٹو" نامی بین الاقوامی گیمنگ ٹورنامنٹ میں کراچی سے تعلق رکھنے والے ۱۶ سالہ شمائل حسن نے غیر معمولی کارکردگی دکھاتے ہوئے لاکھوں ڈالر کا بین الاقوامی مقابلہ جیت لیا۔ گزشتہ ہفتے امریکا میں منعقدہ مقابلے میں شامل ہونے والی ٹیم کا نام "ایول جینیئس" تھا جن میں شمائل حسن کے علاوہ چار کھلاڑی اور بھی شامل تھے، یہ مقابلے چھ روز تک جاری رہے جن میں بلاؤں سے لے کر بونوں تک کے کردار ایک دوسرے کو گھونسے لگاتے، آگ کی گیندیں اور بجلی کے کڑاکے برساتے نظر آتے رہے۔ اس مقابلے کو دیکھنے کے لیے سترہ ہزار افراد موجود تھے اور اس بار جیتنے والوں کو ایک کروڑ سترہ لاکھ ڈالر کی خطیر رقم دی گئی ہے۔ سیاٹل میں ہونے والے اس اعصاب شکن مقابلے میں فلور پر موجود مداحوں نے اپنے پسندیدہ گیم کرداروں کا روپ دھار کر شمائل کی ٹیم کا حوصلہ بڑھایا۔ آخر کار ان کی ٹیم فاتح قرار پائی اور انھوں نے اپنے دشمن کو اس آن لائن گیم میں شکست دے دی جس کے بعد وہ لاکھوں ڈالر کے حقدار ہو گئے جن کی پاکستانی روپوں میں قیمت دس کروڑ سے زائد ہے۔ ڈوٹا ٹو کے مطابق شمائل حسن کی کہانی کئی لحاظ سے حیرت انگیز ہے کیونکہ وہ الیکٹرانک گیمز کا مقابلہ جیت کر کروڑ پتی بننے والے کم عمر ترین گیمر ہیں۔ فتح یاب ہونے کے بعد شمائل حسن کا کہنا تھا کہ جیتنا ان کے لیے سب کچھ تھا کیونکہ ان گیمز کے لیے انھوں نے اپنی سائیکل تک فروخت کر دی تھی۔ واضح رہے کہ ڈوٹا ٹو "Defence of the Ancients" کا مخفف ہے جو ایک مشہور آن لائن گیم ہے جسے ایک وقت میں کئی لوگ کھیل سکتے ہیں۔ مقابلے میں امریکا، چین، کوریا، روس اور دیگر ممالک کی ٹیمیں شامل تھیں جبکہ شمائل امریکی ٹیم کا حصہ تھے جسے فتح کے بعد ۶۶ لاکھ ڈالروں کا اوّل انعام ملا۔

دانت چمکانے والی غذائیں

یہ قدرتی منجن دانتوں کی صفائی کرتے اور انھیں چمکا دمکا دیتے ہیں

شمس الدین

حمید سنت نبوی ﷺ پر عمل کرتے ہوئے روزانہ مسواک کرتا ہے۔ جبکہ اس کے بیوی بچے بھی قدرتی جڑی بوٹیوں سے بنی ٹوتھ پیسٹ یا منجن استعمال کرتے ہیں۔ ایک دن ان کے واقف کار ڈاکٹر نے انھیں یہ بتا کر حیران کر دیا کہ بعض غذائیں بھی دانت چمکاتی اور انھیں صاف ستھرا کر ڈالتی ہیں۔ انھی دانت چمکاؤ غذاؤں کا تعارف درج ذیل ہے۔

سیب

اس عظیم نعمت میں میلک ایسڈ (Malic Acid) پایا جاتا ہے۔ یہ تیزاب ہمارے دانت قدرتی طور پر چمکاتا ہے۔ اسی لیے قدرتی مادوں سے بنی ٹوتھ پیسٹوں میں میلک ایسڈ ضرور استعمال ہوتا ہے۔ مزید برآں محض سیب کھانے کا عمل بھی ہمارے دانتوں پر جمی میل صاف کر ڈالتا ہے۔

انناس

یہ مزے دار پھل دنیا کی واحد غذا ہے جس میں برومیلین

(Bromelain) نامی غذائی مرکب ملتا ہے۔ یہ مرکب دافع سوزش اور صفائی کی خصوصیت رکھتا ہے۔ اسی لیے بہت سی ٹوتھ پیسٹوں میں بروملین ضرور شامل کیا جاتا ہے۔

بروکلائی

یہ سبزی جو اردو میں شاخ گوبھی (Broccoli) کہلاتی ہے، ریشے یعنی فائبر سے بھرپور ہے۔ فائبر کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ہمارے جسم کی سوزش ختم کر ڈالتا ہے۔ سو سوڑھوں اور دانتوں کی تکلیف سے بھی نجات ملتی ہے۔

بروکلائی کی ایک اور خاصیت اس میں فولاد کا پایا جانا ہے۔ یہ فولاد دانتوں کو حفاظتی تہ فراہم کرتا ہے۔ یوں اینمل پیدا کرنے والے جراثیم انھیں نقصان نہیں پہنچا پاتے۔

کشمش

کئی لوگ کشمش کو دانتوں کے لیے مضر سمجھتے ہیں۔ وجہ یہی کہ وہ چپکنے والی مٹھاس رکھتی ہے۔ مگر سائنس عیاں کرتی ہے کہ یہ حقیقتاً دانتوں کی محافظ ہے۔

دراصل جب کشمش کھائی جائے، تو کثیر مقدار میں لعاب دہن جنم لیتا ہے۔ یہ لعاب پھر دیگر غذاؤں اور جراثیم کے پیدا کردہ تیزابوں کو ختم کرتا اور یوں دانتوں پر جمنے والی میل یعنی پلیک (Plaque) دانتوں کے کیڑوں اور دھبوں سے بچاتا ہے۔

پنیر

تصویر کھینچتے وقت "کہو چیز" (Say Cheese) کہنا عالمی جملہ بن چکا کیونکہ یہ کہتے ہی انسان مسکرا اٹھتا ہے۔ تاہم دودھ سے تیار کردہ پنیر واقعتاً کیلشیم اور فاسفورس جیسی قیمتی معدنیات رکھنے کی وجہ سے دانتوں کے لیے مفید ہے۔

درج بالا دونوں معدنیات پروٹین کے ساتھ مل کر دانتوں کا اینمل محفوظ رکھتی ہیں۔ مزید برآں پنیر میں موجود لیکٹک ایسڈ (Lactic Acid) دانتوں کو بوسیدگی (Decay) سے بچاتا ہے۔

پانی

جی ہاں، اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت بھی دانتوں کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ دن میں اکثر پانی پینے سے لعاب دہن وافر مقدار میں جنم لیتا ہے۔ سو وہ دانتوں کو تیزابوں و غذائی ذروں سے محفوظ رکھتا ہے۔ ڈاکٹر مشورہ دیتے ہیں کہ ہر کھانے کے بعد کلی ضرور کریں تاکہ دانتوں میں پھنسے غذائی ذرے نکل جائیں۔

اسٹابری

سیب کی طرح یہ لذیذ پھل بھی میلک تیزاب وافر مقدار میں رکھتا ہے۔ مزید برآں اس میں ایلاجیٹانینز (Ellagitannins) نامی ضد تکسیدی مادہ بھی پایا جاتا ہے۔ یہ مادہ ہمارے منہ میں سوزش اور دھبے پیدا کرنے والے جراثیم ختم کرتا ہے۔ اسٹابری میں پایا جانے والا وٹامن سی مسوڑھوں کی سوجن میں مفید ہے۔

◆◆◆

مچھلی کا کارآمد تیل

مچھلی کے تیل میں اومیگا ۳ فیٹی ایسڈ وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ یہ تیزاب کئی صحت بخش خصوصیات رکھتے ہیں۔ اب ایک امریکی تحقیق سے انکشاف ہوا ہے کہ یہ تیزاب دماغ کے خلیوں کو بھی محفوظ رکھتے ہیں۔

یونیورسٹی آف ساؤتھ ڈکوٹا کے ماہرین نے ایک ہزار خواتین کی صحت کا جائزہ لے کر جانا ہے کہ جو انسان مچھلی کا تیل زیادہ استعمال کریں، ان کا دماغ قدرتی شکل و صورت برقرار رکھتا ہے۔ یاد رہے، کئی انسانوں کا دماغ بڑھاپے میں سکڑ جاتا ہے۔ چناں چہ وہ نسیان و دماغی کمزوری کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ تاہم جو مرد و زن نوجوانی میں مچھلی کا تیل استعمال کریں، وہ بڑھاپے میں اس مرض سے بچ سکتے ہیں۔

اردو ڈائجسٹ کے سالانہ خریدار بن کر

● 560 روپے کی غیر معمولی بچت پائیے ● اس قیمت میں خصوصی نمبر بھی حاصل کیجیے

اُردو کے ہمہ رنگ، باوقار ڈائجسٹ کو اپنا دوست بناتے ہوئے
معلومات کی ایک نئی دنیا سے اپنے دامن کو بھریئے

دلچسپ انٹرویوز، کہانیوں اور شگفتہ ادبی تحریروں سے اپنی زندگی کو پُرلطف بنائیے

قیمت فی پرچہ -/100 روپے	12 شماروں کی قیمت	سالانہ رجسٹرڈ ڈاک خرچ	کل رقم سالانہ	سالانہ بدل اشتراک	بچت
سالانہ خریداری	1200 روپے	360 روپے	1560 روپے	1000 روپے	560 روپے

سالانہ خریداری فارم

نام ____________ فون نمبر ____________

پتا ____________ ای میل ____________

میں ماہ ________ 20 ء سے اُردو ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں۔ مجھے اُردو ڈائجسٹ ارسال کر دیجیے۔

1۔ بذریعہ وی پی میں سالانہ قیمت پوسٹ مین کو ادا کروں گا۔ یا

2۔ میں مطلوبہ رقم -/1000 روپے کا بینک ڈرافٹ / منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں۔ یا

3۔ میں نے -/1000 روپے اُردو ڈائجسٹ کے اکاؤنٹ نمبر 110-800380 بینک آف پنجاب سمن آباد میں آن لائن جمع کروا دیے ہیں۔ اور اپنا ایڈریس ای میل کر رہا ہوں۔ یا

4۔ ہماری ویب سائٹ پر جا کر سبسکرپشن فارم پُر کریں اور ہمیں ای میل کر دیں۔ یا

5۔ ہمیں 0301-8431886 پر ایس ایم ایس کریں۔ ہمارا نمائندہ آپ سے رابطہ کرے گا۔

تاریخ ____________ دستخط ____________

+92-42-37589957 +92-42-35290738 ... 54500 ...
+92-42-35290731 ... urdudigest.pk ... @urdu-digest.com

نام کتاب: ممتاز فقیر، اہل اللہ کی باتیں اور ملاقاتیں۔ مصنف: ڈاکٹر تصدق حسین۔ ناشر: رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، اقبال مارکیٹ، اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی۔ فون نمبر ۰۵۱۔۵۵۵۱۵۱۹۔ قیمت: ۴۰۰ روپے۔

یہ دور جدید کے پانچ صوفیا..... سائیں کالا خان، پروفیسر عبدالعزیز، سید عبدالرشید، بابا محمد یحییٰ خان اور میجر (ر) محمد صادق کے خاکوں پر مشتمل کتاب ہے۔ مصنف معروف ادیب، استاد اور مؤلف ہیں۔ پہلے "راجا" کا لاحقہ بھی نام کے ساتھ لگاتے تھے۔ پھر اپنے مرشد کے حکم پر اسے ہٹا دیا۔

ان خاکوں میں درج بالا صوفیا کی کرامات کے علاوہ اخلاقی واقعات بھی درج ہیں۔ یہ سبق آموز واقعے انسان کو جینے کا ڈھنگ سکھاتے اور محبت، رحم، ایثار، سچائی وغیرہ جیسی اعلیٰ اقدار سے آگاہ کرتے ہیں۔ یہ خوبی کتاب کی اہمیت دوچند کر دیتی ہے۔

کتاب خوبصورت اور معیاری انداز میں شائع ہوئی ہے۔ تصوف اور روحانیت سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے تحفہ خاص ہے۔

☆☆☆

نام کتاب: ملا نصیر الدین کی کہانی۔ تالیف: شاہد اقبال۔ ناشر: بک کارنر، بک اسٹریٹ، جہلم۔ فون ۰۵۴۴۔۶۱۴۹۷۷۔ قیمت فی جلد: ۴۸۰ روپے۔

ملا نصیر الدین ترکی کے مشہور دانش ور گزرے ہیں۔ عاقل و فہیم آدمی تھے۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ لوگوں کی اصلاح کے لیے بے وقوف بنے رہتے اور احمقانہ حرکتیں کرتے۔ یوں وہ کھیل کھیل میں عوام کو سچائی کا راستہ دکھا دیتے جو عموماً نصیحتوں

اور وعظ سے گھبراتے ہیں۔

ملا نصیر الدین کے مزاح سے بھرپور واقعات مختلف کتب و رسائل میں بکھرے پڑے تھے۔ اب شاہد اقبال نے انھیں دو جلدوں میں جمع کر دیا۔ یوں ایک منفرد ترک دانشور کے مزاحیہ واقعات کا قلمی خزانہ وجود میں آ گیا۔ اسے ترتیب دینے پر شاہد اقبال مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ناشر نے کتاب کو دیدہ زیب اور پائیدار طور پر شائع کیا ہے۔ یہ کتاب بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے بھی مفید ہے جو ہنستے مسکراتے عقل و دانش کی باتیں سیکھ سکتے ہیں۔ اس کتاب کو اپنی لائبریری کا حصہ ضرور بنائیے۔

☆☆

نام کتاب: متاع شاعری۔ مصنف: ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم۔ ناشر: نقش گر، راولپنڈی، سرگودھا۔ فون: ۰۳۳۳_۶۷۵۵۱۰۲۔ قیمت: ۸۰۰ روپے۔

ایک قول صادق ہے: ''کتابوں کے بغیر گھر ایسا ہے جیسے کھڑکیوں کے بغیر کوئی کمرا۔'' یہ دلکش بات کتاب کی اہمیت اجاگر کرتی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ شاعری کی ''۹۴'' کتب کے تبصروں پر مشتمل ہے۔ کتاب کے مصنف معروف شاعر اور ادیب ہیں۔ انھوں نے دور جدید کے معروف شعرا مثلاً خورشید رضوی، جمیل یوسف، جوہر نظامی، وصی شاہ، شکیب جلالی وغیرہ کی کتب پر معلومات افروز اور گہرائی و گیرائی سے بھرپور تبصرے کیے ہیں۔ جن میں خیال افروز نکات ہیں اور نئے دریچے کھولنے والی باتیں بھی!

شاعری کی نت نئی کتابیں پڑھنے کے حوالے اسے نادر کتاب پائیں گے۔ ناشر نے اسے صوری و معنوی لحاظ سے عمدہ شائع کیا ہے۔

☆☆

نام کتاب: سہ ماہی الزبیر، بہاول پور۔ مدیر: ڈاکٹر شاہد حسن رضوی، ناشر: اردو اکیڈمی، ۳۳۰۔ سی، ماڈل ٹاؤن اے، بہاول پور۔ فون: ۲۷۳۱۹۳۳_۰۶۲۔ قیمت: ۳۰۰ روپے۔

یہ چھپن برس پہلے کی بات ہے جب محلات کے صحرائی شہر بہاول پور سے ایک علمی و ادبی پرچے ''الزبیر'' کا اجرا ہوا۔ اس کے مدیر شہید سید شہاب دہلوی تھے۔ وہ وفات پا چکے، مگر ان کے فرزند یہ رسالہ اب تک نکال رہے ہیں جس پر وہ داد کے مستحق ہیں۔

دور جدید میں انٹرنیٹ، ٹیلی ویژن نے مطالعے کی عادت کو خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ پھر علمی و ادبی رسائل پہلے بھی کم تعداد میں شائع ہوتے تھے۔ ایسے ماحول میں بہاول پور جیسے نسبتاً دور دراز علاقے سے ایسا رسالہ نکالنا کسی جہاد سے کم نہیں۔

سال رواں کا تیسرا شمارہ ہمارے زیر نظر ہے۔ یہ معروف لکھاریوں کے مضامین، مقالات، شاعری اور افسانوں کا منفرد گلدستہ ہے۔ علم و ادب کے شائقین کے لیے یہ رسالہ خزانے ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے اپنے کتب خانے کی زینت بنائیے۔

☆☆

نام کتاب: تاریخ انقلاب عرب۔ مصنف: اخلاق احمد قادری۔ ناشر: سٹی بک پوائنٹ۔ نوید اسکوائر، اردو بازار، کراچی فون نمبر: ۳۲۷۶۲۲۸۳۔ قیمت: ۴۵۰ روپے۔

۲۰۱۱ء میں انقلابات نے دنیائے عرب کے کئی ممالک خصوصاً تیونس، مصر، لیبیا، یمن، شام اور عراق کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ زیر تبصرہ کتاب انہی انقلابات کی داستان تفصیل سے بیان کرتی ہے۔ انھوں نے کئی آمروں کو تخت شاہی سے اتار پھینکا اور وہ ماضی کا قصہ بن گئے۔ ان تاریخی انقلابات کو "عرب بہار" کا نام دیا گیا۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ درج بالا تمام عرب ممالک میں اب تک امن قائم نہیں ہو سکا۔ لیبیا، یمن، شام اور عراق میں خانہ جنگی جاری ہے۔ مصر میں فوج دوبارہ برسر اقتدار آگئی جبکہ تیونس میں اسلام پسندوں اور سیکولر قوتوں میں خاصا تناؤ ہے۔ گویا عرب بہار کے ثمرات پوری طرح عیاں نہیں ہو سکے۔

یہ کتاب بہرحال عرب بہار کی لمحہ بہ لمحہ تفصیل خوبصورتی سے اجاگر کرتی ہے۔ عرب تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اسے دلچسپ و معلومات افزا کتاب پائیں گے۔ کتاب کی پیش کش عمدہ ہے۔

☆☆

نام کتاب: ۵۰ نامور ادبی شخصیات۔ مصنف: ملک مقبول احمد۔ ناشر: مقبول اکیڈمی۔ سرکلر روڈ، چوک اردو بازار، لاہور۔ فون ۰۴۲۔۳۷۳۶۳۱۶۴۔ قیمت: ۴۰۰ روپے۔

جناب ملک مقبول احمد پاکستان کے ممتاز ناشر ہیں۔ آپ کی قیادت میں پچھلے پچاس برس کے دوران مقبول اکیڈمی نے مشہور ادبا و علما کی کتابیں شائع کیں۔ اسی دوران انھیں ان گنت ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں سے میل ملاپ کا موقع ملا۔ یہ

کتاب انہی منفرد ملاقاتوں کی یادوں پر مشتمل ہے۔ یہ کئی علمی و ادبی شخصیات مثلاً مولانا حامد علی خان، احسان دانش، رئیس احمد جعفری، ڈاکٹر وزیر آغا، سید قاسم محمود، حمید اختر، پروفیسر رفیع اللہ شہاب، ڈاکٹر صفدر محمود، مرزا ادیب وغیرہ کی زندگیوں کے اہم گوشے آشکار کرتی اور قاری کو جینے کے رنگ ڈھنگ سکھاتی ہیں۔

کتاب سفید کاغذ پر عمدہ چھپائی کے ساتھ طبع ہوئی ہے۔ آپ بیتیاں پڑھنے والے اسے قابل مطالعہ پائیں گے۔

☆☆

نام کتاب: رانا فضل حسین کی گوجری شاعری کا تنقیدی جائزہ۔ مصنف: محمد نذیر مسکین۔ گوجری ادبی سنگت، اے ۱۴، سیکٹر سی تھری، میرپور، آزاد جموں و کشمیر۔ فون نمبر ۰۵۸۲۷۔۴۳۵۷۵۰۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

گوجری برصغیر ہندو پاک کی قدیم زبان ہے۔ یہ بھارت اور پاکستان کے مختلف علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد یہ زبان گمنام رہی مگر اب اس میں شعر و ادب لکھا جا رہا ہے۔ گوجری ادب کی ترقی و ترویج میں رانا فضل حسین پیش پیش ہیں جنھیں "بابائے گوجری" بھی کہا جاتا ہے۔

رانا فضل حسین شاعر و ادیب ہیں۔ اب تک گوجری میں ان کی شاعری کے سات آٹھ مجموعے شائع ہو چکے۔ زیرتبصرہ کتاب میں انھی کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ یوں نہ صرف رانا صاحب کے کام کی تفہیم ہوئی بلکہ گوجری ادب میں شعبہ تنقید کو جلا ملی۔

کتاب کے ناشر، گوجری ادب سنگت نے یہ کتاب معیاری انداز میں شائع کی ہے۔ اپنی زبان کی ترویج میں ادارے کی کاوشیں قابل ستائش ہیں۔

☆☆

نام کتاب: بلال صاحب، مصنف: شکیل احمد چوہان، ناشر: علم و عرفان پبلشرز، الحمد مارکیٹ۔ ۴۰، اردو بازار لاہور۔ فون ۳۷۲۳۲۳۳۶۔ قیمت: ۵۰۰۔

اس ناول کا ہیرو بلال نامی نوجوان ہے۔ وہ باادب، تعلیم یافتہ اور سلجھا ہوا انسان ہے۔ کھاتے پیتے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ پھر زندگی کے مختلف مراحل سے گزرتا اور دکھ، غم اور خوشی سے دوچار ہوتا ہے۔ اس ناول میں وہ تمام جذبات و احساسات ملتے ہیں جن سے ایک انسان کو حیات بسر کرتے ہوئے واسطہ پڑے۔

ناول کے مصنف تاجر اور فنون لطیفہ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر سید نور کے ساتھ فلمیں بھی بنا چکے۔ یہ ناول ایک ایسے واقعے پر مبنی ہے جو انھوں نے والدہ کو سنایا تھا۔ والدہ کے کہنے پر یہ ناول لکھا گیا جو سبق آموز ہے اور عبرت اثر بھی۔

ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل یہ ناول خوبصورتی سے شائع ہوا ہے۔ جدید ادبی لب و لہجے میں لکھا یہ ناول پڑھنے والے شوقین خواتین و حضرات کو پسند آئے گا۔

☆☆

نام کتاب: اردو محاورے۔ مولف: ڈاکٹر خوشنود نیلوفر۔ ناشر: بک کارنر، بک اسٹریٹ، جہلم۔ قیمت: ۲۸۰ روپے۔

اردو زبان میں محاورے کلام کو حسن و جمال عطا کرتے ہیں۔ محاورہ الفاظ کا وہ مجموعہ ہے جس میں تخیل، تجربہ اور تجزیہ پایا جائے۔ محاوروں کی مدد سے زبان کی چاشنی بڑھ جاتی ہے۔ یہی نہیں، وہ تہذیب و ثقافت کی نشانی بھی ہوتے ہیں۔

اردو زبان میں پچھلے تین چار سو سال کے دوران ہزارہا محاورے وجود میں آچکے۔ انھوں نے زبان کی چاشنی و دلکشی بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ نثر ہو یا شاعری، تحریر میں محاوروں کی شمولیت اسے چار چاند لگا دیتی ہے۔ بدقسمتی سے نئی نسل نئی محاوروں سے نا آشنا ہے۔ اسی لیے مولف نے زیرتبصرہ کتاب میں گیارہ ہزار محاورے یکجا کرکے اہم لسانی و قومی خدمت انجام دی ہے۔

ناشر نے کتاب عمدہ انداز میں شائع کی ہے۔ اردو سے الفت رکھنے والے اس کتاب کی مدد سے اپنے کلام اور تحریر کو

جاذب نظر اور دلکش بنا سکتے ہیں۔

☆☆☆

نام کتاب: نعت نگینے، مصنف نسیم سحر۔ ناشر: رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، اقبال مارکیٹ، کمیٹی چوک، راولپنڈی۔
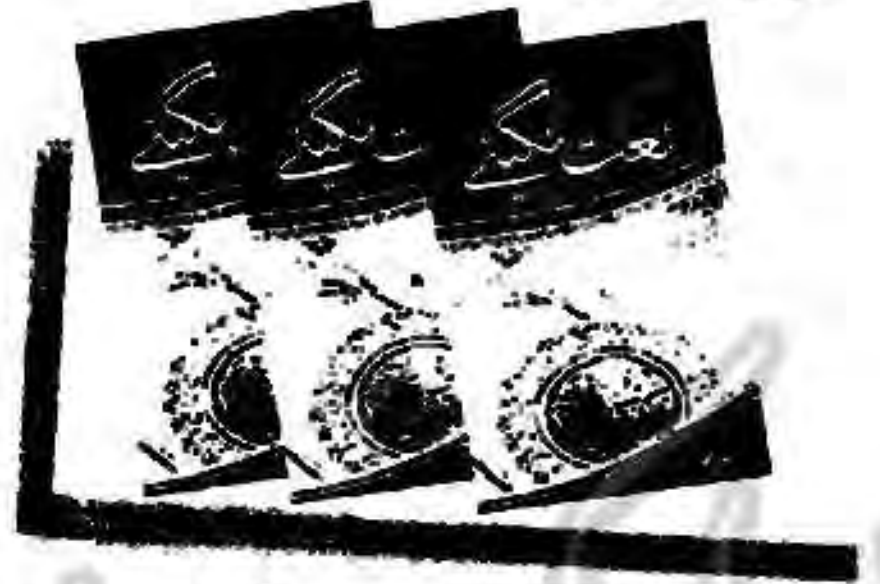
ایک شاعر جب اپنے نرم و نازک اور نفیس ترین جذبات جب انتہائی محتاط انداز میں افشا کرے، تو یہ اظہار "نعت" کہلاتا ہے۔ یہ شاعری کی مقدس ترین صنف ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ ہستیاں جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ستائش کرنے کی سعادت نصیب ہوئی انہی میں جناب نسیم سحر کا شمار بھی ہوتا ہے۔

آپ ایک پختہ کار شاعر و ادیب ہیں۔ طویل عرصہ بسلسلہ ملازمت بیرون ملک مقیم رہے۔ اب مدحت نبی کا جذبہ ان میں موجزن ہے اور آپ خوبصورت اور دل نشیں نعتیں لکھ کے اپنا اور قارئین کا دل شاد کام کر رہے ہیں۔

جناب نسیم سحر کو تسلسل کے ساتھ حضور اکرم کی بارگاہ میں حاضری کا شرف حاصل ہے۔ اسی لیے ان کی نعتوں میں روضہ مبارک کے مختلف حصے مثلاً ریاض الجنہ، چبوترہ اصحاب صف، گنبد خضرا بخوبی سموئے ملتے ہیں۔ یہ نعتیں دل و دماغ کو طراوت بخشتیں اور انسان کو بے خود کر دیتی ہیں۔ کتاب عمدہ کاغذ پر معیاری انداز میں شائع ہوئی ہے۔

☆☆☆

نام کتاب: ماہنامہ عفت۔ مدیرہ: سلمیٰ یاسمین نجمی۔ پتا: بنگلہ نمبر ۲۷، ۲۹، نزد اسٹیٹ لائف بلڈنگ، صدر روڈ، راولپنڈی۔

قیمت: ۴۲ روپے۔

خواتین کے کئی رسالے نکلتے ہیں، مگر ان میں رومانی کہانیوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ اصلاحی معاشرتی کہانیاں خال خال دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ماہنامہ عفت اس لحاظ سے منفرد ہے کہ یہ اخلاق و کردار سنوارنے والی معیاری کہانیاں اور تحریریں شائع کرتا ہے۔

رسالے کی مدیرہ، سلمیٰ یاسمین نجمی معروف قلم کار ہیں۔ یہ رسالہ پچھلے پندرہ برس سے ان کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ رسالے کی تحریریں قارئین کو قومی و عالمی حالات سے بھی باخبر رکھتی ہیں۔ اس بامقصد اور پاکیزہ ماہنامے کا ضرور مطالعہ کیجیے تاکہ مادہ پرستی کے دور میں موزوں راہنمائی مل سکے۔ ◆◆◆

اقوال حضرت عباسؓ

☆ شریف انسان کی سب سے پہلی اور سب سے آخری نشانی یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کی بھی عزت کرتا ہے جن سے اسے کسی قسم کے فائدے یا امداد کی توقع نہیں ہوتی۔

☆ دو حریص ایسے ہیں جن کی حرص کبھی ختم نہیں ہوتی: ۱۔ علم کا حریص، ۲۔ دنیا کا حریص۔

☆ صندل اس کلہاڑے کا منہ بھی خوشبودار کر دیتا ہے جو اسے کاٹتا ہے۔ (انتخاب: نادیہ جعفری ایڈووکیٹ)

وہ ایک ہستی گلاب تھی!

گھر بھر کو نیکی کی راہ دکھلانے والی
خاتون خانہ کا دل افروز ماجرا

شبانہ یونس

یہ بات کبھی نہیں بھولا کہ ابا جی ریڑھا چلاتے تھے۔

میں اپنے بہن بھائیوں میں سے بڑا تھا۔ مجھ سے چھوٹے دو بھائی اور ایک بہن تھی۔ میری امی بہت دین دار اور نیک عورت تھی۔ دو کمروں کے چھوٹے سے گھر میں انتہائی غربت میں ہمارا گزر اہو رہا تھا۔

ابا جی کو ریڑھے سے دن بھر کی مشقت کے بعد دو تین روپے آمدنی ہوتی۔ امی ادھر اُدھر ہمسایوں سے دو ایک روپے ادھار لے کر ایک روپے میں ہانڈی پکاتی، ایک روپے کا آٹا منگواتی اور ہم بچوں کو کھانا کھلا دیتیں۔ کبھی کبھی مغرب کے بعد ابا جی گھر آتے، تو وہ ڈیڑھ روپے امی کے حوالے کرتے کہ یہی دن بھر کی آمدنی ہے۔ امی کم رقم دیکھ کر جھگڑنے پر آجاتیں۔ ابا جی سمجھانے کی کوشش کرتے "نیک بخت! جو قسمت میں ہو وہی ملتا ہے۔ صبر شکر سے کام لوگی، تو رب اور دے گا۔ ناشکری کروگی، تو عذاب ملے گا۔"

امی کہتیں "ہاں، تو تم فلسفی کی طرح کرتے ہو مگر جہاں پیسے کی ضرورت ہو وہاں فلسفہ کام نہیں آتا۔

"میری جتنی آمدنی ہے تمھیں اسی میں گزر بسر کرنی ہو گی۔"

"تم بتاؤ میں کیا کروں؟ ایک ہمسائی سے روپیہ لیتی ہوں، دوسری سے دو روپے۔ یہ پیسے واپس بھی کرنے

ہیں۔ وہ کیا دوبارہ ادھار دیں گی؟" امی کہتیں۔

ابا عاجز آ کر کہتے "اب میرا سر نہ کھاؤ اور جلدی سے کھانا دو۔ پھر میں نماز پڑھ کر آرام کروں گا۔"

☆☆

ایک دن میں اسکول جانے لگا تو امی نے ایک پیسا دیا اور کہا کہ اسکول سے واپس آتے ہوئے نمک لے آنا۔ میں نمک خرید کر گھر آ رہا تھا۔ وہ ایک اخبار کی پڑیا میں بند تھا۔ میں دوسری جماعت میں تھا، اچھی خاصی اردو پڑھ لیتا۔ میں نے اخبار میں چھپی خبر بلند آواز میں پڑھی۔ گھر پہنچا تو امی کو بتایا۔ "دیکھو امی، اخبار میں کیا لکھا ہے۔ چار بچوں کے باپ نے بیوی کے لڑنے جھگڑنے سے تنگ آ کر خودکشی کر لی۔"

روٹی پکاتے ہوئے امی نے غصے سے میری طرف دیکھا اور بولیں "پاگل تو نہیں ہو گیا تو، کس نے تجھے ایسی باتیں سکھائی ہیں۔"

میں نے اخبار کا ٹکڑا امی کے آگے کر دیا۔ "اس میں لکھا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں اماں!"

"نہ میرا بیٹا ایسی باتیں نہیں کرتے، تو میرا پیارا بیٹا ہے۔"

ہمارا گھر دو کمروں پر مشتمل تھا۔ سامنے ایک برآمدہ اور باقی صحن کچا تھا۔ آدھے صحن کی جگہ پر امی نے کیاریاں بنا کر موسم کی سبزیاں لگا رکھی تھیں۔ کہیں سونف اور دھنیا، کہیں گاجر مولی اور کہیں پودینہ لگا تھا۔ جس دن کچھ پکانے کو نہ ہوتا امی پودینے اور دھنیے کی چٹنی بنا لیتیں۔

اس رات جب سب بچے سو گئے تب امی دھیمے لہجے میں ابا سے کہنے لگی "غلام نبی! آج تمھارے بیٹے نے ایک بات کہہ کر مجھے ڈرا دیا۔ کہتا ہے، امی تم تھوڑی آمدنی کی وجہ سے ابا سے لڑتی ہو۔ کسی دن تنگ آ کر ابا جی نہر میں چھلانگ لگا کر یا ریل کے نیچے آ کر جان دے دیں گے۔ آپ ابا کو تنگ کرنا چھوڑ دیں۔"

"میرا بیٹا بڑا سمجھدار ہے۔ وہ ٹھیک کہتا ہے۔ مگر میں اتنا کمزور دل نہیں۔" ابا نے کہا۔

"میں نے اپنے بیٹے سے وعدہ کیا ہے، آئندہ میں تمھارے ابا کو تنگ نہیں کروں گی۔"

☆☆

میں نے بڑے اچھے نمبروں سے میٹرک کر لیا اور زور شور سے ملازمت کی تلاش کرنے لگا۔ واپڈا ہاؤس میں درخواست دی، مجھے وہاں ملازمت مل گئی۔ چند سال میں محکمانہ امتحان پاس کرنے کے بعد میرا عہدہ بڑھا، تو اچھی تنخواہ ہو گئی۔ میرے چھوٹے بھائی اب کالج پڑھتے تھے۔ میں اپنی پوری تنخواہ امی کو دیتا۔ میرے منع کرنے کے باوجود ابا جی ریڑھا چلاتے رہے۔ ان کا کہنا تھا "اپنے ہاتھ سے محنت کرتا ہوں اپنے ساتھ گھوڑے کو بھی کھلاتا ہے۔"

جلد ہی رشتہ داروں میں اچھی سی لڑکی پسند کر کے امی نے میرا گھر بسا دیا۔ شازیہ سگھڑ اور سلیقہ شعار لڑکی تھی۔ میرے ایک بھائی نے بی کام اور دوسرے نے انجینئر کی ڈگری حاصل کر لی۔ میرے گھر پیاری سی بیٹی پیدا ہوئی۔ پھر یکے بعد دیگرے دونوں بھائی لندن چلے گئے اور جاتے ہوئے اپنی بہن کے ہاتھ پیلے کر گئے۔ نازیہ کی شادی ہم نے لاہور میں چچا کے بیٹے عاصم سے کر دی۔

میرے گھر دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تولد ہوا۔ تینوں بچے اسکول جاتے۔ شازیہ انھیں بڑے لاڈ سے تیار کر کے اسکول بھیجتی۔ میری تنخواہ میں سے بچت کر کے شازیہ نے کمیٹی ڈال رکھی تھی کہ یہ پیسا کسی مشکل وقت میں کام آئے گا۔

ایک دن ابا جی کے ریڑھے کا حادثہ ہو گیا۔ تب گھوڑے کے مرنے پر ابا جی گھر رہنے لگے۔ اس اثنا میں امی چند دن بیمار رہ کر وفات پا گئیں۔ گھر میں سب کو امی کی وفات پر دکھ ہوا۔ مگر ابا جی کو چپ سی لگ گئی۔ وہ بہت کم بولتے اور گھر کے معاملات میں کوئی مداخلت نہ کرتے۔ بس گھر کا سودا سلف لا دیتے۔ میری عادت تھی کہ پوری تنخواہ بیوی کے حوالے کر دیتا۔

ایک بار مہینے کا آخر تھا۔ دفتر سے لوٹا، تو بیوی نے سبزی منگوانے کے لیے پیسے مانگے۔ میں نے پانچ سو روپے کا نوٹ

جیب سے نکالا۔ بیوی چونک گئی، حیرت سے بولی "یہ نوٹ کہاں سے آیا؟ آپ کی تنخواہ تو میرے پاس آجاتی ہے۔"

میں بیوی سے آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ وہ کام چھوڑ کر تھانے دار کی طرح سامنے کھڑی ہوگئی۔ درشت لہجے میں بولی "میں حیران تھی روز مٹھائی کبھی پھل کبھی کیک لے کر گھر آتے ہو، تمھارے پاس یہ پیسے کہاں سے آتے ہیں؟ ساری تنخواہ ہر مہینے مجھے دیتے ہو۔ اب پتا چلا، دفتر آنے والے سائلوں سے رشوت لے کر تم ان کا کام کرتے ہو۔ شفیق صاحب....." پہلی بار وہ میرے نام سے مخاطب ہوئی "خبردار جو آج کے بعد مجھے یا میرے بچوں یا اپنے باپ کو حرام کھلانے کی کوشش کی...."

اس شیرنی کی دہاڑ نے مجھے بے بخود کر دیا۔

"میرا تو مشورہ ہے، اس محکمے کی ملازمت چھوڑ دو جہاں رشوت کا دور دورہ ہے۔ تم کوئی اور کام کرو۔ بجلی کے سامان کی دکان ڈال لو۔ کچھ کمیٹی کے پیسے آجائیں گے۔ بقیہ رقم میرا زیور بیچ کر حاصل کر لو اور دکان بنا لو۔ ہمیں روکھی سوکھی کھانی پڑی تو میں یا میرے بچے کبھی احتجاج نہیں کریں گے۔"

اگلے مہینے میں نے ملازمت سے استعفا دے دیا۔ واپڈا سے ملازمت کے دوران جو میرے واجبات ملے، وہ دو لاکھ روپے تھے۔ بیوی سے زیور لینے کی نوبت نہ آئی۔ گھر سے کچھ فاصلے پر مارکیٹ میں دکان کھولی اور اللہ کا نام لے کر بیوی کے ہاتھ سے افتتاح کرایا۔ میرے کم منافع لینے کی روش سے دکان خوب چل نکلی۔ ایک بچی نے بی اے کیا۔ دوسری ایف اے میں پڑھتی ہے۔ بیٹے نے آئی ٹی میں ڈگری لی اور اچھی ملازمت پر فائز ہو گیا۔ دونوں بیٹیوں کا رشتہ طے ہو گیا۔

ہم سب کو نیکی کی راہ دکھا کر ایک رات شازیہ ایسی سوئی کہ پھر نہ جاگی۔ ہماری عمر بھر خدمت کرنے والی گلاب جیسی ہستی نے ایک دن بھی کسی سے اپنی تیمارداری نہ کرائی اور اپنے رب کے پاس چلی گئی جہاں سب کو جانا ہے۔

◆◆◆

انوکھا رازداں

ہمارے بال ہماری شخصیت کا اہم حصہ ہیں اور ان کی رنگت، کیفیت اور تعداد نہ صرف ہماری ظاہری حالت بتاتی ہے بلکہ ہمارے جسم میں موجود گہرے راز کو بھی آشکار کرتی ہے۔ ڈاکٹروں کے مطابق ہمارے بال ایک طرح کے مسٹر کا کردار ادا کرتے ہیں جو ہماری صحت کی اچھائی اور برائی کو ظاہر کرتے ہیں جب کہ جسم میں خون یا ہارمونز کی کمی بیشی کا اظہار بھی بالوں سے ہو سکتا ہے کیونکہ زلفیں صحت کے راز کو ظاہر کرتی ہیں۔ ماہرین کے مطابق جسم میں ہونے والی تبدیلیاں دھیرے دھیرے بالوں میں ظاہر ہوتی ہیں کیونکہ بالوں کی نشوونما خون کی روانی سے ہوتی ہے۔ اگر ہارمونز میں تبدیلی ہو یا غذائی اجزا میں کمی اس کا اظہار بالوں سے ہوتا ہے۔ اسی طرح بال گرنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ جسم میں کوئی کمزوری ہے اسی لیے بالوں کے مسائل کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ اگر بال گر رہے ہوں، غیر معمولی طور پر بڑھ رہے ہوں، بہت خشکی ہو یا سر پر خشکی کی پپڑیاں جم رہی ہوں تو فوری اپنے معالج سے رابطہ کریں۔ تحقیق کے مطابق تھائی رائیڈ غدود اور ہارمونز کا بالوں سے گہرا تعلق ہوتا ہے اور بال تیزی سے گر رہے ہوں تو یہ وائرس زدہ بخار کو ثابت کرتا ہے۔ اگر بال خشک ہو رہے ہیں اور ان کا رنگ ہلکا ہو رہا ہے تو یہ غذائی اجزا میں کمی کو ظاہر کرتا ہے۔ زنک کی کمی سے بال گرتے ہیں اسی طرح فیٹی ایسڈ کی کمی بھی بالوں میں اثرات مرتب کرتی ہے۔ ماہرین کے مطابق بالوں کو دیکھتے ہوئے اعصابی مسائل، ٹانسلز، دانتوں اور مسوڑھوں کے مسائل، گردے کے مسائل اور پھپھوندی کی چھوت کو ظاہر کرتے ہیں تاہم اب ٹرائیکو چیک کے ذریعے بالوں سے امراض کا پتا لگانا ممکن ہے جب کہ ہیئر ٹشو منرل اینالیسس یا ایچ ٹی ایم اے کے ذریعے بالوں میں غذائیت اور زہریلے اجزا دونوں کا ہی جائزہ لیا جا سکتا ہے کیونکہ بدن میں ضروری معدنیات کی کمی بیشی بالوں میں ظاہر ہوتی ہے۔

دوسروں پر سحر طاری کردے

آنکھ کا نشہ

راتوں رات امیر بننے کے شوقین ایک لالچی
کی ناقابل فراموش داستان

ڈورمیٹ میگلے

میں نے اپنے نو نے ڈیسک کے قریب رکھی مزدوری کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نووارد سے کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

زرد رو اور دوغلی نسل کا یہ شخص بیک نگاہ مجھے متاثر کرنے میں ناکام رہا تھا۔ پھر بھی ایک بات ضرور تھی جس نے میرے دل کو بے چین کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں مقناطیسی کشش تھی۔ سیاہ اور چمکدار دیدوں میں کچھ نہایت ہی عجیب سا تاثر تھا، ایسا جادو کہ ایک لمحے کے لیے میری توجہ تھوڑی چھوٹ گئی۔

"میں تمھاری کیا خدمت کرسکتا ہوں مسٹر......؟" میں نے اپنے سر کو فاخرانہ اور افسرانہ شان سے حرکت دی۔ میں ایک کاروباری کمپنی کا منیجر تھا۔

"اسٹیمپ...... میرا نام ہیری اسٹیمپ ہے۔ کیا تم کسی کی شکل صورت دیکھ کر اس کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا سکتے ہو؟"

"میں اس کرسی پر بیٹھا ہی اس لیے ہوں کہ کارآمد ہیروں کو پرکھ کر انھیں ان کی قابلیت کے مطابق فائدہ پہنچا سکوں۔ کیا سمجھے مسٹر اسٹیمپ!" میں نے اپنی آواز میں ذرا کرختگی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "تم بتاؤ تم میں کیا صلاحیت ہے؟"

یکایک اس کے چہرے پر سنجیدگی نظر آنے لگی۔ "میں جانوروں کو بھی ہپناٹائز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔" وہ بولا۔

میں نے اس کی بات سن کر زوردار قہقہہ لگایا۔ بھلا ایسی مضحکہ خیز بات پر کس طرح یقین کیا جاسکتا تھا؟ مجھے یہ بات بالکل ہی ناممکن نظر آئی، لیکن ہماری کمپنی کے اصول کے مطابق کسی ناقابل یقین بات کو یوں چٹکیوں میں اڑا دینا اور دعویٰ

کرنے والوں کو صاف جواب دے کر دل توڑ دینا کاروباری اصول کے سراسر منافی تھا۔ بعض اوقات بظاہر ناقابل عمل نظر آنے والی کوئی بات اپنے اندر حقیقت پوشیدہ رکھتی ہے اور ہم صرف اس لیے دھوکا کھا جاتے ہیں کہ ہمارا دل اور دماغ اسے تسلیم نہیں کرتا۔ اسی لیے ہم نہایت سختی سے اس اصول پر کاربند ہیں کہ کسی شخص کے دعوے کو بغیر آزمائے اس کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کرتے۔ میں اپنی سوچ میں غرق تھا، لیکن دوسری طرف اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ نجانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے اس کی پراسرار آنکھوں میں میرے لیے حقارت آمیز تاثر موجود ہے۔ مجھے مزید غصہ آ گیا۔ میں نے چلا کر کہا "تم میرے سامنے ابھی اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرو۔"

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک سفید رنگ چھوٹا سا چوہا نکال میرے سامنے ڈیسک پر رکھ دیا۔ پھر میری طرف ایسی نگاہ سے دیکھا گویا وہ میرے حکم کا منتظر ہے۔

"اب تم اس چوہے کے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

جواب میں اس نے اپنی آنکھیں چوہے کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ اس کی چمکدار آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں اور وہ یوں دکھائی دینے لگا جیسے بہت زیادہ پی گیا ہو۔ چند ہی لمحے گزرے ہوں گے، میں نے دیکھا کہ وہ حقیر سا جانور اچانک اپنی تمام تیزی و طراری بھول کر یک دم ساکت ہو گیا۔ اس زرزور نے فاتحانہ نعرہ لگایا اور کرسی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"واقعی کمال ہے۔" میں نے ستائشی انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ "تم ذرا دیر یہیں ٹھہرو، میں اپنی تسلی کے لیے ایک اور تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں تیزی سے باہر آ گیا۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ یقیناً اس نے معمولی سے چوہے پر کافی محنت کی ہو گی۔ جب میں واپس آیا، تو میرے ہاتھوں میں میرا پالتو بلا، جنجر دبا ہوا تھا۔ میں یہ سوچ کر لطف لے رہا تھا کہ اب وہ یقیناً کافی پریشان ہو گا، بلکہ عین ممکن ہے کہ اس مرتبہ ناکام ہو جائے۔

میں نے بلا اس کے سامنے ڈیسک پر رکھ دیا اور منتظر رہا کہ اب پردۂ غیب سے کیا نمودار ہوتا ہے۔ روشن آنکھیں حسب معمول اپنے کام میں منہمک ہو گئیں۔ مجھے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ جنجر بھی رفتہ رفتہ مدہوش ہو رہا تھا اور پھر وہ بالکل بے دم ہو گیا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ تم نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا۔" میں نے فراخدلی سے اعتراف کیا۔ اس کی صلاحیتیں دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں فوراً ہی ایک عجیب و غریب منصوبے نے جنم لیا تھا۔ مجھے وہ منصوبہ بالکل بے داغ نظر آتا تھا۔

"کیا یہ عمل گھوڑوں پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

حیاتیاتی ٹیکنالوجی اور دواسازی

دواسازی کے ایک بڑے حصے کو حیاتیاتی ٹیکنالوجی نے متاثر کیا ہے، لیکن اینٹی بائیوٹک ادویہ اور ٹیکوں کے میدان میں حیاتیاتی ٹیکنالوجی نے زبردست نتائج ظاہر کیے ہیں۔ انسانی ہارمون، پودوں کے ہارمون اور خامرے (انزائمز) اب سستے داموں تیار کیے جا سکتے ہیں۔ حیاتیاتی ٹیکنالوجی کی مدد سے بنی انسولین کے استعمال سے تو ہم واقف ہی ہیں۔ ہیضے، سرطان اور یرقان جیسے موذی امراض سے دفاع کے واسطے ٹیکے بنانے کی کوشش بھی اسی تکنیک کی مدد سے جاری ہے۔ اسی کی بدولت شاید جلد ہی ہم ملیریا کا ٹیکا لگوا سکیں گے۔ اب پیدائشی نقائص اور بیماریوں کا نہ صرف قبل از وقت پتا لگا لیا جاتا ہے بلکہ ان کا علاج بھی کافی حد تک ممکن ہے۔ دواسازی میں یہ جدتیں محض انسانوں تک ہی محدود نہیں بلکہ جانوروں اور پودوں کے امراض کو بھی بہتر طریقے سے سمجھا جا سکتا اور علاج کیا جا سکتا ہے۔

(سائنس نامہ سے ماخوذ)

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔'' اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

میں خوشی سے دیوانہ ہو گیا اور بار بار اس کے ہاتھ چومنے لگا۔ ''میں تمھیں گھڑ دوڑ کے شعبے کا منیجر مقرر کرتا ہوں۔'' میں نے پیشکش کی جو اس نے قبول کر لی۔

''کیا تم قمار بازی سے متعلق کچھ معلومات رکھتے ہو؟'' ابھی کنٹریکٹ کے کاغذ پر اس کے دستخط بھی خشک نہیں ہوئے تھے کہ میں نے پوچھ ڈالا۔

اس نے بڑے ہی وقار سے اثبات میں سر ہلایا؛ ایک ایسا انداز جو یقیناً منیجر کے شایانِ شان تھا۔

''ٹھیک ہے، ویسے کچھ زیادہ فکر و تردد کی بات نہیں، میں تفصیل بتاتا ہوں۔'' میں نے نرم لہجے میں اپنا منصوبہ سمجھانا شروع کیا ''میں سوچ رہا ہوں کہ ہم غیر معروف اور چھوٹے قصبوں میں گھڑ دوڑ کے ایسے مقابلوں میں حصہ لیں جہاں سے زیادہ سے زیادہ اچھے گھوڑے مقابلے میں حصہ لے رہے ہوں۔ پہلے ہم اس بات کی چھان بین کر لیں کہ ایسا کون سا گھوڑا ہے جو مقامی لوگوں میں زیادہ معروف ہے اور جس کے جیتنے کے زیادہ امکانات ہیں۔ پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ دوسرا مقبول ترین گھوڑا کون سا ہے۔

''ہماری رقم اسی گھوڑے پر لگی ہو گی، جس کے دوسرے نمبر پر آنے کے امکانات زیادہ ہوں گے۔ پہلے نمبر پر آنے والے گھوڑے کو تم بیٹا ناٹز کرو گے۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح ہمیں چند بار نقصان بھی اٹھانا پڑے۔ وہ یوں کہ جس گھوڑے کے بارے میں ہم فرض کر لیتے ہیں کہ یہ دوسرے نمبر پر آئے گا، تیسرے یا چوتھے نمبر پر آ جائے، لیکن مجموعی طور پر ہم یقیناً فائدے میں رہیں گے۔

''ہاں، ایک خاص بات اور نوٹ کر لو۔ تمھیں ایسا عمل کرنا ہے کہ وہ گھوڑا بالکل ہی ناکارہ ہو جائے، ورنہ مقابلہ ملتوی ہو سکتا ہے۔ تمھیں صرف اتنی ترکیب لڑانی ہے کہ آگے دوڑنے والا گھوڑا ذرا سست پڑ جائے اور دوسرے نمبر کے گھوڑے کو اوّل آنے کا موقع مل سکے۔ کیا ایسا ممکن ہے؟''

میری طویل تقریر سنتے سنتے اس کے چہرے پر بیزاری سی چھا گئی تھی، لیکن جواب میں اس نے زبردستی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا ''ہاں ہاں، کیوں نہیں! بس مجھے ذرا زیادہ محنت کرنا ہو گی۔ میں یہ کام بآسانی کر لوں گا۔''

میں نے اپنی خطرناک مہم کا آغاز عنقریب ہونے والی گھڑ دوڑ سے کیا۔ وہ جگہ پانچ فرلانگ دور تھی۔ دوڑ آج ہی ساڑھے تین بجے شروع ہونے والی تھی اور مقابلے میں دو سال سے کم عمر گھوڑے حصہ لے رہے تھے۔

ہم منزلِ مقصود پر وقت سے بہت پہلے پہنچ گئے۔ مقابلے میں حصہ لینے والے تمام گھوڑے دُلکی چال چلتے مقررہ مقام پر آ کھڑے ہوئے۔ دوڑ شروع ہوتے ہی ہیری نے مقبول ترین گھوڑے کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں۔ گھوڑے نے ایک جھٹکا کھایا، لیکن خدا کا شکر ہے کہ کسی کو کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہوا۔ وہ گھوڑا جس کے بارے میں سب کو یقین تھا کہ جیت جائے گا، ہمارے 'پسندیدہ' گھوڑے سے چند قدم پیچھے رہ گیا اور ہماری لگائی رقم بڑھ کر چار گنا ہو گئی۔

اس طرح ہماری شراکت نہایت خوشگوار انداز میں ترقی کے مراحل طے کرتی چلی گئی۔ اب ہر مقابلے میں یہی ہونے لگا کہ وہ گھوڑے جو مشہور و معروف ہوتے، چند قدم کے فاصلے سے شکست کھا جاتے۔ بعض جگہ ہمارا نشانہ خطا بھی ہو گیا اور ہم سو فیصد یقین کے باوجود ہار گئے۔ اس کے باوجود دو مہینے کے اندر اندر میں بیس ہزار پاؤنڈ کا مالک بن چکا تھا۔

ہمارے کاروبار کی راہ میں بس ایک مصیبت رکاوٹ ثابت ہوئی۔ ہمیں ملک میں ہونے والی گھڑ دوڑ کے مقابلوں کی تازہ ترین اور مفصل معلومات حاصل کرنا پڑتی جن کا حصول کٹھن مرحلہ تھا۔ اس کے علاوہ ہر دوڑ میں حصہ لینے کے جنون میں ہمیں ہر دم سفر میں رہنا پڑتا جس کی وجہ سے ہماری ذہنی حالت خراب رہنے لگی۔ آخرکار غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اب کسی

بڑے مقابلے میں قسمت آزمائی ہونی چاہیے۔

میں نے سینٹ لیگر میں ہونے والی دوڑ کا انتخاب کیا جو ایک ماہ بعد منعقد ہونے والی تھی۔ مقابلے میں صرف پانچ گھوڑے حصہ لے رہے تھے۔ دوڑ کے ماہرین پُراعتماد تھے کہ پسندیدہ گھوڑا ہر حال میں کامیاب ہوگا اور واقعی اس قابل رشک صحت کے حامل گھوڑے کو دیکھ کر اس بات پر شک کرنا بھی گناہ تھا۔ لوگوں کا دوسرا پسندیدہ گھوڑا "سنی بے" تھا۔ ہمارے نظریے کے مطابق "سنی بے" کی جیت کے امکانات سو فیصد تھے بشرطیکہ ہماری ترکیب کارگر رہے۔ میں نے اپنی کل جمع پونجی..... پچاس ہزار پاؤنڈ دوڑ شروع ہونے سے تین ہفتے قبل "سنی بے" پر لگادی۔ میرا دل مارے خوشی کے بے قابو ہوا جا رہا تھا، کیوں کہ بہت جلد میں ساٹھ ہزار پاؤنڈ کا مالک بننے والا تھا۔

اس مرتبہ ہم بالکل فارغ تھے لہٰذا فیصلہ کیا کہ روزانہ میدان کا چکر لگائیں اور اگر ہو سکا، تو پسندیدہ گھوڑے پر اپنا عمل آزما کر دیکھیں کہ اس پر کیا اثر ہوتا ہے۔ میں نے ہیری کو مشورہ دیا کہ اس کے بجائے کہ ہم آخری موقع پر اپنا داؤ آزمائیں کیوں نہ ابھی سے آہستہ آہستہ اسے سست اور کمزور بناتے چلے جائیں۔ اس گھوڑے کی شاندار صحت کے پیش نظر خطرہ تھا کہ کہیں ہم عین وقت پر اسے مسحور کرنے میں ناکام نہ ہو جائیں۔

ہیری نے اس مشورے پر صاد کیا۔ ہم نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ اس گھوڑے تک پہنچ جائیں، لیکن ہر مرتبہ ناکام رہے۔ ہمارے بیشتر کامیاب حملوں نے گھڑ دوڑ کی دنیا میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ شاید اسی لیے حفظ ماتقدم کے طور پر حصہ لینے والے تمام گھوڑوں کی نہایت سختی سے حفاظت کی جا رہی تھی۔ مجبوراً ہمیں صبر کر کے بیٹھ جانا پڑا۔

آخر کار وہ دن آ ہی گیا جس کا ہمیں بے چینی سے انتظار تھا۔ ہم میدان کے اس حصے میں پہنچ گئے جہاں دوڑ شروع ہونے سے پہلے سبھی گھوڑے جمع ہوتے ہیں۔ ہم منتظر تھے کہ گھوڑے سب باہر آتے ہیں۔ میرا ساتھی ہیری بھی سخت بے

دمے اور ٹی بی کی شناخت

امریکی سائنسدانوں نے ٹی بی اور دمے کی شناخت کے لیے ایک کم خرچ مائیکرو چپ تیار کی ہے جو مریض کے تھوک اور بلغم کے ذریعے مرض کا پتا لگا سکتی ہے۔ اس چپ کو امریکی یونیورسٹی کے قلب، پھیپھڑوں اور خون کے انسٹی ٹیوٹ کے سائنسدانوں نے مشترکہ طور پر تیار کیا ہے۔ اس میں تھوک کو چند مائعات کے ساتھ ملا کر اس پر الٹرا ساؤنڈ ڈالی جاتی ہے۔

اس سے قبل دمے اور ٹی بی کے مریضوں کے تھوک اور بلغم کو کئی مشینوں اور ہاتھوں سے گزارا جاتا تھا جس سے اس میں موجود جراثیم پھیلنے کا خطرہ بڑھ جاتا تھا۔

اس چپ کے لیے تھوک اور بلغم کی بہت تھوڑی مقدار درکار ہوتی ہے اور اس کے لیے کسی خاص تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی یہاں تک کہ خود مریض بھی اس چپ کو استعمال کر سکتا ہے۔ اب کم خرچ چپ کے ذریعے انسانی مائعات کی تفتیش سے جراثیم پھیلنے کے خطرات بھی کم ہو جائیں گے اور کام پورا ہونے کے بعد اسے فوری ٹھکانے لگانا ممکن ہوگا۔

چین اور پسندیدہ گھوڑے کو ہپناٹائز کرنے کے لیے شدید مضطرب نظر آتا تھا۔

خدا خدا کر کے گھوڑے اصطبل سے نمودار ہوئے۔ محافظوں کا جھرمٹ ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ہم دونوں کی نگاہیں مسلسل اسی جانب تھیں۔ اپنے ساتھی کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا، ہاں میں اپنی حالت سے ضرور آپ کو مطلع کروں گا۔ میری حالت یہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ میرا دل غم و افسوس کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا..... دوڑ میں حصہ لینے والے تمام گھوڑوں کی آنکھوں پر سیاہ چمڑا منڈھا ہوا تھا۔

پروٹوکول انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ مگر اردو میں اتنا رائج ہو چکا کہ اب ہر کوئی اس کے معنی سمجھتا ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ پروٹوکول کا اصل مدعا کیا ہے؟ ہمارے ملک میں صدر، وزیراعظم، وزرا اور دیگر "وی آئی پی" شخصیت کو یہ اتنا زیادہ فراہم کیا جاتا ہے کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر چین ہی چین محسوس کرنے لگتے ہیں۔ انھیں کہیں بدامنی دکھائی دیتی ہے اور نہ ہی بھوک افلاس! شاید یہ ہماری خفیہ ایجنسیوں کا کمال ہے کہ وہ ہمارے آقاؤں کو جنھیں ہم خود منتخب کرتے ہیں، یہ باور کرا دیتے ہیں کہ ان کی جان از حد خطرے میں ہے۔

یہ پروٹوکول پانے کی خاطر اتنی تگ و دو کی جاتی ہے کہ ہر حکمران کروڑوں روپے خرچ کر کے اسے حاصل کرتا ہے۔ جان جاتی ہے تو جانے دیں، بقول فیض صاحب ؎

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے

ایک بار صدر ضیا الحق مرحوم نے فرمایا "آج سے میں سائیکل پر دفتر جاؤں گا۔" لیکن اس دن کی سائیکل سواری قوم کو لاکھوں روپے میں پڑ گئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ صدر صاحب کے پروٹوکول کا خاص انتظام کرنا پڑا۔

پروٹوکول کی مصیبت

حکمرانوں اور عوام کے تعلقات میں دراڑیں ڈال دینے والی رکاوٹ

پرنسپل (ر) منظور احمد

ایک بادشاہ کا واقعہ ہے۔ اس کے دربار میں چند فراڈیے آئے اور کہا "ہم ایسا کپڑا بن سکتے ہیں جسے نااہل آدمی نہیں دیکھ سکتا۔ لہٰذا اگر بادشاہ اس کپڑے کا لباس بنوا کر پہن لے تو اپنے جملہ نااہل کارندوں کو آسانی سے پہچان لے گا۔"

یہ سن کر بادشاہ بے حد خوش ہوا۔ اس نے فوراً کپڑا بننے کا حکم دیا اور ساتھ پیشگی معقول رقم بھی دی۔ دربار سے ہٹ کر آدمیوں نے کھڈی لگائی اور کپڑا بننے کی اداکاری کرنے لگے۔ ہر ہفتے وہ دھاگا خریدنے کے لیے مزید رقم مانگ لیتے۔ بادشاہ کسی درباری کو یہ سن گن لینے کے لیے بھیجتا کہ کپڑا تیار ہوا ہے۔ وہ واپس آ کر "او کے" کی رپورٹ دیتا اور کہتا کہ جناب بہت عمدہ کپڑا بن رہا ہے۔ ظاہر ہے، کون کپڑے کی عدم موجودگی بتا کر خود کو نااہل ثابت کرواتا؟

کافی دن بعد بادشاہ نے خود چکر لگایا تو کھڈی کو خالی دیکھا مگر یا انکشاف کرنے سے خود نااہل ثابت ہوتا لہٰذا خاموشی سے واپس آ گیا۔ کئی ماہ بعد بادشاہ کے حکم پر کپڑا کھڈی سے اتار شاہی درزی کو دیا گیا تاکہ وہ شاہی لباس سی سکے۔ اگر درزی کہتا کہ کپڑے کا تو نام و نشان نہیں تب وہ بھی نااہل ثابت ہوتا۔ اسی لیے اس نے جھوٹ موٹ کپڑے سیئے اور بادشاہ کے حوالے کر دیے۔

اب دربار میں بادشاہ کو لباس پہنانے کی تقریب منعقد ہوئی۔ مبارک سلامت کے بعد جلوس کی شکل میں بادشاہ کو بازار لے جایا گیا۔ سلطنت کا کوئی مکین یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ بادشاہ تو برہنہ ہے۔ آخر ایک معصوم سات سالہ بچے نے نعرہ لگا دیا "ابا! بادشاہ تو ننگا ہے۔" باپ نے اسے خاموش کرانے کی کوشش کی مگر قریب دوسرا بچہ بھی بول پڑا۔ یوں بادشاہ کا "پروٹوکول" ٹوٹ گیا۔

اسی سے ملتی جلتی حالت ہمارے حکمرانوں کی بھی ہے۔ حکومت میں آنے سے قبل وہ بڑے بڑے وعدے کرتے ہیں، مگر اقتدار ملتے ہی پروٹوکول انھیں گھیر لیتا ہے۔ پھر انھیں مہنگائی نظر آتی ہے اور نہ ہی غربت و افلاس بلکہ ساون کے اندھے کی طرح ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے۔ اگر کوئی خوشیوں کی محفل میں رنگ میں بھنگ ڈالنے کی سعی کرے تو حکمرانوں کا معتوب بن جاتا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے وزیراعظم بن کر شروع میں کوشش کی تھی کہ عوام کے بد حالات سدھار سکیں۔ وہ کبھی رات کو اسپتال پہنچ جاتے یا دن کو اچانک کسی سرکاری دفتر کا دورہ کرتے۔ مگر رفتہ رفتہ پروٹوکول کا شکار ہو کر نہ صرف عوام سے کٹے بلکہ پہلے جیل پہنچے اور پھر جان سے بھی محروم ہوئے۔

اسی طرح صدر ایوب خان کے دور میں ہر ماہ ریڈیو پر تقریر کرنے کا رواج پڑا۔ مگر رفتہ رفتہ ایوب خان کو پروٹوکول نے ایسا گھیر لیا کہ ان کے لیے ہر اخبار کا خاص پرچہ شائع ہونے لگا، ماسوائے "نوائے وقت" کے! نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دن پریس کانفرنس میں ایوب خان نے پوچھا "او بھئی کدھر ہے نوائے وقت والا تو بھی ٹھیک ٹھیک لکھا کر۔"

ایک بار صدر ایوب نے درباری مشاعرے کی صدارت کی۔ سب شعرا نے بڑھ بڑھ کر ان کی شان میں تعریفی اشعار کہے۔ مگر مرزا محمود سرحدی کہیں کونے میں بیٹھے تھے۔ باری آنے پر کہہ گئے۔

اقبال کا کہا مانا

اور فاقوں کے ہاتھوں مرتے رہے
جھکنے والوں نے رفعتیں پائیں
ہم خودی کو بلند کرتے رہے

ان کی نظم سن کر ایوب خان بڑے ناراض ہوئے اور حکم دیا "اس شاعر کو مدعو کرنے والا افسر ملازمت سے معطل کر دیا جائے۔"

وطن عزیز میں کاش کوئی ایسا طریقہ ایجاد ہو جائے کہ صدر، وزیراعظم اور وزرا کو گردوپیش کی صحیح صورت حال کا علم رہے۔ وگرنہ عوام اسی طرح مرتے اور خواص حکمرانی کے مزے لوٹتے رہیں گے۔ ادھر خفیہ ایجنسیاں پروٹوکول کے بہانے اپنی من مانی کرتی رہیں گی۔ آخر میں یہی دعا ہے کہ اے اللہ، میرے دیس میں حضرت عمرؓ جیسا کوئی راہنما پیدا کر جو پروٹوکول سے بے نیاز ہو کر حکومت کر سکے۔ تبھی عوام کی بھلائی ہوگی، وگرنہ اللہ حافظ!

◆◆◆

ہمیں دیتا ہے جو سنبھلنے کا پیغام

مکافاتِ عمل

اندھا دھند کمائی کے جنون میں وہ بھلا بیٹھا
کہ بُرائی آخر اپنے خالق ہی کو آدبوچتی ہے

مبشرہ خالد

"صدیقی صاحب! آپ ہمیں خوش کرتے رہے، تو ہم آپ کو خوش کرتے رہیں گے۔" عاصم صاحب نے فون پر گفتگو کرتے ہوئے کہا۔
عاصم حمید کا شمار شہر کے معزز لوگوں میں ہوتا تھا۔ اللہ نے انھیں دولت اور اولاد، دونوں نعمتوں سے نوازا تھا۔ دو جوان بیٹے ان کے مضبوط بازو تھے۔

☆☆

"یہ حسن اور فریحہ کہاں ہیں؟" عاصم صاحب نے بیگم سے کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
"میاں صاحب، دونوں کی نئی نئی شادی ہے، دل میں کچھ ارمان ہیں۔ باہر گھومنے پھرنے گئے ہیں۔"
"ویسے کچھ زیادہ ہی نیک دل ساس نہیں ہیں آپ؟"
"ساس نہیں، ماں ہوں۔ مجھے تو صرف اپنے بیٹے کی خوشی عزیز ہے، وہ خوش میں خوش۔"
"گویا آپ بھی روایتی ساس ہیں۔"
"سائیں ہوتی ہی روایتی ہیں میاں صاحب۔ اب آپ کھانا کھالیں۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے، مگر مجال ہے جو آپ نے خانساماں رکھا ہو۔ ساری زندگی کھانے پکانے میں گزار دی۔" بیگم نے شکوہ کیا۔
"اب آپ جیسا کھانا کوئی پکا ہی نہیں سکتا، تو اس میں میرا

"یہ قصور؟"

"اچھا! بس بس زیادہ مکھن نہ لگایئے۔"

☆☆☆

"مجھے تو ڈر ہی لگ رہا تھا کہ کہیں امی منع ہی نہ کر دیں، مگر شکر ہے ایسا نہیں ہوا۔" فریحہ نے آئس کریم کھاتے ہوئے کہا۔

"اب میری امی اتنی بھی سخت دل نہیں کہ منع کر دیتیں۔ محبت ہے انہیں بہت۔ ہماری خوشیوں کا خیال ہے۔"

"میں تو ہوں۔"

"پلیز فریحہ، میں اس وقت تمہارے ساتھ اچھا وقت گزارنے آیا ہوں، تم بحث میں نہ پڑو۔"

"گجرے لو صاحب!" ایک لڑکا قریب آ کر بولا۔

"کتنے کے ہیں؟"

"پچاس کی جوڑی۔"

"ہاں دے دو۔" حسن نے پیسے نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

"لوٹ رہا ہے آپ کو، یہ پچاس روپے کے گجرے ہیں؟" لڑکا جا چکا تو فریحہ بول اٹھی۔

"آج سنڈے نے میں پچاس روپے ہوتے کیا ہیں؟ خیر ہے۔"

"اسی طرح ان لوگوں کی عادتیں بگڑتی ہیں۔"

"اب بس بھی کرو۔ لاؤ ہاتھ دو، گجرے پہنا دوں۔"

فریحہ نے ہاتھ آگے کیا اور حسن نے گجرے پہنا دیے۔

☆☆☆

"پاپا! وہ فاروق صاحب کو کب تک مال پہنچانا ہے؟" حسن سے چھوٹا ایاز بولا۔ وہ کاروباری معاملات کو اچھے طریقے سے دیکھتا تھا، اس وجہ سے عاصم حمید اسے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

"اس مہینے کی بیس تاریخ تک۔" عاصم صاحب نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ اور ہاں پاپا، میں آج فیکٹری سے جلد نکلنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟ بھئی خیریت تو ہے؟"

"پاپا شک تو مت کیا کریں۔ رضوان سے ملنا ہے۔ اسٹور کھینچے جانے کا موڈ ہے۔"

"چلیے جاؤ، مگر یہ روز روز نہیں چلے گا۔"

"جانتا ہوں پاپا، جانتا ہوں۔"

☆☆☆

"یہ حسن کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں ہے۔" بیگم نے جواب دیا۔

"اس کا کب تک چھٹیاں منانے کا ارادہ ہے؟"

"کھانے پر آئے گا تو خود ہی پوچھ لیجیے گا۔"

"فریحہ بیٹا! حسن کھانا نہیں کھائے گا؟" عاصم صاحب نے کمرے سے اکیلے باہر نکلتی فریحہ سے پوچھا۔

"پاپا! ان کی صبح سے طبیعت خراب ہے۔ بخار اور جسم میں درد بھی بتا رہے تھے۔ میں نے دوائی دی ہے، سو گئے ہیں۔"

"ہائے میرے بچے کی طبیعت خراب ہے اور تم نے بتایا بھی نہیں۔" ساس بیگم یوں چلائیں جیسے ان کا کلیجہ منہ کو آ گیا ہو۔

"بہو بتا تو رہی ہے کہ دوائی دی ہے اور وہ سو چکا۔ تمہیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر شور مچانے کا شوق ہے۔"

"آپ کو کیا پتا بچے کے پاؤں میں کانٹا چبھے تو درد ماں کو ہوتا ہے۔ میرا بچہ بخار میں ہے اور مجھے ہی خبر نہیں۔" یہ کہتی ہوئی بیگم، حسن کے کمرے میں چلی گئیں۔

"پاپا! میں صبح سے ان کا خیال رکھ رہی تھی۔ کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ اب میں کھانا کھا لوں؟"

"ہاں! ہاں! بیٹا کھا لو۔"

"امی کچھ کہیں گی تو نہیں؟"

"ارے بیٹا ساس کی باتوں کو ایک کان سے سنو اور دوسرے سے نکال دو۔ بھئی، آؤ کھانا کھاتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے میز پر سسر بہو کھانا کھانے بیٹھ گئے۔

☆☆☆

"امی امی! ابو ابو! ایاز، کہاں ہے سب؟" بارہ بجے فریحہ کی آواز لاؤنج میں گونج رہی تھی۔

"یا اللہ خیر" کہتے ہوئے عاصم حمید بیگم کے ساتھ کمرے سے

باہر نکلے۔ "کیا ہوا بیٹا؟"

"امی امی! وہ حسن...."

"کیا ہوا حسن کو؟"

"وہ بہت کپکپا رہے ہیں۔ کسی بات کا جواب بھی نہیں دے رہے۔"

"ایاز، ایاز، کمرے سے باہر آؤ۔"

"جی جی ابو۔"

"گاڑی نکالو، بھائی کو اسپتال لے کر جانا ہے۔"

"بیٹا، سب ٹھیک ہو جائے گا، اتنی پریشان نہ ہو۔" سسر نے پھر فریحہ کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

"دیکھیے آپ لوگ دعا کریں کہ کوئی معجزہ ہو جائے۔ مریض کا بچنا بہت مشکل ہے۔" ڈاکٹر نے آکر بتایا۔

"آپ ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں؟ ان کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ ہلکا سا بخار ہی تو تھا...." فریحہ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"کیا آپ نے انھیں کوئی دوائی دی تھی؟"

"ہاں دی تھی۔"

"کون سی؟"

"پیناڈول ہی دی تھی۔"

"لگتا ہے گھبراہٹ میں آپ نے کوئی اور دوائی دے ڈالی۔ پیناڈول کا اتنا خراب ردعمل ہو ہی نہیں سکتا کہ جسم میں زہریلا مواد پھیل جائے، ناممکن!"

"ڈاکٹر صاحب! وہی دی تھی۔"

"پھر میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے اس کی معیاد ختم ہو چکی ہو یا پھر جعلی۔ بہرحال آپ دعا کیجیے۔" یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر آپریشن تھیٹر کی طرف بڑھ گیا۔

"امی، پاپا...."

"بیٹا کچھ نہیں ہوگا، ہمت سے کام لو۔" یہ کہتے ہوئے عاصم صاحب نے فریحہ کو گلے لگا لیا۔ وہ سب کو دلاسا دے تو رہے تھے، مگر کوئی ان سے پوچھتا کہ اس وقت ان کی اپنی کیا حالت ہے؟ وہ کیا سوچ رہے ہیں، کس کیفیت سے گزر رہے ہیں تو جواب نہ دے پاتے۔

☆☆☆

"عاصم! پیسا کمانا بھی ایک فن ہے۔ یہ فن قسمت والوں کو ملتا ہے، ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ تم نے سنا ہوگا کہ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں کہ آپ مفلوک الحال پیدا ہوئے، مگر یہ آپ کا قصور ہے کہ آپ غریب ہی مر جائیں۔ دیکھو اپنا مفاد سب کو عزیز ہوتا ہے۔ آج کی دنیا میں دوسروں کی پروا کرنا فضول ہے، اور میں ہوں نہ تمھارے ساتھ۔" فیروز نے عاصم حمید کو راضی کرتے ہوئے کہا تھا۔

☆☆☆

"مجھے افسوس ہے، ہم مریض کو نہیں بچا سکے۔" ڈاکٹر نے آپریشن تھیٹر سے نکلتے ہوئے کہا۔

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ امی امی...." فریحہ چیخ اٹھی۔

"پیچھے ہٹو، تمھاری وجہ سے میرا بیٹا دنیا سے چلا گیا۔ میرا جوان جہان بیٹا!" یہ کہتے ہوئے بیگم عاصم آپریشن تھیٹر کی طرف بڑھیں جہاں اسٹریچر پر حسن کی لاش باہر لائی گئی۔

"حسن حسن...."

"خبردار جو تم قریب آئیں۔" بیگم نے چیختے ہوئے فریحہ کو کہا۔

عاصم حمید صرف بیٹے کو ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

ابھی کل ہی کی بات لگتی ہے جب انھوں نے اپنے بیٹوں کا مستقبل سنوارنے کے لیے جعلی ادویہ کا کام شروع کیا۔ خوب پیسا کمایا اور بنایا۔ بیٹوں کو پڑھایا لکھایا۔ بیٹے بڑے ہوئے تو اسی کام کی کمائی سے فیکٹریاں بنا لیں۔

آج ان کا اپنا بیٹا چل بسا اور ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ یہ جعلی دوائی کا اثر ہے۔ کیا ان سے دنیا ہی میں حساب لے لیا گیا؟ انھوں نے کتنی ہی ماؤں کی گودیں اجاڑی تھیں۔ آج ان کے جوان کا بے جان لاشہ نظروں کے سامنے پڑا تھا اور وہ سوائے ماتم کے کچھ نہیں کر سکے۔ مکافاتِ عمل کسے کہتے ہیں، آج ان پر منکشف ہو گیا۔ ●●●

TENDER NOTICE

Sealed tenders based on item rate / percentage above of Market Rate System District Jhang are hereby invited for the work mentioned below from the eligible Contractors / Firm enlisted with Local Govt. & Community Development, Jhang.

Tender documents can be obtained from the office of the Assistant Engineer, LG&CD, Jhang against written request accompanied with attested copies of original letter of enlistment / up to date renewal fees receipt and P.E.C. License (Code No. CE-01) 2015 for Road. Authority letter on stamp paper duly registered. identity card of contractor / managing partner of the firm along with power of attorney and on payment of prescribed tender fee through Bank Challan through C.D.R (C-3801 unclaimed deposits).

Tendered rates and amounts should be filled in figures as well as in wards and tenders should be signed as per general direction given in the tender documents. No rebates on tendered rates will be acceptable.

Conditional tenders and tenders not accompanied with earnest money in shape of deposit at call respect of schedule bank and attested copies of registered partnership deed and power of attorney in case of firms will not be entertained. As per PPRA Rules, 27 the Contractors / Participants will have to furnish 5% Earnest Money in Shape of deposit at call at the time of issuance of tender documents.

Additional performance security will have to deposited of amount less than 5% of the approved estimated (DNIT) amount within 15 days of issuance of notice vide Finance Department Notification No. RO (Tech) Fd-1-1/83(VI) (P) dated: 06.04.2005.

The tender will be issued upto 09.09.2015 during the office hours and received in the office of undersigned on 10.09.2015 upto 01.00 PM and will be opened at 2.00 PM on the same date.

Sr. No.	Constituency No.	Name of Scheme	Estimated Cost	T.S No.	Printing and Publication Charges fee
1.	PP-78	Construction of Soling/Drain, PCC Slab, Sewerage etc. adjoining abadies Basti Dewanwali Union Council No. 87 Jhang.	1.000	XEN/LG&CD/JG/ 1409 dated 02.07.2015	10000/
2.		Construction of Soling/Drain, PCC Slab, Sewerage etc. adjoining abadies Katchi abadies Union Council No. 87 Jhang.	1.000	XEN/LG&CD/JG/ 1410 dated 02.07.2015	10000/
3.		Construction of Soling/Drain, PCC Slab, Sewerage etc. adjoining abadies Jalalabad Union Council No. 87 Jhang.	1.000	XEN/LG&CD/JG/ 1411 dated 02.07.2015	10000/
4.		Construction of Soling/Drain, PCC Slab, Sewerage etc. adjoining abadies Allahabad Union Council No. 87 Jhang.	1.000	XEN/LG&CD/JG/ 1412 dated 02.07.2015	10000/
5.		Construction of Soling/Drain, PCC Slab, Sewerage etc. adjoining abadies Zafarabad Union Council No. 87 Jhang.	1.000	XEN/LG&CD/JG/ 1413 dated 02.07.2015	10000/
6.		Construction of Soling/Drain, PCC Slab, Sewerage etc. adjoining abadies Qasmi Colony, Jhang.	1.000	XEN/LG&CD/JG/ 1421 dated 02.07.2015	10000/
7.		Construction of Soling/Drain/ PCC Slab, Sewerage etc. adjoining abadies Union Council No. 91 Jhang.	1.000	XEN/LG&CD/JG/ 1423 dated 02.07.2015	10000/-
8.		Construction of Drainage, PCC SDlab Street Mosque Khulf-e-Rashideen Wali, Mohallah Pindi & Adjoining Abadies. (Phase-II).	1.500	XEN/LG&CD/JG/ 1452 dated 02.07.2015	10000/

Assistant Engineer
Local Govt. & Community Development
Jhang

[illegible]

جوابات بھیجنے کا پتہ: **مدیر ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ ۳۲۵۔ جی ثمری جوہر ٹاؤن لاہور**

ماہ اگست میں دیے گئے قصہ کوئز کے صحیح جوابات

قصہ کوئز ۱۔ (الف) نہر سویز (ب) فرانس

قصہ کوئز ۲۔ (الف) ٹیلی ویژن (ب) جان لوگی بیئرڈ

قصہ کوئز ۳۔ (الف) ہنٹسل (ب) برطانیہ

درست جوابات دینے والوں کے نام

آصف کریم (حیدرآباد)، محمود منور خان (سرگودھا)، شیر نواز گل (پشاور)، محمد یوسف قریشی (حیدرآباد)، کاشف مرزا (حیدرآباد)، ولی حسنین (حیدرآباد)، عبدالمعصم (حیدرآباد)، محمد یٰسین راندروی (حیدرآباد)، محمد احمد (کراچی)، مرزا ہادی بیگ (حیدرآباد)، منعم عالم (کراچی)، مریم شیخ (ملتان)، حسیب اللہ جان (پشاور)، ظفر اسماعیل (راولپنڈی)، اطیب جان (واہ کینٹ)، ازغفر وقاص (راولپنڈی)، اسحق امین (واہ کینٹ)، محمد الیاس زاہد (منڈی بہاؤالدین)، صنیحہ ناصر (اسلام آباد)، محسن حبیب (فیصل آباد)، شمیم اختر (فیصل آباد)، محمد حبیب (فیصل آباد)، عائشہ فاطمہ (فیصل آباد)، فرحت بنت عبدالوحید شیخ (حیدرآباد)، آمنہ رمضان (عارف والا)، حمید اللہ (پاکپتن)، سعید منیر (لاہور)، عبدالوحید (بورے والا)، اختر عباس (گرمانی، مظفرگڑھ)، سعد یاسمین (مظفرگڑھ)، عائشہ (لاہور)، عبدالاحد (اوکاڑہ)، شمینہ سکندر (اوکاڑہ)، انس زاہد (لاہور)

آپ کو ۶ ماہ تک اُردو ڈائجسٹ کے شمارے بطور تحفہ ملیں گے

انچارج کوئز: غلام سجاد

درست جوابات پر انعامات آپ کے منتظر ہیں

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

- شیر نواز گل (پشاور)
- صنیحہ ناصر (اسلام آباد)

نوٹ: تمام قارئین اپنا مکمل نام و پتا اور موبائل یا پی ٹی سی ایل نمبر لکھنا ہرگز نہ بھولیں۔ اس کے بغیر کوریئر سروس کا نمائندہ آپ تک نہیں پہنچ پاتا۔ (ایڈیٹر)

قصہ کوئز/۱

محمد علی بوگرہ مشرقی بنگال میں ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس نے بنگالی مسلمانوں کی خدمت اور خصوصاً تحریک پاکستان کے زمانے میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ آپ کے دادا نواب بہادر سید نواب علی چودھری پہلے مسلمان وزیر تھے جن کو ۱۹۲۱ء میں حکومت بنگال میں وزیر مقرر کیا گیا۔ انھوں نے حصول آزادی سے پہلے سماجی بہبود کے متعدد منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا۔ ان میں کلکتہ میں ایک اسپتال، ڈھاکا میں ایک میڈیکل کالج اور ہندوستان کے پہلے ٹی بی سینیٹوریم کا قیام شامل ہے۔ محمد علی نے ۱۹۳۰ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے گریجوایشن کرنے کے بعد اپنے آبائی ضلع بوگرہ کی مختلف بلدیات سے وابستہ ہو کر اپنی عوامی اور سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ بوگرہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے نائب صدر، اور بوگرہ اسکول بورڈ کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں صوبائی اسمبلی رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں صوبہ بنگال کے وزیراعظم بنے۔ قیام پاکستان کے بعد برما میں پاکستان کے سفیر مقرر ہوئے۔ ایک سال بعد پاکستان کے پہلے ہائی کمشنر کے طور پر کینیڈا میں تعینات ہوئے۔ ۱۷/ ستمبر ۱۹۵۳ء کو دوبارہ دستور ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۲ء کے عام انتخابات میں ضلع بوگرہ کے حلقے سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

(الف) ان کی تاریخ پیدائش اور وفات بتائیں؟
(ب) پاکستان کے وزیراعظم کب بنے؟

قصہ کوئز/۲

آخری مغل تاجدار ہند ۲۴/ اکتوبر ۱۷۷۵ء کو قلعہ معلی، دہلی میں پیدا ہوئے۔ پورا نام ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ غازی۔ آپ اکبر شاہ ثانی کے فرزند تھے۔ والد کی وفات کے بعد باسٹھ سال کی عمر میں ۱۸۳۷ء میں تخت نشین ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز ہندوستان میں اپنے قدم مضبوطی سے جما رہے تھے۔ خود مغل بادشاہ بھی انگریزوں کا پنشن خوار تھا اور اسے اپنا ولی عہد نامزد کرنے کا بھی اختیار نہ تھا۔ چناں چہ بہادر شاہ ظفر بھی جب بادشاہ بنے، تو انھیں بھی ایسٹ انڈیا کمپنی سے سوا لاکھ روپے پنشن ملنے لگی اور ان کا اقتدار فقط لال قلعے کی چار دیواری ہی تک محدود رہا۔

آپ کو موسیقی اور فنون لطیفہ کا شوق تھا۔ اچھے شاعر اور ماہر خوش نویس تھے۔ شاعری کے چار دیوان یادگار چھوڑے ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں جب جنگ آزادی کا آغاز ہوا، تو آپ حریت پسند تحریکوں کا مرکز بن گئے اور انقلابیوں نے آپ کو پورے ہندوستان کا بادشاہ تسلیم کر لیا لیکن بہت سی کوتاہیوں اور کمزوریوں کی وجہ سے یہ جنگ جلد ہی ناکام ہو گئی۔

(الف) ان کی تاریخ پیدائش اور وفات بتائیں؟
(ب) جنگ آزادی کب لڑی گئی؟

قصہ کوئز/۳

نواب بہادر یار جنگ، تحریک پاکستان کے صف اول کے رہنما، حیدر آباد دکن میں ایک نواب خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیم و تربیت بڑے اچھے ماحول میں ہوئی۔ بہت کم عمری میں آپ نے مشرقی علوم میں مہارت حاصل کر لی۔ آپ کی عمر اٹھارہ برس تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا چناں چہ آپ کی آبائی جاگیر کا تمام انتظام آپ کے کاندھوں پر آن پڑا۔ اس کے باوجود ۱۹۳۱ء میں حج کیا اور اسلامی ممالک کا سفر کیا جس کا احوال آپ نے اپنے سفرنامے میں تفصیل سے رقم کیا۔

(الف) ان کی تاریخ پیدائش اور وفات بتائیں؟
(ب) آپ کو کیا خطاب ملا تھا؟

ایک مقابلہ صرف نوجوانوں کے لیے

بوجھیں تو جانیں

مرتب: سجاد قادر

(جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر 18 سے 28 سال کے درمیان ہی ہے)

ماہ اگست میں دیے گئے اسلامی کوئز کے صحیح جوابات

اسلامی کوئز ۱۔ (الف) ۱۰ ذی الحجہ (ب) مسجد جمعہ

اسلامی کوئز ۲۔ (الف) مسجد سبق (ب) شاہ فیصل

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

1۔ تبسم جبیں (دیپالپور) 2۔ محمد علی بابر (پشاور) 3۔ نورین فاطمہ (کراچی) 4۔ محمد ندیم (لاہور)

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

حسیب احمد (حیدرآباد)، شیر نواز گل (پشاور)، ولی حسین (حیدرآباد)، ماہ رخ (حیدرآباد)، ناعمہ تحریم (کراچی)، حیان مرزا (حیدرآباد)، مرزا ہادی بیگ (حیدرآباد)، طہٰ یٰسین (حیدرآباد)، علوہ اسلام (منڈی بہاؤالدین)، محسن حبیب (فیصل آباد)، عائشہ فاطمہ (فیصل آباد)، فرح بنت عبدالوحید شیخ (ملتان)، طوبیٰ انیس (راولپنڈی)، فاطمہ سعد (واہ کینٹ)، احسن کمال یوسفزئی (صوابی)، روبینہ مظہر (دیپالپور)، شہلا اعظم (اوکاڑہ)، تحریمہ رمضان (عارف والا)، اریبہ رمضان (عارف والا)، فراز احمد سلیم (شیخوپورہ)، نویدہ نذیر (بورے والا)، حسنین شبیر (قصور)، محمد ندیم (لاہور)، تبسم جبیں (دیپالپور)، لیاقت علی قصوری (قصور)

اسلامی کوئز ۱

حج کا زمانہ بھیڑ بھاڑ اور دوڑ دھوپ کا ہوتا ہے۔ لوگ مغرب کے بعد عرفات سے روانہ ہوتے تھے۔ اسی حالت میں اگر منیٰ کو براہ راست چلے جاتے، تو راستے کی سختی سے چور ہو جاتے اس لیے انھوں نے ذرا سا سکون اور آرام اٹھانے کے لیے مزدلفہ کو ایک بیچ کی منزل قرار دے لیا تھا۔ اسلام نے اس کو اس لیے باقی رکھا کہ یہیں وہ مسجد واقع ہے جس کو مشعر حرام کہتے ہیں اور یہ عبادت کا خاص مقام تھا۔ اس لیے عرفات سے شام کو لوٹ کر رات یہیں قیام کرنا اور طلوع فجر کے بعد تھوڑی دیر عبادت کرنا ضروری قرار دیا گیا۔

(الف) حج کون سی تاریخ کو ادا کیا جاتا ہے؟ (ب) ارکان حج کتنے اور کون کون سے ہیں؟

اسلامی کوئز ۲

یہ ایک سیاہ پتھر ہے جو کعبہ کے اس گوشے کی دیوار میں لگا ہوا ہے جس کی طرف رخ کرکے کھڑے ہوں، تو بیت المقدس سامنے پڑے گا۔ اس لیے حجر اسود کے مقابل گوشے کا نام "رکن شامی" ہے۔ اس گوشے میں اس پتھر کے لگانے سے مقصود یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے گرد طواف شروع اور ختم کرنے کے لیے وہ ایک نشان کا کام دے۔ ہر طواف کے ختم کے بعد اس پتھر کو بوسہ بھی دے سکتے ہیں۔

(الف) حجر اسود کو خانہ کعبہ میں کس نبی نے لگایا؟ (ب) قربانی کون سی تاریخ کو کی جاتی ہے اور کس کی سنت ہے؟

نوٹ: تمام قارئین اپنا نام و پتا جس پر TCS پہنچ سکے درست لکھیں اور ساتھ میں اپنا موبائل نمبر یا پی ٹی سی ایل نمبر دینا لازم ہے ورنہ TCS پہنچ نہیں پاتا۔

(مدیر اردو ڈائجسٹ لاہور)

بہ تعاون

منصورہ ملتان روڈ لاہور

زندگی کا کوئی بھروسا نہیں

ایک ہنستے مسکراتے دوست کی جب چند لمحات میں کایا پلٹ گئی

رئیس الدین ظہور جعفری

ہوائی اڈے جانے والی شاہراہ کے سامنے بس اسٹاپ کے قریب کھڑے قریباً آدھ گھنٹا گزر چکا تھا۔ گرمی زوروں پر تھی۔ تھری پیس سوٹ میں ملبوس دھوپ میں کھڑے کھڑے مجھے عجیب شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ خاص طور پر جب کوئی ٹیکسی میرے نزدیک آ رکتی اور میں ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیتا۔ اس پر ٹیکسی ڈرائیور مضحکہ خیز مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھ جاتا تو مجھے بڑا عجیب لگتا۔

غالباً وہ لوگ سوچتے ہوں گے کہ صاحب بہادر سوٹ بوٹ میں اکڑ رہے ہیں، مگر جیب خالی ہونے کی وجہ سے ٹیکسی استعمال نہیں کر سکتے۔ کسی بس میں جانے کا ارادہ ہو گا۔ شاید اس وقت کے منتظر ہیں، جب دیکھنے والا کوئی نہ ہو اور وہ تیزی سے بس میں سوار ہو جائیں۔ بس کنڈکٹر بھی "آیئے سر" کہہ کر سوار ہونے کی دعوت دے رہے تھے۔

میری جھنجھلاہٹ ہر لمحہ بڑھ رہی تھی۔ مجھے رہ رہ کر کمپنی کے ڈرائیور پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے اتنی دیر کیوں لگا دی۔ طرح طرح کے وسوسے میری قوت برداشت متزلزل کیے جا رہے تھے۔ مگر میں مجبور تھا۔ اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ ایک کار میرے بالکل قریب رکی۔ میں ڈر کے مارے اچھل پڑا۔ قریب تھا کہ ڈرائیور کو اول فول بکتا، مگر علیم پر نظر پڑتے ہی سارا غصہ ہرن ہو گیا۔

علیم ادارۂ ترقیات بلدیہ میں انجینئر تھا۔ نجی کمپنی میں جانے سے پہلے وہاں میرا ساتھی تھا اور عجیب باغ و بہار شخصیت کا

مالک بھی۔ چوبیس گھنٹے اس کے ہونٹوں پر پان کی سرخی اور مسکراہٹ بیک وقت رقص کرتیں۔ میں نے اسے کبھی فکرمند نہیں دیکھا۔ ادھیڑ عمر کا یہ شخص جس کے چہرے پر ابھی تک جوانی ڈھلنے کے کوئی آثار نظر نہ آتے، ظرافت کی پوٹ تھا۔ پان اور تاش اس کی کمزوری تھی۔ ہر وقت گلوری منہ میں دبائے مسکراتا گول مٹول سا یہ چہرہ لوگوں میں خوشیاں تقسیم کیا کرتا تھا۔

وہ مجھ سے کافی سینئر تھا، اسی لیے میں اس کا احترام کیا کرتا۔ مگر اس نے ہمیشہ میرے ساتھ ہم جولیوں جیسا برتاؤ کیا۔ "میری جان" موصوف کا تکیہ کلام تھا۔ چناں چہ گاڑی روک کر اس نے اپنا سر باہر نکالا اور اسی اپنائیت اور انسیت سے جس سے وہ ہمیشہ پیش آیا کرتا تھا، بولا "کس مہ جبین کا انتظار ہے میری جان؟"

"حلیم بھائی" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ایک غیرملکی مہمان ایک بجے کی پرواز سے آنے والا ہے۔ کمپنی کی طرف سے میری ڈیوٹی لگی ہے کہ اسے خوش آمدید کہوں۔"

اس نے بائیں ہاتھ کی کلائی پر بندھی گھڑی میری طرف بڑھاتے ہوئے مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا۔ "بارہ بج چکے میری جان۔ ہم سے جھوٹ بولتے ہو۔ مہمان کا جہاز اس اسٹاپ پر تو اترنے سے رہا۔ میں بھی ہوائی اڈے جا رہا ہوں۔ تمہاری کمپنی سے لطف اندوز ہوئے کافی عرصہ گزر چکا۔ آج تمہارے ساتھ گپ شپ ہو جائے۔" یہ کہہ کر اس نے اگلی نشست کا دروازہ کھول دیا۔

"بھائی جان! کمپنی کی کار پی۔ آر۔ او کو لینے بھیجی ہے۔ وہ آتا ہی ہوگا۔ آپ کا شکریہ۔" میں نے معذرت کرلی۔

"مگر مجھے تو یہ سب کچھ جھوٹ معلوم ہوتا ہے۔ بات یقیناً کچھ اور ہی ہے۔ یار ہم سے تو نہ چھپاؤ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے قریب پڑی پان کی ڈبیا اٹھائی اور ایک گلوری منہ میں رکھ ڈبیا میری طرف بڑھادی۔ "لو پان کھاؤ۔" وہ پیش کش کرتے ہوئے بولا۔

"حلیم بھائی، غیرملکی مہمان اور پان دونوں متضاد اشیا ہیں۔ اچھا یہ تو بتائیں۔" میں نے بات ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کا منہ تو پہلے ہی اگالدان بنا ہوا ہے۔ اس میں ایک اور پان کا اضافہ کر کے آپ کے ہونٹوں پر سرخی کا مزید اضافہ تو ہونے سے رہا۔ پھر آپ نے ایسا کیوں کیا؟ ماشااللہ آپ کا منہ تو چوبیس گھنٹے ہی گل رنگ رہتا ہے۔"

"ہاں میری جان، ہم تو موت کے منہ میں جاتے ہوئے بھی اسی طرح سرخ و بین ہوکر جائیں گے۔ ان شااللہ ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوگی اور سرخی بھی۔" یہ کہہ کر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"بھائی حلیم خدا کے لیے بدفال تو منہ سے نہ نکالا کریں۔ اللہ رکھے، ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے۔" میں نے قدرے خوفزدہ ہو کر کہا۔

"چھوڑو یار، ان فرسودہ روایات اور توہمات کو۔ اچھا یہ تو بتاؤ، میرے ساتھ چلو گے یا نہیں؟" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر استفسار کیا۔

"نہیں بھائی، پھر کبھی سہی۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"اچھا میری جان خدا حافظ۔ یاد رکھو "پھر کبھی" کبھی نہیں آتی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دروازہ بند کیا، مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

اس کے جاتے ہی میں حلیم کے ساتھ بیتے دنوں کی یادوں میں کھو گیا۔ وہ اپنے چٹکلوں سے ماحول زعفران زار بنائے رکھتے تھے۔ میں اپنی سوچوں میں گم تھا کہ کمپنی کی کار میرے قریب رکی، تو خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا۔ میں جلدی سے بیٹھا اور اسے ہوائی اڈے چلنے کا اشارہ کیا۔ گاڑی تیزی سے رواں ہوگئی۔ پی۔ آر۔ او اور میں رسمی علیک سلیک کر کے خاموشی سے خالی الذہن بیٹھے برابر سے گزرنے والی گاڑیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ہماری کار اوور ہیڈ برج سے گزر کر نیچے اتری، تو اچانک میری نگاہ ہجوم کے درمیان ٹھہری ایک کار پر پڑی جس کا اگلا حصہ بالکل تباہ ہو چکا تھا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ یہ تو حلیم کی کار جیسی ہے۔ یہ خیال آتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ تصدیق کرنے کے لیے

کہ میرا خیال سچ ہے یا غلط اور اصل معاملہ کیا ہے۔ میں نے ڈرائیور سے گاڑی رکوائی۔

اتر کر دیکھا، تو مجھے یقین ہو گیا کہ کار اسی کی ہے۔ تیزی سے آگے بڑھا۔ لوگ چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ ان کی باتوں سے پتا چلا کہ ڈرائیور جاں بحق ہو چکا۔ لوگوں کے ہجوم سے گزر کر آگے بڑھا، تو میں سکتے میں رہ گیا۔ حلیم کا جسدِ خاکی اپنے سرخ ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے خون میں لت پت سڑک پر پڑا تھا۔

"انا للہ و انا الیہ راجعون" میری زبان سے نکلا۔ ساتھ ہی مجھے اس کے وہ الفاظ یاد آ گئے جو قریباً دس منٹ پہلے اس کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔ وہ سچ کہتا تھا، موت کے منہ میں جاتے وقت بھی وہ سرخ دہن ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور سرخی بھی۔ اور اس کا آخری جملہ "یاد رکھو، پھر بھی، کبھی نہیں آتی" میرے کانوں میں آج تک گونجتا رہتا ہے۔

میں نے ڈرائیور کو اس کی نعش کے پاس ٹھہرنے اور انتظار کرنے کی ہدایت دے کر کار کا اسٹیئرنگ خود سنبھال لیا۔ دورانِ راہ میں پی۔ آر۔ او کو حلیم سے ہوئی آخری ملاقات کا ذکر کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم دونوں مصنوعی مسکراہٹ لیے ہوائی اڈے پر ایک غیر ملکی مندوب کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ لیکن میرا ذہن حلیم کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔ اب شاید اس کے کفن دفن میں بھی مجھے لواحقین کا ہاتھ بٹانا تھا۔ ◆◆◆

4	نیلامی کنڈم مشینری مائیکو ہینٹ اور فرنیچر وغیرہ	ایضاً	بوقت 17/09/2015 11:00A.M بجے	بوقت 18/09/2015 1:00 PM بجے	بوقت 18/09/2015 1:30 PM بجے	EDO ہیلتھ آفس وہاڑی
5	میڈیکل گیسز	ایضاً	بوقت 17/09/2015 11:00A.M بجے	بوقت 18/09/2015 1:00 PM بجے	بوقت 18/09/2015 1:30 PM بجے	EDO ہیلتھ آفس وہاڑی
6	لوکل پرچیز ادویات زکوٰۃ/بیت المال	ایضاً	بوقت 17/09/2015 11:00A.M بجے	بوقت 18/09/2015 1:00 PM بجے	بوقت 18/09/2015 1:30 PM بجے	EDO ہیلتھ آفس وہاڑی
7	سٹیشنری، پرنٹنگ	ایضاً	بوقت 17/09/2015 11:00A.M بجے	بوقت 18/09/2015 1:00 PM بجے	بوقت 18/09/2015 1:30 PM بجے	EDO ہیلتھ آفس وہاڑی
8	جنرل سٹور، الیکٹرک (کپڑا، پارچہ جات)	ایضاً	بوقت 17/09/2015 11:00A.M بجے	بوقت 18/09/2015 1:00 PM بجے	بوقت 18/09/2015 1:30 PM بجے	EDO ہیلتھ آفس وہاڑی
9	لیبارٹری، ڈینٹل کٹس اور کیمیکلز	ایضاً	بوقت 17/09/2015 11:00A.M بجے	بوقت 18/09/2015 1:00 PM بجے	بوقت 18/09/2015 1:30 PM بجے	EDO ہیلتھ آفس وہاڑی

1) تمام ٹینڈرز درج بالا دی گئی تاریخوں کے مطابق کھولے جائیں گے اور (TECHNICAL PROPOSAL) اسی دن دیے گئے وقت کے مطابق ٹینڈر دہندگان یا نمائندگان کی موجودگی میں کھولے جائیں گے۔ 2) تمام ٹینڈرز سنگل سٹیج ٹو لفافے طریقہ کار کے مطابق جمع کروانے ہوں گے۔

3) ٹینڈر دستاویزات بمع تفصیل مقدار اور شرائط و ضوابط دفتر ہذا کے اکاؤنٹنٹ سے مبلغ-/1000 روپے (ناقابل واپسی) فی ٹینڈر کے عوض درج بالا تاریخ تک دفتری اوقات کے دوران حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ 4) زیر دستخطی کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ تمام ٹینڈرز منسوخ کر سکتا ہے۔

5) ٹینڈر دہندہ کو ٹینڈر کے ساتھ کمپیوٹرائزڈ شناختی کارڈ کی کاپی اور انکم ٹیکس، سیلز ٹیکس، رجسٹریشن کی کاپی ساتھ لف کرنا ہوگی۔

المشتہر

ڈاکٹر محمد اکرم

میڈیکل سپرنٹنڈنٹ تحصیل ہیڈکوارٹر ہسپتال بورے والا

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

ٹی وی گیم شوز یا اخلاقی انحطاط

جب وطن عزیز میں صرف پی ٹی وی اور ریڈیو پاکستان تھا تو وہ کیا بھلا وقت تھا کہ ماہ مبارک رمضان میں ان دونوں ذرائع سے مسلسل تلاوتِ کلام پاک، نعت رسول مقبولؐ اور دینی موضوعات پر بیانات، تقاریر، اسلام سے متعلق ذہنی آزمائش کے مقابلے نشر ہوتے تھے۔

پھر مشرف صاحب اپنی مادر پدر خودساختہ روشن خیالی کے ساتھ آن ٹپکے۔ نت نئے ٹی وی چینلز، ریڈیو اسٹیشنز کھمبیوں کی طرح جگہ جگہ اُگ آئے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان میں صحت مندانہ مقابلہ ہوتا۔ اچھی روایات قائم کی جاتیں۔ لیکن ان چینلوں نے اپنی ریٹنگ بڑھانے کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقہ اپنانا شروع کردیا۔

ٹاک شوز اور بریکنگ نیوز کا عذاب ابھی کم نہ ہوا تھا کہ نت نئے گیم شوز آگئے۔ سبھی جانتے ہیں کہ افطار کا وقت بڑا بابرکت و باسعادت ہے۔ یہ قرب الٰہی اور قبولیت دعا کا وقت ہے۔ لیکن اسی متبرک و محترم وقت میں یہ شوز شروع ہو جاتے اور تراویح کے وقت تک جاری رہتے۔

کیسی تلاوت، کیسی نعت ایک طرف ٹھمک کے ٹھیکی ٹھاؤ ہو رہی ہوتی، تو دوسری طرف چنیاں کلائیاں کی ٹکرارتی کہ عمرے پر جانے والی عمر رسیدہ خاتون بھی ناچتی نظر آتی۔ ان شوز میں بے ہودہ طریقے سے کھانے کے مقابلے کرا کے رزق کی بے حرمتی اور بے توقیری کی جاتی۔ اسلام نے کھانے پینے کے جو آداب اور طریقے بتائے ہیں، ان کی تحقیر اور نفی ہوتی۔

ان پروگرامز میں بہت سے شرکا ایسے چیزیں مانگ رہے ہوتے کہ بھکاری بھی شرمائیں۔ اگر اسلام، پاکستان یا واقفیت

عامہ کے کچھ سوالات پوچھے بھی جائیں، تو ایسے مضحکہ خیز جوابات دیے جاتے کہ الاماں الحفیظ۔

نوجوان خواتین نامحرم مرد میزبان سے ایسے والہانہ انداز سے بھرے مجمع میں گلے ملتی ہیں کہ ہر غیرت مند کی نگاہیں شرم سے جھک جائیں۔ رہی سہی کسر "ہلکلو" کے ڈانس نے پوری کر دی۔ کیا موبائل، موٹر سائیکل، ایل سی ڈی، تحائف کے صلے میں قومی، ملی، مذہبی غیرت کا جنازہ نکالنا کسی بھی طرح روا اور جائز ہے؟

انسانی فطرت ہے کہ اسے برائی ہمیشہ پرکشش نظر آتی ہے، اسی لیے وہ اس کی طرف جلد متوجہ ہوتا ہے۔ یہی لوگوں خاص طور پر مردوں، بچوں اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد ان شوز کو دیکھتی اور ان کے چکر میں قرآن، نماز اور حب رسولؐ سے غافل ہو جاتی۔

افسوس صد افسوس کہ اب برائی کو برائی سمجھا ہی نہیں جاتا۔ ان پروگراموں کے کرتا دھرتا افراد اور ان کے سرپرستوں کو چاہیے کہ وہ سنجیدگی سے اس مسئلے پر سوچیں کہ وہ ریٹنگ کے چکر میں اخلاقی اقدار کی تذلیل کا سبب بن رہے ہیں۔ وزارت اطلاعات ونشریات اور پیمرا کے ذمے داران کو چاہیے کہ وہ بھی شتر بے مہار آزادی کو لگام دیں۔ (ڈاکٹر ادیب عبدالغنی شکیل، ملتان)

☆☆☆

تعطیلات موسم گرما

نظام تعلیم چاہے سرکاری سطح پر ہو یا نجی سطح پر گزشتہ صدیوں میں تعطیلات موسم گرما کا کہیں تصور نہیں ملتا۔ دین اسلام میں بروز جمعہ تعطیل ہونے کا تصور رہا ہے کیونکہ نماز جمعہ کی تیاری کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ لہٰذا اس روز مدارس میں تعطیل کا ہونا سہولت پیدا کر دیتا۔

تعطیلات موسم گرما کا رواج نجانے کب شروع ہوا۔ اب یہ افسوس ناک رجحان ہے کہ سال کا چوتھائی حصہ صرف تعطیلات میں گزار دیا جانے حالانکہ اس عمر کے بچوں کو تعلیم و تربیت کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ لگتا ہے، موسم گرما میں چھٹیوں کا دستور خصوصاً تعلیمی اداروں کے لیے انگریز دور میں شروع ہوا۔ انگریز حکمران سرد ملک سے تعلق رکھتے تھے اور گرمی کی شدت کی وجہ سے کام کاج نہ کر پاتے۔ چناں چہ وہ پہاڑی علاقوں میں ٹھنڈی جگہ پر وقت گزارنے لگے۔ یوں "ہل اسٹیشن" وجود میں آئے۔ ان کی دیکھا دیکھی ہندو پاک کے افسران نے بھی یہ طریقہ اپنایا اور یوں تعطیلات موسم گرما کا رواج عام ہو گیا۔

آج یہ عالم ہے کہ ننانوے فی صد طلبہ اور طالبات موسم گرما کی تعطیلات گھروں میں گزارتے ہیں۔ اساتذہ کرام تین ماہ کی تنخواہ وصول فرما کر گھروں میں وقت گزارنے پر مجبور ہیں۔ قلیل تعداد میں اساتذہ ٹیوشن پڑھاتے نظر آتے ہیں۔ اب تو "ہوم ورک" کرانے کا یہ سلسلہ بھی منقطع ہو چکا۔ گھر کے کام کی کاپیاں ردی والوں کی نذر ہو جاتی ہیں۔ اساتذہ کرام انھیں دیکھنا پسند نہیں کرتے۔

درج بالا وجوہ کی بنا پر میرا مطالبہ ہے کہ گرمیوں کی چھٹیاں بند کی جائیں۔ اس امر سے یہ فوائد حاصل ہوں گے:

۱۔ طلبہ و طالبات کا قیمتی وقت بچے گا۔

۲۔ اوقات کم کرنے سے طلبہ کو مدرسہ آنے جانے میں تکلیف نہ ہوگی۔

۳۔ طلبہ و طالبات کی توانائیوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے گا۔

۴۔ اساتذہ کرام جو تین ماہ مفت کی تنخواہ وصول کرنے پر مجبور ہیں، مصروف رہیں گے۔

۵۔ ان تعطیلات میں بچے والدین کے لیے سردرد بن جاتے ہیں۔ والدین کی ذمے داریوں میں کمی ہوگی۔

پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے، وہ تین ماہ کی چھٹیوں والی عیاشی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

(شمیم انصاری، گلگشت کالونی، ملتان)

☆☆☆

کردار سازی میں اہم حصہ

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، اردو ڈائجسٹ کو اپنے گھر آتے دیکھا۔ میرے والد (اشرف صبوحی) اس کے ابتدائی لکھنے والوں میں سے تھے۔ یہ رسالہ اتنا دلچسپ اور اس کی تحریریں

اتنی معیاری ہوتی تھیں کہ جب تک اس کا ایک ایک لفظ نہ پڑھ لیتا، سکون نہ آتا۔

بچپن میں پڑھی ہوئی بعض تحریریں اور واقعات ابھی تک ذہن میں تازہ ہیں اور انسان کی کردار سازی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ میرے پسندیدہ مضامین میں شکاریات سرفہرست تھا۔ مقبول جہانگیر اور کینتھ اینڈرسن کے تراجم بڑے شوق سے پڑھتا۔ لیکن اب شکاریات کی کہانیاں کم آتی ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جنگل تیزی سے ختم ہو رہے ہیں اور جنگلی جانور بھی معدوم ہو گئے۔ لوگ بھی اپنے کاروباری معاملات کی طرف زیادہ متوجہ ہیں۔

رسالے میں اب بھی اخلاقی، معاشرتی، مذہبی، تعلیمی اور جدید تقاضے پورے کرنے کے لیے ایسی تحریریں شامل کی جاتی ہیں جن سے ہماری نئی نسل مستفید ہو سکے۔

(حبیب اشرف صبوحی، لاہور)

☆☆

امراضِ بچگان پر خصوصی اشاعت

آپ کو مبارک باد کہ آپ نے طب و صحت نمبر شائع کر کے بہت بڑی انسانی خدمت انجام دی۔ بطور ڈاکٹر میرا روز مرہ مشاہدہ ہے کہ ہمارے عوام بشمول خواص صحت کی طرف سے بے حد بے پروا واقع ہوئے ہیں۔ اکثر و بیشتر وہ مریض کو اس وقت ہمارے پاس لاتے ہیں جب مرض خطرناک حد تک بڑھ چکا ہو۔ تجویز ہے کہ آپ ایک خصوصی اشاعت بچوں کے امراض کے حوالے سے بھی ترتیب دیں۔ آپ اس تلخ حقیقت سے واقف ہی ہوں گے کہ پاکستان میں سب سے زیادہ شرح اموات بچوں کی ہے۔

والدین کی جہالت اور توہم پرستی کا اس امر سے اندازہ لگائیے کہ جب وہ بچے کو اسپتال لائیں، تو تعویذوں کی پوٹلیاں اس کے گلے میں پڑی ہوتی ہیں۔ وہ مریض پر پہلے جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈے وغیرہ کے کئی حیلے آزما چکے ہوتے ہیں۔ حال ہی میں ہمارے وارڈ میں ایک سالہ بچہ داخل ہوا جس کا سانس ناہموار تھا۔ ہم نے والدین سے اس کا سبب پوچھا، تو انھوں نے حقیقت بتانے سے گریز کیا۔ ڈاکٹروں نے معائنے سے معلوم کیا کہ بچے کے گلے میں کوئی شے اٹکی ہوئی ہے۔ اس اثنا میں بچے کے دادا نے اصل وجہ بتائی کہ بچے کے والدین نے اسے جامن کھلائے تھے۔ ایک گٹھلی سانس کی نالی میں اٹک گئی جس نے بچے کی زندگی خطرے میں ڈال دی۔ ہماری سرتوڑ کوشش کے باوجود بچہ زندگی کی سرحد پار کر گیا۔ وہ ماں جس کی سات سال بعد گود بھری ہوئی تھی، اس پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے، باپ الگ ندامت کے آنسو بہا رہا تھا۔

اسپتالوں میں والدین کی لاعلمی اور غفلت کے ایسے دلدوز واقعات روزانہ دیکھنے میں آتے ہیں۔ اگر آپ امراض بچگان پر خصوصی اشاعت کا اہتمام کریں، تو میرا تعاون بھی حاضر ہے۔ یقیناً یہ ایک انسانی خدمت ہو گی۔

(ڈاکٹر نویرہ خالد، جوہر ٹاؤن لاہور)

☆☆

جھوٹی قسم

جون ۲۰۱۵ء کے شمارے میں جناب ڈاکٹر ممتاز عمر نے "جھوٹی قسم" کے عنوان سے واقعہ تحریر کیا۔ بڑا ہی سبق آموز تھا۔ ایک مقام پر لکھا ہے کہ "قسم دعوے دار کھاتا ہے۔" ویسے قسم جو بھی اٹھائے، اس کی مرضی پر منحصر ہے۔ اسلامی قانون کے مطابق دعویٰ کرنے والے مدعی کے ذمے گواہ ہوتے ہیں۔ اگر وہ گواہ پیش نہ کر سکے، تو مدعا علیہ (جس کے خلاف دعویٰ کیا گیا ہوتا ہے) پر قسم واجب ہوتی ہے۔

(عبدالرؤف حاطب سیف، جہانیاں منڈی)

☆☆

صدر ممنون حسین کا انٹرویو

جون ۲۰۱۵ء کا شمارہ حسبِ معمول زبردست تھا۔ صدر ممنون حسین کا انٹرویو بہت دلچسپ رہا۔ بڑی شخصیات کے انٹرویو پڑھو،

تو ان کے اندر اچھے انسان کی جھلک محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے صدر بھی ایک اچھے انسان ہیں لیکن بعض دوسرے راہنماؤں کے "کارنامے" دیکھو تو سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جنرل مشرف کی کتاب پڑھ کر ان کی شخصیت بڑی سحر انگیز اور محب وطن معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ان کے "کارنامے" جن کا خمیازہ اب تک ہم بھگت رہے ہیں، تحریر کے برعکس ہیں۔

شکاریات کی کہانیاں شائع کیجیے۔ عالمی ادب سے انتخاب لاجواب ہوتا ہے۔ آنتوں کے بزنس کے حوالے سے تحریر بہترین تھی۔ البتہ آنتوں کے حوالے سے ایک منفی پہلو یہ ہے کہ ہمارے ہاں گھٹیا ذہن کے چند لوگ جو مال و دولت کے پجاری اور انسانی صحت کے دشمن ہیں، انتڑیوں سے تیل کشید کر کے فروخت کرتے ہیں۔ کئی بار اخبار اور ٹی وی پروگراموں میں اس قسم کی خبریں آ چکیں۔ اللہ ہمارے اوپر رحم فرمائے۔

(معاذ امین، شہزاد ٹاؤن، اسلام آباد)

☆☆

آن لائن کاروبار میں دھوکا

اردو ڈائجسٹ برسوں سے ہمارے گھر والوں کے زیر مطالعہ ہے۔ میں بھی شوق سے اس کا مطالعہ کرتا اور دسویں جماعت کا طالب علم ہوں۔ گزشتہ کئی شماروں میں آن لائن کاروبار پر مضامین آ رہے ہیں۔ وہ ابھی میری سمجھ میں نہیں آتے مگر میں ایک کمپنی کے اشتہار آن لائن کر کے کچھ رقم کما رہا ہوں۔ مگر یہ تجربہ زیادہ اچھا نہیں رہا۔ پہلے میں نے ایسی آن لائن کمپنیوں سے رابطہ کیا جن کے اخبارات میں اشتہار آتے ہیں۔ انھوں نے ۲۵ سو روپے ایزی پیسہ کے ذریعے منگوائے مگر بعد از اں تعاون کرنے کے بجائے حیلے بہانوں پیسے ہضم کر لیے۔ اگر انھیں پولیس کارروائی کا میسج کیا جائے، تو کہتے ہیں کہ کر لو جو کرنا ہے۔

براہ کرم اس بارے میں بھی کوئی تفصیلی مضمون سپرد قلم کریں تا کہ جو بے روزگار اور طالب علم وغیرہ کچھ کمانا چاہئیں، تو وہ ان آن لائن کمپنیوں کی دھوکا دہی سے محفوظ رہ سکیں۔

(صبور احمد خاں، فیصل آباد)

☆☆

> **اعتذار**
>
> شمارہ جولائی ۲۰۱۵ء کے صفحہ نمبر ۱۹۲ پر "آیات قرآنی سے علاج" میں سورہ رحمٰن کی جگہ سورہ قریش پڑھا جائے۔ پروف کی اس غلطی پہ ادارہ معذرت خواہ ہے۔
>
> (ادارہ)

مختصر نامے

یہ حقیقت ہے کہ موجودہ حکومت کے دور میں معیشت ترقی کر رہی ہے۔ اُمید ہے، آئندہ چند برسوں میں پاکستان مشکلات سے نکل آئے گا۔ اردو ڈائجسٹ آب و تاب کے ساتھ بہترین تحریریں شائع کر رہا ہے۔ (عبدالجبار رومی، چوہنگ، لاہور)

☆☆

اردو ڈائجسٹ علمی و ادبی دنیا میں اہم مقام رکھتا ہے۔ مختلف النوع موضوعات پر صاحبان علم و دانش کی تحریریں فکر انگیز ہوتی ہیں۔ علمی و ادبی سرگرمیوں کی ترقی میں رسالے کی کوششیں قابل تحسین ہیں۔ (حرا طارق، ڈاک خانہ ملہو سنگھوئی، جہلم)

☆☆

کالا باغ ڈیم ہمارے لیے زندگی و موت کا مسئلہ ہے۔ لیکن اُسے سیاست دانوں نے اپنی سیاست کی بھینٹ چڑھا دیا۔ دوسری طرف بھارت دریاؤں پر سیکڑوں ڈیم بنا رہا ہے۔ نجانے ہماری قیادت کب ہوش میں آئے گی۔

(رابعہ صلاح الدین، واہ کینٹ)

☆☆

اردو ڈائجسٹ کا ہر شمارہ لاجواب ہوتا ہے۔ یہ ادارتی ٹیم کی محنت شاقہ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ (اویس شیخ، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

SCANNED BY AMIR
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN

READING
Section
PAKSOCIETY